1113

مسلم لیگ کا دورِ حکومت

(۱۹۴۷ — ۱۹۵۴ء)

ڈاکٹر صفدر محمود

غالب پبلشرز، لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

58906

ناشر اسد اللہ غالب

غالب پبلشرز پوسٹ بکس ۴۰۷۹ لاہور - ۲۵

مطبع کمبائن پرنٹرز لاہور

قیمت ۳۶/- روپے

اشاعت دسمبر ۱۹۸۲ء

Marfat.com

فہرست

پیش لفظ 9

باب : ۱ 13

تعارف (۱۸۵۷ء ـــــ ۱۹۴۷ء)

ہندو مسلم تعلقات ـــ سر سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک ـــ آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل ـــ مسلم لیگ اور تحریکِ آزادی ـــ قیامِ پاکستان۔

باب : ۲ 49

پاکستان مُسلم لیگ کا قیام

تشکیل کا مرحلہ ـــ تقسیم کے بعد مُلک کو درپیش مسائل ـــ مسلم لیگ کی تنظیمِ نو ـــ آل انڈیا مسلم لیگ کی دو حصّوں میں تقسیم اور مختلف مکاتیبِ فکر ـــ مُسلم لیگ کا ڈھانچہ ـــ آئین کی ترتیب و تدوین ـــ اغراض و مقاصد

Marfat.com

—— ترقی و فروغ —— مرکزی اور صوبائی مسلم لیگیں ۔

باب : ۳ ۸۰

مُسلم لیگ کی قیادت

چودھری خلیق الزمان کا انتخاب —— رُکنیّت سازی کی مہم —— خلیق الزمان بطور صدر مسلم لیگ —— استعفا —— آئین میں ترمیم —— لیاقت علی خان کا انتخاب —— قتل کی سازش اور اُس کا پس منظر —— خواجہ ناظم الدین کا بطور صدر انتخاب —— وزارتِ عظمیٰ سے برطرفی —— مسلم لیگ کی صدارت سے استعفا —— محمد علی بوگرہ کا انتخاب —— مشرقی پاکستان میں انتخابات —— مسلم لیگ کی کنونشن —— دستور ساز اسمبلی کی تنسیخ ۔

باب : ۴ ۱۴۳

صُوبائی سیاست — سازشیں اور خلفشار

پنجاب —— سندھ —— شمال مغربی سرحدی صُوبہ —— مشرقی پاکستان —— ریاستیں (بہاولپور — خیرپور — بلوچستان)

باب : ۵ ۲۶۷

مُسلم لیگ کا دورِ حکومت

Marfat.com

حکومت پر اجارہ داری ـــــ تقسیم کے نامساعد نتائج
ـــــ مہاجرین کا مسئلہ ـــــ زرعی اصلاحات ـــــ آئین
کی ترتیب و تدوین ـــــ آئین سازی کی تگ و دو ـــــ
لسانی بحث و نزاع ـــــ مخلوط بمقابلہ جداگانہ انتخابات ـــ مشرقی پاکستان
میں شکستِ فاش ـــــ دستور ساز اسمبلی کی تنسیخ۔

باب : ۶

داستانِ زوال ۳۴۰

○

ضمیمہ : قراردادِ مقاصد

○

مآخذ

○

اشاریہ

○

Marfat.com

پیش لفظ

پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو کانگریسی لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ پاکستان معاشی مشکلات کے باعث قائم نہیں رہ سکے گا لیکن گزشتہ ربع صدی کی تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان کا اصل مسئلہ معاشی وسائل کی قلت نہیں بلکہ سیاسی قیادت کا قحط ہے۔ مسلم لیگ کا دورِ حکومت بھی اسی سانحے کا نوحہ ہے۔

پاکستان بنا تو آزادی کے جوش و خروش سے قوم کی کیفیت اُس پگھلے ہوئے مادے کے مانند تھی جسے کسی بھی سانچے میں ڈھالا جا سکتا تھا۔ قائد اعظمؒ کو تو مہلت نہ ملی لیکن ہماری نادان قیادت نے قومی بنیادوں کو مستحکم بنانے اور قومی جذبے کو ملکی تعمیر کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اپنی تمام صلاحیتیں حصولِ اقتدار کے لیے صرف کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ اقتدار نے اُن سے وفا کی، نہ قومی کردار کی تشکیل ہو سکی اور نہ جمہوری ادارے پروان چڑھ سکے۔ اس صورتِ حال کے ردِّ عمل کے طور پر ملک یکے بعد دیگرے سیاسی بحرانوں کا شکار ہوتا رہا اور اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔

میرے نزدیک تاریخ کسی قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتی ہے اور جو قوم

Marfat.com

اپنی تاریخ کو فراموش کر دیتی ہے اُس کا جغرافیہ اُسے فراموش کر دیتا ہے۔ تاریخ کا مقصد محض داستان گوئی نہیں ہوتا بلکہ تاریخ ماضی کا بے باک اور غیر جذباتی تجزیہ پیش کرتی ہے جس کی روشنی میں آئندہ نسلیں اپنی راہ متعیّن کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے مورّخ اور بالخصوص ہم عصر مورّخ کا کردار اُس معالج کا سا ہوتا ہے جو مرض کی تشخیص بھی کرتا ہے اور اُس کا علاج بھی تجویز کرتا ہے۔ مسلم لیگ کے دورِ حکومت کا تجزیہ کرتے ہوئے میرے سامنے بھی یہی مقاصد تھے کہ اوّل اُس دور کی مکمل سیاسی تصویر پیش کی جائے۔ دوم لیگی سیاست کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اُن اصولوں کی نشاندہی بھی کی جائے جن کو اپنا کر ہم اپنی آئندہ بقا کا سامان کر سکتے ہیں۔ مَیں نے اس دور کو تحقیق کے لیے خاص طور پر اس لیے منتخب کیا تھا کہ میرے نزدیک یہ دور پاکستان کی تاریخ کا اہم ترین دور تھا اور اُس زمانے میں سیاسی مسائل کے جو کانٹے بوئے گئے، آج وہ راستے کی خاردار جھاڑیاں بن چکے ہیں لیکن ہمارے مؤرخین نے آج تک اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا حالانکہ اس دور کی سیاست کو سمجھے بغیر بعد کی تاریخ سے انصاف نہیں ہو سکتا۔

مسلم لیگ کے دورِ حکومت کی سیاسی تاریخ مرتب کرنا اس لحاظ سے انتہائی کٹھن کام تھا کہ اس موضوع سے متعلق کوئی مواد کتب حوالہ کی صورت میں نہیں ملتا۔ جہاں تک پارٹی ریکارڈ کا تعلق ہے وہ ایوب کی حکومت نے ضائع کر دیا تھا۔ ان حالات میں اخبارات و رسائل اور سیاست دانوں سے ملاقاتوں کے سوا دیگر ماخذ دستیاب نہ تھے۔ سیاست دانوں کے حافظے یا تو کمزور ہوتے ہیں یا پھر اس قدر دانا کہ سچّی باتیں تک بھول جاتے ہیں، اس لیے اُن کی یادداشتیں زیادہ مددگار ثابت نہ ہوئیں۔ البتہ راہِ جستجو میں مجھے ایسے اَن گنت

Marfat.com

مسلم لیگی راہنما اور کارکن ملے جن کا خیال تھا کہ ان کی مدد کے بغیر شاید یہ مملکت خداداد "معرض وجود میں نہ آسکتی۔ ان حالات میں مجھے سب سے زیادہ بھروسہ اخبارات، رسائل اور پارٹی کے بچے کھچے ریکارڈ پر کرنا پڑا اور یا پھر گمنام لیگی کارکنوں نے میری مدد کی۔ سات برس کے تمام اخبارات و رسائل کی فائلیں دیکھنا اور مسلم لیگ کی پیچیدہ کہانی مرتب کرنا، بہرحال آسان کام نہیں تھا، کیونکہ اس کے ساتھ ہی ملازمت کی مجبوریاں بھی درپیش تھیں۔ اس لیے مسودے کو پایۂ تکمیل تک پہنچتے کئی برس لگ گئے۔

آخر میں مجھے اُن تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس ضمن میں میری مدد کی۔ مسلم لیگ کے کارکنوں سے میری یہ گذارش ہے کہ اگر اُن کے پاس اس موضوع پر کچھ اور مواد ہو تو براہ کرم مجھے مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

میری محنت کا صلہ یہی ہے کہ آپ اس آئینۂ تحریر میں اپنے ماضی کی جھلک دیکھیں اور مستقبل کو سنوارنے کی فکر کریں۔

صفدر محمود

۱۷۔ جون ۷۳ء

Marfat.com

Marfat.com

باب ۱

تعارف

(۱۸۵۷ء — ۱۹۴۷ء)

مسلمانوں کی تاریخ اس لحاظ سے منفرد و یکتا ہے کہ انھوں نے کسی مخصوص نسل یا کسی خاص خطے کیلئے جنم نہیں لیا بلکہ وہ ایک عالمگیر تحریک کے علمبردار بن کر اٹھے اور کم و بیش ساری قدیم دنیا پر چھا گئے۔ انھوں نے ایسی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی جس کی مثالیں نوعِ انسان کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ وہ ان بلندیوں اور رفعتوں تک پہنچے جو اب تک دوسری تہذیبوں کو نصیب نہیں ہو سکیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کارنامے نہ ذاتی و شخصی فخر و ناز کے مرہونِ منت تھے اور نہ دنیوی مفاد ہی کے لیے تھے۔ ان کے سامنے ایک نصب العین تھا جس کی عظمت انھیں دنیا کے کونے کونے تک لے گئی۔ جب تک ان کی آنکھیں اس نصب العین کی روشنی سے منور رہیں وہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرتے رہے لیکن جب اس نصب العین کی جگہ حرص و ہوس نے لے لی تو وہ انتشار کا شکار ہو گئے۔ یہ تاریخِ عالم کا اصول ہے کہ قومیں مقاصد اور نصب العین

Marfat.com

سے بنتی ہیں ورنہ ان کی حیثیت ریگستان میں بکھرے ہوئے ذرّوں کی سی ہوتی ہے ، برعظیم ہندوستان میں بھی مسلمان نصب العین ہی کی روشنی میں آئے تھے ۔ جب تک ان میں جذبے کی ہم آہنگی اتحاد عمل رہا وہ حکمران رہے لیکن جب وہ اِن صفات سے عاری ہو گئے تو حکمران سے محکوم بن گئے ۔

برعظیم میں مسلمانوں کی حکومت ۷۱۲ء میں قائم ہوئی اور ان کی حکمرانی کم و بیش گیارہ صدیوں تک جاری رہی ۔ مسلمانوں کے اس طویل دورِ حکومت میں ہندوؤں کو کما حقہٗ اہمیت دی گئی اور حکومت کے انتظام و معاملات میں انھیں پورا حصّہ دیا گیا لیکن اس کے باوجود ان کو مُسلمانوں کا وجُود گوارا نہیں تھا ۔ چنانچہ جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط میں توسیع ہوئی تو ہندوؤں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں سے نجات حاصل کرنے کا یہی موقع ہے ۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف مُسلمانوں کی معرکہ آرائی میں انگریزوں کی پوری پوری حمایت کی ۔ انگریز بجا طور پر محسوس کرتے تھے کہ مُسلمان چونکہ ہند میں حکمران رہے ہیں اس لیے وہ ان کے تسلط کی لازماً مخالفت کریں گے ۔ اس لیے جب تک مسلمانوں کو پوری طرح کچل نہیں دیا جاتا انگریزی سلطنت کا قیام ممکن نہیں ۔ اس احساس کے پیشِ نظر انھوں نے ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد مُسلمانوں کے ساتھ وہ ظالمانہ سلوک روا رکھا جس کے تصوّر سے رُوح لرز جاتی ہے ۔ اس صورتِ حال کا ایک سبب یہ تھا کہ اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے مساوی طور پر جنگِ آزادی میں حصّہ لیا تھا تاہم ہندوؤں نے کمال ہوشیاری سے اس کی ساری ذمہ داری مُسلمانوں پر ڈال دی ۔

۱۸۵۷ء کا سنہ برصغیر ہند کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت

Marfat.com

رکھتا ہے۔ اس سال آخری مغل شہنشاہ کو تخت دہلی سے معزول کر دیا گیا اور اس کا اختیار و اقتدار جو کچھ عرصے سے برائے نام تھا مکمل طور پر انگریزوں کو منتقل ہو گیا۔ یہ بات فطری تھی کہ نئے حکمرانوں نے اپنے پیشروؤں پر شک و شبہ کیا کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ "ان کے اقتدار کی توسیع اور بقاء میں جو واحد رکاوٹ باقی رہ گئی تھی وہ مسلمان تھے اس لیے انھیں کچل کر رکھ دینا چاہیئے۔"[1] چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد کئی سال تک ہندی مسلمان دار و رسن کی آزمائش سے گزرتے رہے۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب "دی انڈین مسلمان" میں ان کی قابل رحم حالت کی یوں تصویر کشی کی ہے۔ "مسلمان اس حد تک بے یار و مددگار ہو چکے تھے کہ کوئی شخص بھی ان کی طرف دھیان نہیں دیتا تھا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود تک کا اعتراف کرنا بھی کسر شان سمجھتے تھے۔ نہ صرف حکومت مسلمانوں کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی بلکہ کھلے بندوں ان کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ اس ناانصافی کی ایک مثال یہ ہے کہ جب سندربن کے کمشنر کے دفتر میں چند آسامیوں کے لیے اشتہار دیا گیا تو اس میں یہ ضمنی اعلان بھی شامل تھا کہ صرف ہندوؤں کا تقرر عمل میں لایا جائے گا۔"[2]

"شاید ہی کوئی ایسا سرکاری دفتر ہو گا جہاں مسلمان کو قلی یا چپڑاسی کے سوا کوئی ملازمت مل سکتی تھی۔ اس جابرانہ پالیسی کا آغاز ایسٹ انڈیا کمپنی کے پرانے دور میں ہوا جب لارڈ ایلن برو نے ۱۸۴۲ء میں

---

[1] : حالی الطاف حسین "حیات جاوید" (لاہور) ص ۱۴۵۔

[2] : ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر The Indian Musalman (لندن) ص ۱۷۲۔

Marfat.com

ڈیوک آف ولنگٹن کے نام ایک خط میں لکھا کہ مسلمان بنیادی طور پہ انگریزوں کے مخالف اور دشمن ہیں اور ان کا حکومت کے خلاف عناد مسلّم الثبوت ہے۔" ؎

انگریزوں کی ان پالیسیوں کے سبب مسلمان معاشرہ انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔ احساسِ کمتری ان کا مقدر بن چکا تھا۔ خوف نے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیے تھے اور معاشی بدحالی ان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس صورتِ حال نے سرسیّد کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا اور انھیں احساس ہوا کہ اگر حالات کا دھارا یونہی بہتا رہا تو مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ سرسیّد حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کو تباہی سے بچانے کے لیے مغربی تعلیم سے آراستہ کرنا ناگزیر ہے۔ دُوسری طرف مسلمان مغربی تعلیم کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

سرسیّد نے اس مقصد کے حصوُل کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی اور بڑے دردمندانہ الفاظ میں مسلمانوں پر زور دیا کہ وُہ غلط تعصّبات کی زنجیریں توڑ دیں۔ "کیونکہ میری آنکھیں تو تہمات کی پرانی دُنیا کو موت کی آغوش میں جاتے اور ایک نئے فنی وتکنیکی دور کو اس کی جگہ لیتے دیکھ رہی ہیں۔"

سرسیّد کو یقین تھا کہ اگر انگریزوں اور مسلمانوں کی کشمکش ختم نہ ہوئی اور مسلمانوں نے جدید تعلیم کا بائیکاٹ جاری رکھا، تو پھر ان کی نشاۃِ ثانیہ کے تمام امکانات ختم ہو جائیں گے۔ ان حالات

؎ : ابنِ زبیری۔ "سیاست ملیہ" (آگرہ ۱۹۴۱ء) ص ۵

Marfat.com

کے پیشِ نظر انھوں نے فیصلہ کیا کہ :

(۱) انگریزوں اور مسلمانوں کے باہمی شکوک و شبہات کو دُور کیا جائے اور

(۲) مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔

انھوں نے اوّل الذکر مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے ایک کتاب" رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھی اور اسے برطانوی پارلیمنٹ کے تمام ارکان کو بھیجا۔ اس کتاب میں ایسے الزامات کی پُرزور تردید کی گئی تھی کہ صرف مسلمان ہی ۱۸۵۷ء کے واقعات کے واحد ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے اس خیال کی بھی تردید کی کہ مسلمان ازروئے مذہب عیسائیوں کے خلاف جہاد کرنے کے پابند ہیں۔ اسی طرح انھوں نے" حکمرانوں اور رعایا" کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کے لیے ۱۸۶۶ء میں ایک تنظیم " دی برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کی بھی بنیاد رکھی۔

مسلمانوں میں مغربی علوم کا ذوق پیدا کرنے کے لیے سرسیّد نے ۱۸۶۳ء میں غازی آباد میں" سائنٹیفک سوسائٹی" قائم کی جس کا مقصد اہلِ ہند کو مغربی علوم وفنون سے روشناس کرانا تھا۔ اس طرح مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج کے لیے سرسید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک سکول قائم کیا، جو بعدازاں علی گڑھ یونیورسٹی بنا۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے میں اہم کردار انجام دیا اور بالآخر ایک ایسی تحریک کو جنم دیا جس نے قیامِ پاکستان کے لیے راہ ہموار کی۔

اسی دور میں ہندوستانی سیاست کے اُفق پر کچھ ایسے واقعات

Marfat.com

رونما ہوئے جنھوں نے ہندو مسلم تعلقات کا ہمیشہ کے لیے رُخ متعین کر دیا۔ ان میں سر فہرست اردو ہندی نزاع تھا جس سے ہندوؤں کی متعصب ذہنیت۔ بے نقاب ہو گئی۔ سر سید کو اس سے سخت صدمہ پہنچا اور انھیں اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ: "ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک قوم کی حیثیت سے اکٹھے رہنا ناممکن ہے۔"[1] اسی خیال کے پیشِ نظر جب ۱۸۸۶ء میں انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی تو انھوں نے مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا کیونکہ انھوں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ کانگرس بنیادی طور پر ہندوؤں کی تنظیم ہے۔ اس لیے مسلمان کانگرس میں شامل ہو کر سیاسیات ہند میں کوئی اہم کردار ادا نہ کر سکیں گے۔ ان کو یہ بھی خدشہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کو اپنے عزائم کے حصول کے لیے استعمال کریں گے۔ ان کے یہ خدشات من وعن درست ثابت ہوئے۔ کانگرس نے نہ صرف اُردو کے خلاف تحریک ہی چلائی بلکہ ۱۹۰۵ء میں جب بنگال کو تقسیم کیا گیا تو چونکہ اس سے بنگال کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا تھا اس لیے کانگرس نے تنسیخِ بنگال کے لیے باقاعدہ عوامی تحریک شروع کر دی جس کے سامنے آخر کار ۱۹۱۱ء میں حکومتِ برطانیہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس سارے عرصے میں کانگرس کے پروگرام اور پالیسیوں میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو یکسر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ تحریک تنسیخِ بنگال کے دوران میں کانگرس نے "بندے ماترم" کو قومی ترانے کے طور پر اختیار کر لیا جس سے مسلمانوں کے جذبات شدید طور پر مجروح ہوئے اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ نمائندہ حکومت کے پردے میں کانگرس ہندو راج کے قیام کا

---

[1]: حالی الطاف حسین (بحوالہ سابقہ) ص ۱۹۴ -

Marfat.com

خواب دیکھ رہی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے نظام میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ اس لیے انھیں اپنی آئندہ نسلوں کی بقا کے لیے کچھ انتظام کرنا چاہیے۔ اسی احساس نے مسلم لیگ کو جنم دیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل :

ہندوستان کے سیاسی حالات اور کانگرس کے رویئے نے مسلمان راہنماؤں کے اندازِ فکر کو بہت متاثر کیا اور "ان کے ذہنوں میں مسلم حقوق کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کی ضرورت کا احساس شدت سے اُبھرنے لگا"[1] علیحدہ تنظیم کے قیام کے لیے مسلمانوں کو کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔ سب سے پہلے سرسید نے اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کر کے مسلمانوں کی اس سمت میں راہنمائی کی۔ بعد ازاں ۱۹۰۰ء میں نواب محسن الملک نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے اجلاس میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ سیاسی اور معاشرتی تنظیم کے قیام پر بڑا زور دیا۔ اسی طرح سرسید کے ایک اور رفیقِ کار وقار الملک نے بھی ۱۹۰۱ء کے اواخر میں ایسی ہی تجویز پیش کی۔ اسی روح اور جذبہ کے زیرِ اثر نواب سلیم اللہ نے اکتوبر ۱۹۰۵ء میں بنگال میں "محمڈن پراونشل یونین" کی داغ بیل ڈالی، لیکن یہ ساری کوششیں اُدھوری ثابت ہوئیں اور مسلم لیگ کے قیام تک مسلمان یونہی سیاسی اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔ تقسیمِ بنگال کے خلاف ایجی ٹیشن کے ردِ عمل کے طور پر سرکردہ مسلمان لیڈروں کے ایک وفد نے سر آغا خان کی سربراہی میں یکم اکتوبر کو شملہ میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو

---

[1] : محمد نعمان Muslim India الہ آباد (۱۹۴۲ء) ص ۷۷

Marfat.com

سے ملاقات کی اور ان سے مسلمانوں کے حقوق و مفادات کی نگہداشت کے لیے درخواست کی۔" وائسرائے نے دُوسرے فرقوں کے ناراض ہو جانے کے خوف سے وفد سے کوئی وعدہ تو نہ کیا لیکن اس نے مسلمانوں کو یہ یقین بہرحال دلایا کہ انتظامیہ کی آئندہ تنظیم نو میں ایک قومیت کے طور پر ان کے حقوق و مفادات کی حفاظت کی جائے گی۔"[۱] شملہ وفد ہندوستان کی مسلم سیاسیات کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی کے سبب منٹو مارلے اصلاحات (۱۹۰۹ء) میں مسلمانوں کا جداگانہ حقِ نیابت (Separate Electorate) پہلی بار تسلیم کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کی انفرادیت کو تسلیم کر لیا۔

شملہ وفد کی کامیابی سے مسلمانوں کی اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کی خواہش کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس اہم مسئلہ پر غور کرنے کے لیے مسلمان رہنماؤں کا اجلاس ۳۰ ردسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں ہُوا۔ اس اجلاس کی صدارت نواب وقار الملک نے کی جنھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا۔ "مسلمان ہندوستان کی آبادی کا صرف پانچواں حصّہ ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر کبھی مستقبل میں کسی وقت بھی یہاں برطانوی راج ختم ہو گیا تو ملک میں حکومت کی باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھ میں آئے گی جو مسلمانوں سے چار گنا زیادہ ہیں۔"[۲] اس لیے مسلمانوں کی بقا کے لیے علیحدہ تنظیم کا قیام ناگزیر ہے۔ چنانچہ اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ

---

[۱] : کوئنٹس میری منٹو India ; Minto and Morley میکملن لندن (۱۹۳۴ء) صفحات ۴۶ - ۴۵

[۲] : محمد نعمان (بحوالہ سابقہ) ص ۷۸

Marfat.com

"یہ اجلاس جو ڈھاکہ میں ہند کے تمام علاقوں سے جمع ہونے والے مسلمانوں پر مشتمل ہے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نام کے تحت ایک سیاسی تنظیم قائم کی جائے ۔[۱]

مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے :۔

(۱) مسلمانوں میں برطانوی حکومت سے وفاداری کے جذبات کا فروغ۔

(۲) مسلمانوں کے سیاسی حقوق و مفادات کا تحفظ اور ترقی۔ اور

(۳) دوسرے فرقوں کے خلاف منافرت میں اضافہ کی روک تھام ۔

مسلم لیگ کے پہلے مقصد" وفاداری کے جذبات کا فروغ" پر بڑی شدید جرح و تنقید کی جاتی رہی ہے اور اکثر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ مسلم لیگ کا قیام" مسلم مفادات کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ برطانوی حکومت کے استحکام کے لیے عمل میں لایا گیا تھا" یہ الزام اس نقطۂ نظر سے صحیح نہیں کہ ۱۹۰۶ء میں کوئی سیاسی جماعت بھی سیاسی آزادی کا نعرہ بلند کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ اوّل تو انگریز حکومت ایسے پروگرام کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ دوم ابھی قوم بھی سیاسی شعور کی اوّلین منازل سے گزر رہی تھی اور منظم نہیں ہوئی تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا باضابطہ اجلاس ۲۹-۳۰- دسمبر ۱۹۰۷ء

---

[۱] : جمیل الدین احمد Muslim Political Movement (Early Phase)
پبلشرز یونائیٹڈ لاہور (۱۹۶۷ء) ص ۸۰-۸۱ ۔

Marfat.com

کو کراچی میں ہُوا۔ اس اجلاس میں آئین منظور کیا گیا جس میں مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد کا از سرِ نو تعین کیا گیا۔ اگلا اجلاس ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ میں ہُوا اور دراصل اسی اجلاس سے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا آغاز ہُوا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے ان مطالبات کو منظور کر لے جو شملہ وفد کی یادداشت میں شامل تھے۔

۱۹۱۲ء میں جنگِ بلقان کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اسلامیانِ ہند پر غم و اندوہ اور مایوسی کے بادل بن کر چھا گیا۔ مسلمانوں کے ممتاز اخبارات و جرائد بالخصوص "زمیندار" "الہلال" اور "کامریڈ" نے اپنی نگارشات سے مسلمانوں میں سیاسی شعور کی سُلگتی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دی اور اس بے چینی اور اضطراب کا اظہار روزمرہ کے جلسوں اور جلوسوں کی شکل میں ہونے لگا۔ ان حالات کے ردِّ عمل کے طور پر پڑھے لکھے اور ترقی پسند مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ نئے حالات کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلم لیگ کے پروگرام میں تبدیلی ضروری ہے۔ چنانچہ جب ۲۲ مارچ ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہُوا تو مسلم لیگ نے اپنے آئین میں ترمیم کی اور "تاجِ برطانیہ کے زیرِ سایہ ہند کے لیے موزوں حکومت خود اختیاری کے نظام"[۱] کو اپنا نیا نصب العین قرار دیا۔

اس دوران میں ہر سیاسی حلقے کی طرف سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیا جا رہا تھا۔ اس تحریک کے راہنما محمد علی جناح تھے جن کی کوششوں سے متاثر ہو کر خود ہندوؤں نے انہیں پیامبرِ اتحاد کا خطاب دیا۔ محمد علی جناح کی سربراہی

---

۱ : جمیل الدین احمد (بحوالہ سابقہ) ص ۱۴۰

Marfat.com

میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا مقصد متوقع اصلاحات کے بارے میں کانگرس سے مفاہمت کرنا تھا۔ قائد اعظم کی ان تھک مساعی سے مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان میثاقِ لکھنؤ طے پایا جس میں کانگرس نے پہلی بار مسلمانوں کا حق جداگانہ نیابت Separate Electorate تسلیم کیا۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب دونوں قوموں میں ایک ہی آئینی مسودہ پر اتفاقِ رائے ہوا اور دونوں نے جنگ کے فوراً بعد حکومتِ خود اختیاری کا مشترکہ مطالبہ کیا۔

جنگ کے بعد رولٹ ایکٹ کے منظور ہونے پر اہلِ ہند نے شدید ناراضی اور برہمی کا اظہار کیا اور اسے "کالے قانون" کا نام دیا۔ نتیجے کے طور پر سیاست کا تمام تر محور برطانیہ کی مخالفت بن گیا۔ حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات اس حد تک بھڑک اٹھے کہ جب ۱۲ دسمبر ۱۹۱۹ء کو یوم صلح منانے کا اعلان ہوا تو مسلمانوں نے یوم صلح منانے کے خلاف کمیٹی قائم کی تاکہ مسلمانوں کو فتح کی تقریبات میں شامل ہونے سے روکا جا سکے۔ اسی دور میں خلافت کے حق میں تحریکِ خلافت شروع کی گئی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کیا۔ کانگرس اور مسلم لیگ نے ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں ایک ساتھ اجلاس منعقد کیے۔ اس اجلاس میں اشتراک اور اتحاد کا جو روح پرور مظاہرہ ہوا اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ "عام لوگوں نے اپنے باہمی اختلافات یکسر فراموش کر دیے ہیں۔"[۱] جب تحریکِ خلافت پورے عروج پر تھی تو ترکِ موالات کی مہم شروع کر دی گئی اور گاندھی نے اپنے ترکِ موالات کے پروگرام کو تحریکِ خلافت میں شامل کر کے مسلمانوں کی جدوجہد کا

۱: Indian Year Book ۱۹۱۹ء صفحات ۳۳ - ۴۸

Marfat.com

پورا ساتھ دیا۔" [1] یہ دور مسلمانوں اور ہندوؤں میں فقیدالمثال یک جہتی کا دور تھا لیکن یہ اتحاد عارضی اور مختصر ثابت ہوا کیونکہ دونوں قوموں کے اندازِ فکر میں بے پناہ فرق تھا جس کے سبب زیادہ عرصے تک اتحاد قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

جب ترکوں نے خود ہی عبائے خلافت چاک کر دی تو ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے کوئی پروگرام نہ رہا اور کچھ عرصے کے لیے ان کی سیاسی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ ہندوستان کی عام سیاست بھی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ اسی زمانے میں حکومتِ برطانیہ نے سر جان سائمن کی سربراہی میں ایک کمیشن بھیجنے کا فیصلہ کیا جس سے ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک بار پھر ہلچل مچ گئی۔ کیونکہ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی رکن کو شامل نہیں کیا گیا تھا اس لیے اہلِ ہند نے اس کا مقاطعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سائمن کمیشن کے خلاف سب سے پہلا اور زوردار احتجاجی جلسہ محمد علی جناح نے بمبئی میں ترتیب دیا۔ ابھی کمیشن برعظیم کے ساحل پر اترا بھی نہ تھا۔ کانگرس نے ہندوستان کے لیے آئین مرتب کرنے کے لیے ایک کُل جماعتی کانفرنس طلب کی جس کے نتیجے کے طور پر موتی لال نہرو کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ ۱۹۲۷ء میں جب اس کمیٹی کی رپورٹ منظرِ عام پر آئی تو مسلمانوں کو احساس ہُوا کہ ان کے تمام مطالبات نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جن امور و معاملات پر ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ میں اتفاق ہو چکا تھا ان سے بھی پہلو تہی کی گئی ہے۔ اس رپورٹ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین اختلافات کی ایک ایسی وسیع خلیج حائل کر دی جو پھر کبھی پاٹی نہ جا سکی۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے کہا تھا کہ اب ہمارے راستے

---

[1]: ایضاً ۲۲-۱۹۲۱ء صفحہ ۳۶۔

58904

Marfat.com

کانگرس سے بالکل الگ ہو چکے ہیں۔ ؎

اس موقع پر مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ ایک دھڑے کے رہنما سر محمد شفیع تھے اور دوسرے کے محمد علی جناح۔ اختلاف و نزاع اس بات پر تھا کہ کانگرس کی بلائی ہوئی کُل جماعتی کانفرنس سے تعاون کیا جائے یا نہ؟ دونوں دھڑوں کے اجلاس علی الترتیب لاہور اور کلکتہ میں منعقد ہوئے۔ جناح گروپ نے کُل جماعتی کانفرنس سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس وقت تک انھیں توقع تھی کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیا جائے گا لیکن کانگرس کی تنگ نظری نے بالآخر انھیں بھی مایوس کر دیا۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں سر محمد شفیع اور محمد علی جناح کی دہلی میں ملاقات ہوئی جس میں دونوں دھڑوں کو متحد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ محمد علی جناح نے لیگ کونسل کے نام ایک بیان جاری کیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ "نہرو رپورٹ" مسلمانوں کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے "چودہ نکات" پر مشتمل اپنے مطالبات کی سکیم پیش کی۔

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہوا جس میں علامہ اقبال نے اپنے تاریخی خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کے نصب العین کی آئندہ جھلک دکھائی۔ انھوں نے کہا۔ "ہند کی معاشرتی اکائیاں یورپی ملکوں کی طرح علاقائی نہیں ہیں بہت سی ہند انسانی جمعیتوں پر مشتمل ایک براعظم ہے جن کا تعلق مختلف نسلوں سے ہے جو مختلف

؎ : عبدالحمید Muslim Separatism In India
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی (۱۹۷۱ء) ص ۲۰۰

Marfat.com

زبانیں بولتے ہیں اور مختلف مذاہب کے پیروکار ہیں۔ اس لیے مسلمان ایک مسلم ہند کی تخلیق و تشکیل کا مطالبہ کرنے میں پوری طرح حق بجانب ہیں۔[1]
یوں تو مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی تحریک کئی برسوں سے کام کر رہی تھی لیکن اس کا واضح تصوّر علامہ اقبال نے پہلی مرتبہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر لندن میں اپنے ایک انٹرویو کے دوران میں پیش کیا۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی آمد آمد تھی مسلمانوں نے بھی اپنی صفوں کو ازسرِنو آراستہ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ نتیجتہً لیاقت علی خان اور دوسرے مسلم لیڈروں نے محمد علی جناح سے درخواست کی کہ وہ انگلستان سے واپس آکر مسلمانوں کی راہنمائی کریں۔ اس سے قبل محمد علی جناح گول میز کانفرنسوں کی ناکامی کے بعد برطانیہ ہی میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ اوائل ۱۹۳۴ء میں ہندوستان واپس آ گئے اور مسلم لیگ کی ازسرِنو شیرازہ بندی میں مصروف ہو گئے۔ مارچ ۱۹۳۴ء میں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے راہنماؤں کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا جس میں محمد علی جناح کو اتفاقِ رائے سے مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔[2]

اگرچہ محمد علی جناح مسلم لیگ کے تنِ ناتواں کو مضبوط بنانے کے لیے دن رات جدوجہد کر رہے تھے لیکن پھر بھی مسلم لیگ کانگرس کے مقابلے

---

[1] : Dr. Sir Muhammad Iqbal, Presidential Address, Allahabad Session, December 1930, Delhi, All India Muslim League, 1945, P. 12.

[2] : Indian Annual Register
جلد چہارم ۱۹۳۴ء، ص ۲۱۷ -

Marfat.com

میں سیاسی طور پر بہت پیچھے تھی۔ اوّل تو کانگرس مسلم لیگ سے زیادہ پرانی اور منظم جماعت تھی۔ دوم اسے ہر دور میں مقبول اور مخلص قیادت میسّر رہی تھی۔ سوم اسے ہندو صنعت کاروں، تاجروں اور تعلیم یافتہ طبقے کی مالی اور سیاسی حمایت حاصل تھی۔ ہندو یوں بھی مسلمانوں کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ اور منظم تھے۔ چہارم مسلم لیگ اور کانگرس کے پروگرام میں کوئی ایسا واضح فرق نہیں تھا جو اسے کانگرس سے ممتاز کر سکتا۔ ان برسوں میں اگر مسلم لیگ کی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک بے جان تنظیم تھی۔ مسلم لیگ کی عام مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال الہ آباد کے سالانہ اجلاس میں گئے تو جلسہ شروع ہونے تک ابھی کورم بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح دہلی کے سالانہ اجلاس میں حاضرین کی تعداد تقریباً ۱۲۰ تھی۔[۱] کچھ عرصے سے سالانہ اجلاس بھی باقاعدگی سے منعقد نہیں ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا تیئسواں سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۳۳ء میں ہوا اور چوبیسواں اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء سے قبل منعقد نہ ہو سکا۔ مسلم لیگ نہ صرف مالی طور پر کمزور تھی بلکہ اس کے پاس کوئی پراپیگنڈہ مشینری بھی نہیں تھی۔ اسی لیے نہرو کہا کرتا تھا کہ مسلم لیگ امراء کی جماعت ہے۔[۲]

ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۷ء میں جب صوبائی اسمبلیوں کے

---

[۱] : خالد بن سعید Pakistan : The Formative Phase آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (پاکستان برانچ) ۱۹۶۹ء ص ۱۷۷-۱۷۶

[۲] : The Statesman کلکتہ ۱۴- جنوری ۱۹۳۷ء -

Marfat.com

انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کل ۱۵۸۵ سیٹوں میں سے کانگرس نے ۷۱۱ سیٹیں جیت لیں جن میں ۲۶ مسلم سیٹیں بھی شامل تھیں۔ اس کے برعکس مسلم لیگ نے ۴۸۹ مسلم سیٹوں میں سے صرف ۱۰۴ جیتیں۔ بنگال کی ۱۱۹ سیٹوں میں سے مسلم لیگ کے حصّے میں صرف ۳۷ سیٹیں آئیں۔ پنجاب میں مسلم لیگ کا حشر اور بھی خراب ہوا، کیونکہ یہاں ۸۶ سیٹوں میں سے مسلم لیگ نے صرف ایک نشست جیتی۔ سندھ اور سرحد میں مسلم لیگ کو مکمل شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان نتائج سے یہ بات کھُل کر سامنے آ گئی کہ مسلم لیگ کو مسلمان عوام کی حمایت حاصل نہیں اور اسے عوام کے قریب لانے کے لیے ابھی بہت سی جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ان انتخابات کے نتیجے کے طور پر گیارہ صوبوں میں سے نو صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں بنیں۔ کانگرس کی حکومت کے اڑھائی سال (۱۹۳۷ء - ۴۰) مسلمانوں کے لیے اس لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوئے کہ ان کی کانگرس سے تمام توقعات اور خوش فہمیاں خاک میں مل گئیں۔ محمد علی جناح اور دوسرے رہنما اس وقت تک مخلوط حکومت بنانے کے انداز میں سوچتے رہے تھے لیکن کانگرس حکومت کے تلخ رویّے سے انھیں یقین ہو گیا کہ "مراعات اور تحفظات" کا نام نہاد آہنی حصار ریت کی دیوار کے مانند ہے جسے ہوا کا ایک جھونکا بھی مسمار کر سکتا ہے۔ ان پر پوری طرح واضح ہو گیا کہ "حب الوطنی اور انصاف کی اپیلیں کثیر التعداد اور مضبوط تر فریق کے عزائم کو انصاف کے سانچوں میں ڈھالنے کے بجائے انھیں اور زیادہ ابھارنے کا باعث

بنتی ہیں۔" [1] کانگرس نے اپنے دورِ حکومت میں اقلیتوں کے مفاد کو بے رحمی سے پامال کیا اور مسلم لیگ کے نمائندوں کو صوبائی وزارتوں میں شامل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح انتظامیہ میں مسلمانوں کو ان کے حصّہ سے بھی محروم کر دیا گیا۔ سکولوں میں مسلمان بچّوں کو ہندی پڑھنے پر مجبور کیا گیا اور نصاب میں ہندو نظریات اور ثقافت کا زہر گھول دیا گیا جو مسلمانوں کو انتہائی ناگوار گزرا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ کانگرس منظم سازش کے ذریعے اسلامی تہذیب و ثقافت کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مسلمانوں کے متعلق کانگرس کے اس منفی رویے نے مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان اختلافات کی خلیج کو وسیع تر کر دیا اور مسلمان اپنے مستقبل کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگے۔

مسلم لیگ بے بس ہو کر رہ گئی اور کانگرس کو معقولیّت سے کام لینے پر آمادہ نہ کر سکی۔ باہمی تلخی اور بیزاری اس حد تک بڑھ گئی کہ مصالحت و مفاہمت کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ اس صورتِ حال کی وضاحت علامہ اقبال نے اپنے ایک خط میں بھی کی جو انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو محمد علی جناح کو لکھا۔ اس خط میں ہندی مسلمانوں کی سیاسی صورتِ حال کی وضاحت کرنے کے ساتھ انھوں نے مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا۔" روٹی کا مسئلہ روز بروز نازک ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ پچھلے دو سو برسوں میں ان کی حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے۔ ایک عام مسلمان کا یہ

---

[1] : اے عزیز Discovery of Pakistan (لاہور ۱۹۵۷ء) ص ۲۱۶۔

Marfat.com

خیال ہے کہ اس کی غربت کی ساری ذمہ داری ہندو مہاجن یا سرمایہ دار پر ہے۔ ابھی اس کے تصوّر میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں نہیں ہوا کہ اس صورتِ حال کی ذمّہ داری مساوی طور پر غیر ملکی حکومت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ لیکن یہ تاثر بھی لازمی طور پر ابھرے گا...... اب اصل سوال ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا مسئلہ کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟ مسلم لیگ کے مستقبل کا تمام تر انحصار اس مسئلہ کو حل کرنے میں اس کی دلچسپی اور سرگرمی کے اظہار پر ہے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ سے یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ و فروغ کا خواب ایک آزاد مسلم مملکت یا مملکتوں کے قیام کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ سالہا سال سے یہ میری ایماندارانہ رائے رہی ہے اور اب بھی میرا یہی پختہ یقین ہے کہ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا حل یہی ہے...... لیکن مسلم ہند کو اپنے مسائل حل کرنے کے قابل بنانے کے لیے اس ملک کی از سرِ نو تقسیم ضروری ہے۔ تاکہ ایک یا ایک سے زائد ایسی مسلم مملکتیں معرضِ وجود میں آ سکیں جن میں مسلمانوں کو قطعی اکثریت حاصل ہو۔ کیا آپ کے خیال میں اس مطالبہ کے لیے آواز اٹھانے کا وقت آ نہیں گیا؟" [1]

مسلم لیگ کا پچیسواں اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ اس اجلاس میں پچھلے بیس برسوں کی نسبت زیادہ نمائندے اور لیڈر شامل ہوئے جن میں بنگال کے وزیرِ اعلیٰ فضل الحق، پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ

---

[1] Letters of Iqbal to Jinnah : محمد اشرف پبلشر۔ کشمیری بازار۔ لاہور۔

Marfat.com

سکندر حیات اور آسام کے وزیرِ اعلیٰ سر سعد اللہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم لیگ عوامی جماعت کی حیثیت سے ابھر رہی تھی، اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ :۔ "آزاد جمہوری ریاستوں پر مشتمل وفاقیہ کی صورت میں مکمل آزادی کا حصول مسلمانوں کا نصب العین ہے۔"[۱] اس عہد آفرین فیصلے نے مسلمانوں میں ولولۂ حریت پیدا کیا اور مسلم لیگ کی مقبولیت میں بھی اضافہ کیا۔ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ہفت روزہ "پیسہ اخبار" نے لکھا: "مسلم لیگ آزادی پسند جماعت بن گئی ہے اور وہ مادرِ وطن کی آزادی اور مسلم حقوق کی حفاظت کی علمبردار ہے۔"[۲]

لکھنؤ کے اجلاس کا سارے ہندوستان میں بہت خوش گوار اثر ہوا اور پورے ملک میں مسلمان اپنے آپ کو بحیثیت قوم منظم کرنے لگے۔ دور دراز شہروں اور قصبوں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہو گئیں اور یوں معلوم ہوتا تھا "جیسے کسی معجزے نے ساری قوم کو بیدار کر دیا ہے۔"[۳]

۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا چھبیسواں اجلاس پٹنے میں ہوا۔ جس میں مسلم لیگ کی تنظیمی صلاحیتوں کو بہتر بنانے پر غور کیا گیا۔ اس اجلاس میں

---

[۱] : پیسہ اخبار (ہفت روزہ) ۱۸ر نومبر ۱۹۳۷ء۔

[۲] : ایضاً - ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء۔

[۳] : What Price Freedom محمد رضا خان (ممبر مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی مدراس) نوری پریس مدراس (۱۹۶۹ء) ص ۴۳ - ۴۵۔

Marfat.com

قائدِ اعظم نے کانگریس کی ان زیادتیوں اور بے انصافیوں کا تفصیل سے ذکر کیا جو اس نے حکمران جماعت کی حیثیت سے اپنے صوبوں میں مُسلمانوں سے روا رکھی تھیں۔ اس اجلاس میں اُنھوں نے مُسلمانوں سے بڑے پُرسوز انداز میں کہا: "مسلم لیگ تمھاری ہے۔ اس میں شامل ہو کر اسے اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا گہوارہ بنائیے۔"[۱] قائدِ اعظم کی اس اپیل کا مسلمان عوام پر گہرا اثر ہُوا اور وُہ جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔ اصل میں مسلم لیگ کے عوامی کردار کا آغاز لکھنؤ کے اجلاس سے شروع ہُوا جسے پٹنہ کے اجلاس نے مزید تقویت دی۔ اس دور میں مسلم طلبہ بھی مسلم لیگ کی جانب متوجہ ہو رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کر لی تھی جس کے دو اجلاسوں پنجاب اور علی گڑھ سے قائدِ اعظم نے بھی خطاب کیا۔ قائدِ اعظم کی اس دور کی تقریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض حفاظتی اقدامات سے مایوس ہو چکے تھے اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ خطۂ زمین کے حصول پر غور کر رہے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے وُہ مسلمانوں سے بار بار کہتے تھے کہ تُمھاری نجات مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہونے میں مُضمر ہے۔

دُوسری جنگِ عظیم شُروع ہُوئی تو مسلم لیگ نے محمد علی جناح کو یہ اختیار دے دیا کہ وُہ "مسلمانوں کی طرف سے برطانیہ کو جنگ میں حمایت و تائید کا یقین دلائیں بشرطیکہ انھیں بھی اپنے مطالبات

---

[۱]: ایضاً۔ صفحہ ۷۴۔

Marfat.com

کے بارے میں یقین دلایا جائے۔" [1] دوسری طرف کانگرس ورکنگ کمیٹی نے حکومت کے رویّہ کے خلاف بطور احتجاج کانگرسی وزارتوں کو مستعفی ہونے کا حکم دے دیا۔ اس موقع پر قائدِاعظم نے مُسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ جب کانگریس کی وزارتیں مستعفی ہوں تو وُہ یومِ نجات منائیں۔ قائدِاعظم کی اس اپیل کا بہت اثر ہُوا اور نتیجے کے طور پر ہر جگہ مسلمانوں نے جلسے منعقد کیے اور جلوس نکالے۔ کہاں تو ۱۹۲۸ء میں یہ عالم تھا کہ جب قائدِاعظم نے آل پارٹی کانفرنس کلکتہ میں مسلمانوں کی جانب سے تقریر کرنی چاہی تو ان پر آوازے کسے گئے اور کہاں اب یہ حال تھا کہ اُن کے اشارے پر ساری قوم بازاروں میں نکل آئی تھی۔

۱۹۳۹ء کے خاتمے کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اور یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے مشترکہ طور پر حکومتِ ہند کی ذمہ داری سنبھالنا ناممکن ہے۔ "اب یہ ضروری تھا کہ ان میں سے ایک دوسرے پر غلبہ پا لے۔ یہ توقع کہ دونوں میں مساوات کا رشتہ قائم رہے، ناممکن بات تھی" [2] حالات نے مسلمانوں کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وُہ اپنے لیے ایک علیحدہ اور آزاد وطن کا مطالبہ کریں جہاں وُہ اپنے طرزِ حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ کیونکہ مسلمان ہر لحاظ سے ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی

---

[1]: Keesings Contemporary Archives
۱۸-۱۱ نومبر ۱۹۳۹ء، صفحہ نمبر ۳۸۰۶۔

[2]: The Making of Pakistan
رچرڈ سائمنڈ لندن (۱۹۵۷ء) ص ۳۱۔

تہذیب، ان کا مذہب، ان کا اندازِ فکر حتیٰ کہ ان کی بود و باش بھی ہندوؤں سے مختلف ہے۔ اسی اندازِ فکر نے بالآخر لاہور ریزولیشن کی راہ ہموار کی۔

پنجاب کو مسلم اکثریت کا صوبہ ہونے کے باعث ہندوستان کی مسلم سیاسیات میں بڑی اہم حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے مسلم لیگ کے لیے اس صوبے کی پوری تائید و حمایت حاصل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منعقد کیا جائے گا۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ جس میں "قرارداد لاہور" منظور کی گئی۔ اس قرارداد میں پہلی بار مسلمانانِ ہند کے لیے واضح مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا ___ اس قرارداد میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ شمال مغرب میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان اور مشرق میں بنگال اور آسام برطانوی ہند کے صوبوں پر مشتمل علاقوں کو برطانوی ہند سے باہر آزاد مملکتوں کی شکل دے دی جائے۔

اس اجلاس کے انعقاد سے صرف چند دن قبل لاہور میں خاکساروں پر گولی چلائی گئی اور کئی درجن مسلمان شہید ہو گئے ___ اس کے باوجود اس اجلاس میں لاتعداد مسلمانوں نے شرکت کی۔ محمد علی جناح نے تقریر کرتے ہوئے کہا: "کہ کانگریس جنگِ عظیم سے فائدہ اٹھا کر مکمل آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن جب تک مسلمانوں کا وجود بحیثیت الگ قوم تسلیم نہیں کیا جاتا یہاں آزادی کا کوئی خواب بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ مسلمان اور ہندو دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تہذیب،

Marfat.com

روایات اور لٹریچر بھی ایک دُوسرے سے مختلف ہے۔ میں نے ہندو مُسلمان اتحاد کے مسئلے پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہُوں کہ یہ تصوّر نہ صرف ناقابلِ عمل ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔" [1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اجلاس میں نہ کسی مقرر نے پاکستان کا لفظ استعمال کیا اور نہ قرارداد کے متن میں یہ لفظ استعمال کیا گیا تھا لیکن ہندو اخبارات نے اسے "قراردادِ پاکستان" کا نام دے کر مسلمانوں کی مشکل حل کردی۔ "قرارداد لاہور کی وضاحت اور اس کے حقیقی معنی و اہمیت سمجھانے کے لیے مسلم لیڈروں کو نہ جانے کتنا طویل عرصہ لگ جاتا۔ لیکن ہندو اخبارات نے اس قرارداد کو پاکستان سے موسوم کرکے یہ کام بہت آسان کر دیا۔" [2]

پاکستان کے لیے جدوجہد

اس دوران میں برطانیہ جنگ میں سرتاپا اُلجھا ہُوا تھا۔ اس ضمن میں حکومتِ ہند نے ایک قومی دفاعی کونسل قائم کی جس میں صُوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بہ حیثیت عُہدہ شامل کیا گیا۔ اس موقعے پر مسلم لیگ نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس کے ارکان لیگ کے صدر کی اجازت کے بغیر اس کونسل کی رُکنیت قبول نہیں کر سکتے۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس اپریل ۱۹۴۱ء میں ہُوا جس میں ان مسلم لیڈروں کے معاملات کا

---

[1]: محمد رضا خان (بحوالہ سابقہ) ص ۶۳ - ۶۵ -

[2]: خلیق الزمان Pathway to Pakistan (لانگ مین پاکستان برانچ (۱۹۶۱ء) ص ۲۳۷)

Marfat.com

جائزہ لیا گیا جو صدر لیگ کی اجازت کے بغیر کونسل کے رکن بن گئے تھے۔ کمیٹی نے ان ارکان کو مستعفی ہو جانے کی ہدایت کی ـــ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات خان نے اس فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے استعفا دے دیا۔ آسام کے وزیرِ اعلیٰ سر محمد سعد اللہ نے بھی استعفا دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن بنگال کے مولوی فضل الحق نے انکار کر دیا اور ۸ ستمبر ۱۹۴۱ء کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل سے مستعفی ہو جانے کی دھمکی دی۔ بالآخر وُہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے۔ جن ارکان نے مسلم لیگ کی اجازت کے بغیر یہ مناصب قبول کیے تھے، مسلم لیگ نے ان کے بارے میں بھی سخت رویہ اختیار کیا چنانچہ سر سلطان احمد اور بیگم شاہ نواز کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا کیونکہ وُہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ارکان بن گئے تھے۔

مولوی فضل الحق کے علیحدہ ہو جانے کے بعد مسلم لیگ نے بنگال میں خواجہ ناظم الدین کی سربراہی میں علیحدہ اسمبلی پارٹی قائم کر لی لیکن مولوی فضل الحق نے "فارورڈ بلاک" کی مدد سے اپنی وزارت کو بچا لیا۔ اگرچہ اس بحران سے مُسلم لیگ کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ لیکن اس دوران میں لیگ ایک عوامی تنظیم بن چکی تھی، اس لیے اب وُہ شخصیات کی خواہ وہ کیسے ہی اثر و رسُوخ کی مالک کیوں نہ ہوں مرہُونِ منت نہیں رہی تھی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مولوی فضل الحق دوبارہ مسلم لیگ میں شامل ہونے پر مجبُور ہو گئے۔

برطانوی حکومت جنگ کے باعث ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنا چاہتی تھی اس لیے ہندوستانی لیڈروں سے بات چیت کرنے

Marfat.com

کے لیے سر سٹیفورڈ کرپس کو بھیجا گیا۔ کرپس نے جو منصوبہ پیش کیا اس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مبہم سا خاکہ موجود تھا لیکن مسلم لیگ نے تو تقسیم کا ایک واضح اور جامع منصوبہ مرتب کر رکھا تھا اس لیے اس نے کرپس کی تجاویز کو منظور نہ کیا۔ کرپس کی تجاویز جزوی طور پر اچھی تھیں اور جزوی طور پر ناقابلِ قبول۔ بہر حال برطانیہ کی جنگی کابینہ نے مسلمانوں کے حقِ خود اختیاری کا اعتراف تو کر لیا کچھ بھی ہو ہند کے ملول دعرض پر "یونین گورنمنٹ" مسلط کرنے کا عندیہ ناقابلِ تصور تھا[1]۔ دوسری طرف کانگریس نے بھی اس منصوبے کو مبہم اور ادھورا قرار دے کر نامنظور کر دیا۔[2]

مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے اس منصوبے کو مختلف اور متضاد اسباب کی بنیاد پر مسترد کیا تھا۔ مسلم لیگ کا خیال یہ تھا کہ اس میں پاکستان کا تصور واضح طور پر پیش نہیں کیا گیا تھا جبکہ کانگرس کا ردِ عمل یہ تھا کہ اس منصوبے سے "ہند کی وحدت کے تصوّر پر شدید ضرب لگی ہے۔" انہی دنوں قائد اعظم نے ایک اخباری انٹرویو میں کہا کہ مسلم لیگ صرف اسی صورت میں مصالحت کر سکتی ہے کہ تمام فریقوں کے لیے پاکستان کی سکیم قابلِ قبول ہو۔"[3] راج گوپال اچاریہ نے مدراس کے کانگرسی ارکان سے ایک قرار داد منظور کرا لی۔ جس میں کانگرس ورکنگ کمیٹی سے یہ سفارش کی گئی تھی کہ وہ مسلم لیگ کا مطالبہ

---

[1] : سول اینڈ ملٹری گزٹ ۔ یکم اپریل ۱۹۴۲ء

[2] : ایضاً ۱۱ر اپریل ۱۹۴۲ء

[3] : ایضاً ۱۶ر اپریل ۱۹۴۲ء

Marfat.com

قبول کرلے لیکن کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۹ر اپریل ۱۹۴۲ء کو یہ قرارداد مسترد کردی۔[1] راج گوپال اچاریہ نے اس ناکامی کے باوجود حوصلہ نہ ہارا۔ بالآخر اسے کانگرس کی رکنیت سے مستعفی ہونا پڑا۔

کانگرس کی "ہند چھوڑ دو" Quit India تحریک نے برطانوی حکومت کو ایک نئی مشکل سے دوچار کردیا۔ ۱۰ر ستمبر کو چرچل نے اس تحریک کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "کانگرس سارے ہند کی نمائندہ و ترجمان نہیں ہے .... اس پارٹی سے باہر اور اس کی مخالفت میں صف آرا نو کروڑ مسلمان بھی ہیں جنھیں اپنے معاملات پر اظہارِ خیال کا پورا حق حاصل ہے۔ مزید برآں کانگرس پس ماندہ طبقات سکھوں اور عیسائیوں کی ترجمان و نمائندہ ہونے کا بھی دعوی نہیں کرسکتی اور حکومت اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔"[2]

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اپریل ۱۹۴۳ء میں دہلی میں ہوا، جس میں کانگرس کی اس تحریک کے جواب میں محمد علی جناح نے "تقسیم کرو اور چلے جاؤ" کا نعرہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ انگریزوں اور کانگرس کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہندوستان کی آزادی کا راز مطالبہ پاکستان کو تسلیم کرنے میں مضمر ہے۔

۱۹۴۳ء کے طلوع نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد و منظم ہوتے دیکھا۔ مسلم لیگ نے سرحد، سندھ، بنگال اور آسام

---

[1] : ایسٹرن ٹائمز۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۴۲ء۔

[2] : ایضاً ۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۲ء

Marfat.com

میں وزارتیں بنالی تھیں اور سکندر جناح معاہدہ کے بعد پنجاب وزارت بھی مسلم لیگ کی نمائندہ سمجھی جاتی تھی۔ اب مسلم لیگ کی صفوں میں طلبہ بھی شامل ہو چکے تھے اور اس کی شاخیں دُور دراز دیہاتوں تک قائم کی جا چکی تھیں مختصر یہ کہ اب مسلم لیگ کی قوت میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اگلا اجلاس دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں ہُوا جس میں محمد علی جناح نے ملک کی سیاسی صُورتِ حال کا تجزیہ پیش کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ مسلمان "اکھنڈ ہندوستان" کے نظریے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔

۱۹۴۳ء میں سر سکندر حیات کی وفات کے بعد خضر حیات ٹوانہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تو مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے اتحاد کا تصوّر پارہ پارہ ہو گیا۔ لیکن صوبائی مسلم لیگ کے راہنماؤں اور کارکنوں نے اس صورتِ حال سے بے نیاز ہو کر پنجاب میں مسلم لیگ کو ازسرِنو منظم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں جن میں ان کو خاصی کامیابی ہُوئی۔ صوبائی مسلم لیگ نے اس سلسلے میں اپنا پروگرام مرتب کیا اور تمام ضلعی لیگوں کو اپنی سرگرمیوں کی تنظیمِ نو کی ہدایت کی۔ یہ کام بڑے جوش اور خلوص سے شروع کیا گیا اور پنجاب میں مسلم لیگ روز افزوں مقبولیت حاصل کرنے لگی یونینسٹ حکومت اس صورتِ حال سے چشم پوشی نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے لیگ کی سرگرمیوں کو حاکمانہ استبداد سے دبانے کی کوششیں کیں لیکن لیگ کے نوجوان اور باہمت لیڈروں اور جذبے سے سرشار طلبہ نے یونینسٹوں کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا اور

Marfat.com

دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب مسلم لیگ آل انڈیا مسلم لیگ کا بڑا فعال اور مؤثر حصّہ بن گئی۔ مسلم لیگ نے اپنی علیحدہ اسمبلی پارٹی بھی قائم کردی تاکہ "یونینزم کی اس غلیظ اور مکروہ قسم کو ہمیشہ کے لیے نابود کردیا جائے جس نے بڑے طویل عرصے سے پنجاب کے دامن کو داغدار کر رکھا ہے۔" [۱]

اس دوران میں مسلم لیگ بھی کانگریس کی طرح ایک فعال اور موثر تنظیم بن چکی تھی اور اب کانگریس کے لیے اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ چنانچہ گاندھی نے ۱۷ر جولائی ۱۹۴۴ء کو قائداعظم کو ایک خط لکھا جس میں انھیں ملاقات اور ہندوستان کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کی دعوت دی۔ مذاکرات ۱۹۴۴ء میں ہوئے، جس میں قائداعظم نے گاندھی کو قرارداد لاہور کے بنیادی اور اساسی اصولوں کو قبول کر لینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جب کہ گاندھی نے وحدتِ ہند کی اہمیت پر زور دیا۔ بات چیت ناکام ہوگئی اور مسلم لیگ نے مذاکرات کی ناکامی کو اپنے نصب العین کے حصُول کے لیے بھرپور جدوجہد کا نقطۂ آغاز بنا لیا۔

جون ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس بہت سی توقعات کے ساتھ شروع ہوئی۔ خیال تھا کہ اس سے سیاسی تعطّل دُور ہو سکے گا، لیکن یہ توقع محض سراب ثابت ہوئی کیونکہ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا کہ صرف مسلم لیگ ہی کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے مسلم ارکان منتخب کرنے کا حق و اختیار حاصل ہے۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی ایک

۱: پنجاب صوبائی مسلم لیگ کا منشور (لاہور ۱۹۴۴ء) ص ۴۔

لحاظ سے مسلم لیگ کے لیے سود مند ثابت ہوئی اسلئے کہ کانگریس کے غیر معقول اور متعصبانہ رویّے نے کئی کانگریسی مسلمانوں پر کانگریس کی اصل حقیقت آشکارا کر دی اور وہ کانگریس سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ان راہنماؤں میں میاں افتخار الدین اور خان عبدالقیوم خاں کا نام قابلِ ذکر ہے بعدازاں انھوں نے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے لیے بڑا کام کیا۔

۲۱ اگست اور ۱۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ عام انتخابات جلد از جلد کرائے جائیں گے اور حکومتِ برطانیہ ہندوستان کو جلد از جلد آزادی دینے کے لیے یہاں کے راہنماؤں سے بات چیت کرے گی۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ منظم جماعت نہیں تھی، لیکن اب وہ طاقت ور اور عوامی جماعت بن چکی تھی۔ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کے مستقبل کا فیصلہ ہونا تھا اس لیے یہ انتخابات مسلم لیگ کے لیے زندگی اور موت کی اہمیت رکھتے تھے۔ اسے اب یہ ثابت کرنا تھا کہ صرف وہی مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اسے "یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ کانگریس، جمیعت اور احرار کا مسلمانوں پر کوئی حق اور دعویٰ نہیں ہے۔"[1] مسلم لیگ نے ان انتخابات میں "پاکستان کے نصب العین" کی بنیاد پر حصّہ لیا اور اسے عظیم الشان فتح حاصل ہوئی مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ نے تمام نشستیں جیت لیں اور صوبوں میں مسلمانوں کے لیے مخصوص ۴۹۴ نشستوں میں سے ۴۳۹ حلقوں میں مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوئے۔[2]

---

[1] : محمد رضا خاں ۔ بحوالہ سابقہ ۔ ص ۱۳۳ ۔

[2] : جمیل الدین احمد، FINAL PHASE OF Struggle For Pakistan
کراچی (۱۹۶۴ء) ص ۲۶ ۔

Marfat.com

گویا مسلم لیگ نے مسلمانوں کے تقریباً ۸۶۸ فیصد ووٹ حاصل کیے۔[1]
مسلم لیگ نے اس شاندار کامیابی پر ہند کے طول و عرض میں ۱۱ر جنوری ۱۹۴۶ء کو "یوم فتح" منایا۔ اس موقع پر مسلم لیگ نے ایک مرتبہ پھر عوام کو اپنے مقاصد سے آگاہ کیا اور مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ حصولِ پاکستان کے لیے اپنی جدو جہد تیز تر کر دیں۔

صوبائی وزارتوں کی تشکیل کے مرحلے پر کانگریس نے مسلم لیگ کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی اور وہ سندھ میں جی۔ ایم سید کو اپنے دام میں پھنسانے میں کامیاب بھی ہوگئی۔ نتیجے کے طور پر مسلم لیگ نے جی۔ ایم سید کو جنوری ۱۹۴۶ء میں جماعت سے نکال دیا۔[2] جی۔ ایم سید نے کانگریس کی حمایت سے سندھ میں حکومت بنالی۔

دوسری طرف پنجاب میں بھی سیاست دل چسپ رنگ اختیار کر گئی۔ یہاں اگرچہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ۸۶ نشستوں میں سے ۷۹ جیت لی تھیں لیکن اس کے باوجود جمہوری تقاضوں کو پامال کرتے ہوئے مسلم لیگ کے بجائے یونینسٹ پارٹی کے سربراہ خضر حیات کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی حالانکہ اس کا گروپ ۱۰ ارکان پر مشتمل تھا۔ اس طرح جس پارٹی نے انتخابات میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی تھی برطانوی حکمتِ عملی کی ناانصافی نے اسے برسر اقتدار آنے سے روک دیا۔"[3] یہ وزارت سکھوں، کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کے اتحاد کا نتیجہ تھی اور اس کی تشکیل کے

---

۱ : ایضاً۔ ۲ : ایسٹرن ٹائمز ۳ر جنوری ۱۹۴۶ء۔

۳ : اے عزیز (بحوالہ سابقہ) ص ۳۰۳

Marfat.com

سلسلے میں ابوالکلام آزاد نے اہم کردار انجام دیا تھا۔ اگرچہ پنجاب کے مسلمان عوام نے اس اقدام کے خلاف احتجاج کیا لیکن یہ مخلوط حکومت ان پر مسلط کر دی گئی۔ کانگریس کی ان حرکات کا مسلمانوں پر شدید ردِ عمل ہُوا اور انھیں یقین ہو گیا کہ کانگریس ان کا شیرازہ منتشر کرنا چاہتی ہے۔

وزارتیں بنانے کا مرحلہ ابھی بمشکل طے ہُوا تھا کہ کیبنٹ مشن کی آمد کا اعلان کیا گیا۔ اس مشن کا مقصد کانگریس اور مسلم لیگ کے مشورے سے ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنا تھا۔ طویل گفت و شنید اور ملاقاتوں کے بعد کیبنٹ مشن نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو اپنے فیصلے کا اعلان کیا جس میں پاکستان کے مطالبے کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ لیکن آئندہ دستوری ڈھانچے میں یہ شق شامل کر دی گئی تھی کہ اگر کوئی صُوبہ مرکز سے علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو اسے یہ حق حاصل ہو گا۔ محمد علی جناح نے ۲۲ مئی کو اپنے بیان میں مشن کی تجاویز پر افسوس کا اظہار کیا اور اپنے اس یقین کا اعادہ کیا کہ ہندوستان کے مسائل کا حل پاکستان کے قیام ہی میں مضمر ہے۔ اسی ضمن میں مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس جون میں دہلی میں منعقد ہُوا۔ جس میں محمد علی جناح نے مشن کی تجاویز کا تجزیہ کرتے ہُوئے کونسل سے کہا کہ مسلمانوں کی پارلیمنٹ کی حیثیت سے ان کے بارے میں فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ ۶ جون کو مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو اس امید کے ساتھ تسلیم کر لیا کہ اس سے بالآخر پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔ کانگریس نے بھی کیبنٹ مشن کی تجاویز کو تسلیم کر لیا اور عوام آزادی کی صبح کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔

جب مرکز میں عبوری حکومت قائم کرنے کا موقع آیا تو کانگریس

Marfat.com

اور مسلم لیگ میں پھر اختلافات پیدا ہو گئے ۔ اختلافات کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کانگریس کابینہ میں مسلمانوں کے نمائندے نامزد کرنے پر اصرار کرتی تھی جب کہ مسلم لیگ کو یہ صورت قبول نہ تھی۔ اس تعطل کا نتیجہ یہ نکلا کہ وائسرائے نے عبوری حکومت کے قیام کا مسئلہ ملتوی کر دیا اور دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے ۷۸ نشستوں میں سے ۷۳ جیت لیں ۔

مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو اس خیال سے منظور کیا تھا کہ ان کے مطابق صوبوں کو مرکز سے علیحدہ ہونے کا حق حاصل تھا، لیکن انتخابات کے بعد نہرو نے کچھ ایسے بیانات دیے جن سے احساس ہوتا تھا کہ کانگریس اکثریت کے بل پر دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کے مطالبات کو مسترد کرنے پر تلی ہوئی ہے ۔ کانگریس کا صدر منتخب ہونے کے بعد نہرو نے ۱۰ جولائی کو ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ وہ کیبنٹ پلان کو اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھالے گا اور اس ضمن میں وائسرائے کو دخل دینے کی ہرگز اجازت نہیں دے گا ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ پلان کی صوبائی گروپوں کی تجویز کی سخت مخالفت کرے گا ۔ اس بیان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ کانگریس اکثریت کے نشے میں مسلمانوں کے احساسات کو کچلنے کا ارادہ کر چکی ہے ۔ اس صورتِ حال نے مسلم لیگی لیڈروں کو سخت مایوس کیا ۔ چنانچہ مسلم لیگ کونسل نے ۲۷ جولائی کو کیبنٹ پلان کی حمایت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ۔ احتجاج کے طور پر مسلم لیگی راہنماؤں نے خطابات واپس کر دیے اور پہلی بار اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے راست اقدام Direct Action کرنے کا فیصلہ کیا ۔

یوم راست اقدام بڑے منظم انداز سے منایا گیا اور ملک کے گوشے گوشے

Marfat.com

میں جلوس نکالے گئے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پاکستان مسلمان عوام کے دل کی دھڑکن بن چکا ہے۔

وائسرائے ہند کی پیہم جدوجہد بالآخر رنگ لائی اور کانگریس نے ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کر لی۔ مسلم لیگ پہلے ہی انکار کر چکی تھی۔ ستمبر سے ۱۵ ر اکتوبر تک لیگی اور کانگریسی لیڈروں کے درمیان بات چیت جاری رہی۔ جس کے نتیجے کے طور پر کانگریس اور مسلم لیگ میں معاہدہ ہو گیا اور مسلم لیگ نے بھی عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس معاہدے کے مطابق کانگریس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ [1]

پنجاب کی خضر کانگریس حکومت نے نازک صورتِ حال کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا اور ۲۴ر جنوری ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کی رضاکار تنظیم مسلم لیگ نیشنل گارڈ کو خلاف قانون قرار دے دیا اس اقدام کے خلاف احتجاج کے طور پر باقاعدہ تحریک چلائی گئی۔ چنانچہ مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۳۱ر جنوری ۱۹۴۷ء کو کراچی میں ہوا۔ جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ پنجاب کی وزارت غیر نمائندہ ہے اس لیے اسے برطرف کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ نے حکومتِ پنجاب کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ عوامی دباؤ کے تحت خضر وزارت نے مارچ ۱۹۴۷ء میں استعفیٰ دے دیا۔

" انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ میں مسلم لیگ کے راستہ سے ہٹ جاؤں

---

[1]: محمد رضا خان (بحوالہ سابقہ) ص ۱۹۲ - ۱۹۳ -

Marfat.com

اور اس کے لیے میدان صاف کر دوں - یہی جماعت مسلمانوں کی نمائندہ تھی اور مسلمانوں کی طرف سے پنجاب کے مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے کی مجاز تھی۔" ۱؎

اپریل سے مئی ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کانگریس اور لیگ کے درمیان طویل مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا۔ اگرچہ ماؤنٹ بیٹن یہ مقصد لے کر ہندوستان آیا تھا کہ متحدہ ہندوستان کو آزادی منتقل کی جائے، لیکن ان مذاکرات نے یہ ثابت کر دیا کہ تقسیمِ ہند کے سوا مسلم لیگ کے لیے کوئی بھی دوسرا حل قابلِ قبول نہیں۔ حتیٰ کہ نہرو بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "مسلم لیگ اگر چاہتی ہے تو وہ پاکستان لے سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اسے ہند کا ایسا کوئی علاقہ نہیں ملے گا جو پاکستان کا حصہ بننے کا خواہاں نہیں۔" ۲؎ یہ بات ایک ایسے شخص نے کہی جس کا قبل ازیں یہ خیال تھا کہ ہم بھارت کو تقسیم نہیں ہونے دیں گے، چاہے سارا ملک جل کر خاکستر ہو جائے۔ ۳؎

تین جون تک کانگریس، سکھ اور مسلم لیگ کے راہنما تقسیمِ ہند پر متفق ہو چکے تھے چنانچہ اسی روز لارڈ ایٹلی نے ہندوستان میں انتقالِ اقتدار کے طریقِ کار کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے مطابق پنجاب اور بنگال کی صوبائی اسمبلیوں کے دو علیحدہ اجلاس ہونے تھے، جن میں ہندو اور مسلم اکثریت کے اضلاع کے ارکان اسمبلی

۱؎ : روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۴ اگست ۱۹۶۲ء

۲؎ : ایسٹرن ٹائمز ۲۴-اپریل ۱۹۴۷ء

۳؎ : محمد رضا خان (بحوالہ سابقہ) ص ۲۳۸ -

Marfat.com

کو علیحدہ علیحدہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ان صوبوں کو تقسیم ہونا چاہیئے یا نہیں۔ سندھ کو بھی ایسا ہی فیصلہ کرنا تھا۔ سرحد میں چونکہ کانگریس برسرِ اقتدار تھی۔ اس لیے عام استصواب رائے کے ذریعے فیصلہ کیا جانا تھا۔ برطانوی بلوچستان کے لیے کوئی تجویز پیش نہ کی گئی۔ علاوہ ازیں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اگر بنگال کو تقسیم کیا گیا تو آسام کے ملحقہ مسلم اکثریت والے ضلع سلہٹ میں بھی استصواب ہوگا۔

پنجاب اور بنگال کے ہندو اکثریت والے اضلاع کے ارکان اسمبلی نے ان صوبوں کو تقسیم کرنے کے حق میں رائے دی عبدالغفار کی مخالفانہ مساعی کے باوجود سرحد کے مسلمانوں نے استصواب میں پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ صادر کیا۔ سندھ اسمبلی نے ۲۰ کے مقابلے میں ۳۳ کی اکثریت سے قیامِ پاکستان کی تائید کی اور ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کو بلوچستان کے تمام قبائلی سرداروں کے جرگہ نے بھی پاکستان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

ان فیصلوں کی روشنی میں پاکستان کے لیے علیحدہ دستور ساز اسمبلی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ۲۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو دہلی میں سرکاری طور پر اس کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اسمبلی کا اوّلین اجلاس ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں ہوا۔ قائد اعظم محمد علی جناح ۱۱ اگست کو اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور اگلے دن ۱۲ اگست کو اسمبلی نے محمد علی جناح کے لیے قائد اعظم کا خطاب تجویز کیا اور اسی دن پاکستان کے لیے قومی پرچم بھی منظور کر لیا گیا۔

Marfat.com

۱۴- اگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کراچی میں پاکستان دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کا افتتاح کیا اور قائدِ اعظم نے ۱۵ر اگست کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اس طرح مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کی صحیح اور مخلصانہ ترجمانی کا شرف مسلم لیگ کے حصّہ میں آیا اور اسے عہد آفرین کامیابی حاصل ہوئی۔ خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا اور ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر ایک نئی اور عظیم مملکت جلوہ گر ہوئی جو آبادی کے اعتبار سے دنیا میں پانچویں اور اسلامی دنیا کی سب سے بڑی مملکت تھی۔

Marfat.com

باب ۲

پاکستان مسلم لیگ کا قیام

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی سحر مسلمانوں کے دیرینہ خواب آزادی کی تعبیر کے ساتھ طلوع ہوئی۔ مغربی پنجاب میں پاکستان کی نئی عمارت اپنی بنیادوں سے اُبھر رہی تھی لیکن بھارت کا حصہ بننے والے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ ان کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی اور قدیم بستیاں راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

دونوں طرف اَن گنت تارکینِ وطن کے قافلے آ جا رہے تھے۔ ان کے ہجوم کے باعث سڑکوں پر عام آمد و رفت میں قدم قدم پر رکاوٹ پیش آتی تھی۔ ریل گاڑیوں میں بھی غیر معمولی ازدحام تھا۔ دُشمن گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے اور انسانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ مرنے والوں کی صحیح تعداد کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن تارکینِ وطن کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ تک بیان کی جاتی تھی[1]۔ تارکینِ وطن کی وجہ سے انتظامیہ پہلے ہی سے نڈھال تھی۔ اب اُسے امن و امان برقرار رکھنے کے نہایت سنگین مسئلہ سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے لگایا

---

[1]: کیتھ کیلارڈ PAKISTAN A POLITICAL STUDY ایلن اینڈ ان ون لندن (۱۹۵۸) ص ۱۴ -

Marfat.com

جا سکتا ہے کہ مغربی پنجاب کے لوگوں کو جوابی انتقامی کارروائی سے احتراز کرنے اور صبر و تحمل سے کام لینے کی تلقین کرنے کے لیے قائد اعظم نے خود لاہور کا دورہ کیا۔[1]

پاکستان میں مہاجرین کے یک بیک اُمڈ آنے والے سیلاب نے مسلم لیگ کی تنظیمی صلاحیتوں کو بڑی سخت آزمائش سے دوچار کر دیا۔ ظہورِ پاکستان کے بعد یہ مسلم لیگ کے لیے پہلا اور بہت بڑا چیلنج تھا۔ بلا شبہ لیگ کے رضا کاروں نے تاریخی خدمات سرانجام دیں۔ یہ ان کی انتھک اور شبانہ روز مساعی ہی کا نتیجہ تھا کہ مہاجرین کی بحالی کا "تقریباً" ناممکن کام سرانجام پا گیا اور بہت بڑے بحران پر قابو پا لیا گیا۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے کیمپ قائم کیے جہاں بھارت سے لاکھوں کی تعداد میں آنے والے لٹے پٹے مہاجرین کے لیے خوراک، لباس اور طبی امداد کا انتظام کیا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں ان کیمپوں کی تعداد ۷۵ تک پہنچ گئی تھی۔[2] فاقوں میں مبتلا مہاجرین کے لیے خوراک کا انتظام بھی خاصا محنت طلب تھا۔ ایک اندازے کے مطابق حکومتِ پنجاب صرف لاہور کے کیمپوں میں اکتوبر ۱۹۴۷ء میں روزانہ ۳۰ ہزار روپے خرچ کر رہی تھی۔[3]

اِس مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ممدوٹ کابینہ میں میاں افتخار الدین کو بطور وزیرِ مہاجرین شامل کیا گیا۔ ویسے اس زمانے میں ملک بھر میں انتظامیہ کا شیرازہ منتشر سا تھا۔ مسلم لیگ کے پاس بھی ملک کی گوناگوں ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی مؤثر تنظیم نہیں تھی۔ مسلم لیگ بنیادی طور پر

---

۱ : پاکستان ٹائمز ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء

۲ : پاکستان ٹائمز ۱۴ اگست ۱۹۴۹ء (آزادی کی سالگرہ کا ایڈیشن ملاحظہ فرمائیں)۔

۳ : سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء

Marfat.com

ایک سیاسی تحریک تھی اور ظاہر ہے کہ اس کے پاس تقسیم کے فوراً بعد پیدا ہونے والی اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نہ کوئی انتظامی ادارہ تھا اور نہ ہی وسائل۔

جب حالات کچھ بہتر ہو گئے تو مسلم لیگ کو ایک جاندار اور فعال تنظیم کے طور پر برقرار رکھنے کا احساس بڑی شدّت کے ساتھ اُبھرا۔

۲۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پنجاب مسلم لیگ کی مجلسِ عمل کا ایک اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں ایک قرارداد کے ذریعے مسلم لیگ کے احیاء کا مطالبہ کیا گیا۔[۱]

۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے رائٹر کے نمائندے کو ایک انٹرویو میں بتایا :

"مسلم لیگ نے اپنا مقصد —— آزاد مملکت پاکستان کا قیام —— حاصل کر لیا ہے۔ مسلم لیگ کے باقی اغراض و مقاصد عمومی نوعیت کے تھے۔ یعنی ہندی مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی اور دُوسرے حقوق و مفادات کا تحفّظ و فروغ اور ہندی مسلمانوں کے دُوسرے مُلکوں کے مُسلمانوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات کے قیام و فروغ میں قیام پاکستان کے بعد بہت جلد مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کا اجلاس بلانے کا خواہاں تھا کیونکہ صورتِ حال میں جو بُنیادی تبدیلیاں ہو چکی ہیں ان کی روشنی میں مسلم لیگ کی تنظیم کی از سرِ نو تشکیل ضروری ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے لیے بڑی سنگین صُورتِ حال پیدا کر دی گئی اور ہم

---

[۱] : پاکستان ٹائمز ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

Marfat.com

اس سے نبٹنے میں اس حد تک مصروف ہو گئے کہ ہمیں اس مسئلے اور کئی دوسرے درپیش مسائل پر توجہ دینے کا موقع ہی نہیں ملا ۔ یہ مسائل بدستور ہماری فوری اور بھرپور توجہ کے متقاضی ہیں۔" [1]

مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کے مرحلے کو اُس وقت مزید مُلتوی کرنا پڑا جب ریاست جمّوں وکشمیر کے ڈوگرہ حکمران نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بھارت سے الحاق کر کے پاکستان کے لیے سیاسی صورتِ حال کو مزید پیچیدہ اور سنگین بنا دیا۔ لیکن بعض حلقے عین اس مرحلے میں بھی مسلم لیگ کی تنظیم پر یہ اعتراض و تنقید کر رہے تھے کہ :

"وُہ عوامی ذہن میں اُلجھاؤ ختم کرنے ، بڑھتی ہُوئی مایُوسی اور بے چینی کا مقابلہ کرنے ، حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ پیدا کرنے اور ایک مقبُولِ عام پارٹی کے طور پر کام کرنے میں ناکام رہی ہے۔" [2]

یہ اعتراض اور تنقید بے جواز تھی۔ کیونکہ مسلم لیگ کئی دُوسرے اور زیادہ اہم مسائل کو حل کرنے میں بے حد مصروف تھی۔

جب صُورتِ حالات کی شدّت میں کچھ کمی ہوئی ، تو مُسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی ضرورت کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لیا گیا۔ اور یہ بات بحث و نزاع کا موضوع بن گئی کہ جب مسلم لیگ اپنے بنیادی مقصد ـــــ آزاد مملکت کا قیام ـــــ کے حصُول میں کامیاب ہو گئی ہے، تو

---

[1] : پاکستان ٹائمز ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء ۔

[2] : پاکستان ٹائمز ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء ۔

Marfat.com

اب اس کا وجود ختم کر دینا چاہیئے۔[1]

اس استدلال کی حمایت و تائید وہ عناصر کرتے تھے۔ جنھوں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی یا اب اپنی نئی سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی پارٹیاں اپنے مقاصد کے حصول کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتیں۔ بلکہ اس راستے میں ہر کامیابی مزید کامیابیوں کے لیے ولولۂ تازہ عطا کرتی ہے۔

صِرف آزاد مملکت کا حصُول ہی حتمی اور آخری مقصد نہیں تھا۔ بلکہ پاکستان کا حصول اس خطۂ ارض میں اسلامی معاشرے کے قیام، مساوات اور سماجی بہبُود کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا ذریعہ تھا۔ پاکستان کی بُنیادیں ایک واضح اور ٹھوس نظریاتی اساس پر رکھی گئی تھیں اور مسلم لیگ نے اپنے منشور میں اس کی نشاندہی بھی کی تھی۔ مسلم لیگ پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی تھی کہ اس نے مطالبہ پاکستان کی تحریک کے زمانے میں عوام کی حمایت و تائید حاصل کرنے کے لیے جو وعدے کیے تھے، اب وہ انھیں عملی جامہ پہنائے۔ اس لیے مسلم لیگ کی راہنمائی اور قیادت کی ضرورت پہلے کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ تھی۔

ویسے اگر مسلم لیگ کو ختم کر دیا جاتا تو اس وقت مُلک میں دوسری کوئی بھی مؤثر سیاسی جماعت موجود نہ تھی جو مسلم لیگ کے ختم ہو جانے پر سیاسی خلا کو پُر کرتی اور سیلاب بلا میں ملک کی کشتی کی ناخدا

---

[1]: جی ایم سیّد ——— مُسلم لیگ کی مخالفت کیوں؟ (حیدر آباد ۱۹۵۹ء) صفحہ ۶۷۔ علاوہ ازیں ملاحظہ فرمائیں۔ پاکستان ٹائمز لاہور ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۷ء۔

Marfat.com

بنتی یا اصلاحِ احوال کے لیے حکومت اور عوام کے درمیان ازتباط و اتحاد کا فریضہ سرانجام دیتی۔

"اس دور میں اگر پاکستان میں کچھ اور پارٹیاں موجود بھی تھیں تو وُہ شکست خوردہ، خوفزدہ، تنظیم سے عاری، اور پریشان حال تھیں۔"[۱]

قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی چند ماہ کے دوران میں زندہ رہنے اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کی جدوجہد بڑی سخت اور جانگسل تھی۔ یہ جماعتی سیاسیات کا زمانہ نہیں تھا۔ اور پھر مسلم لیگ کے سوا کسی بھی دوسری جماعت کے لیے عوام دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ عوام میں مسلم لیگ کی کشش سحر آگیں تھی اور جو مسائل ملک کی بنیادوں کو خطرناک حد تک متزلزل کر رہے تھے، انھیں حل کرنے کے لیے عوام صرف مسلم لیگ کی آواز پر ہی لبیک کہہ سکتے تھے۔ ملک کی سیاسی صورتِ حال کا اوّلین تقاضا "اتحاد، یقینِ محکم اور تنظیم" تھا۔ کیونکہ ملک کو صرف اندرُونی مسائل ہی درپیش نہیں تھے۔ بلکہ اسے بیرونی جارحیت کا بھی مقابلہ کرنا تھا۔ بھارت نے کشمیر اور جوناگڑھ پر بزورِ طاقت قبضہ جما لیا تھا اور پاکستان میں اس کے ایجنٹ ملک کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے درپے تھے۔ بھارت کے لیڈروں نے مسلمانوں کے عزم و استقامت کی وجہ سے برّصغیر کی تقسیم کو منظور تو کر لیا تھا۔ لیکن انھوں نے کبھی پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ بھارت کے ایجنٹوں نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کی بھی سازش کی اور اس مقصد کے لیے انھوں

---

[۱] : لیونارڈ بائنڈر۔ Religion And Politics in Pakistan یونیورسٹی آف کیلیفورنیا (۱۹۶۱ء) ص ۱۲۰۔

Marfat.com

نے آدمی، روپیہ اور اسلحہ بھی جمع کر لیا تھا۔ حکومتِ سندھ نے اِس سازش میں ملوث تقریباً ۲۰ (بیس) افراد کو گرفتار کر لیا[1]۔ اسی دن کراچی میں بم پھٹنے کی واردات سے ہلچل مچ گئی[2]۔ سرحد میں بھی بھارتی ایجنٹ سرگرمِ عمل تھے اور خان عبدالقیوم خان اور ان کی کابینہ ایک بڑی مشکل صورتِ حال سے دوچار تھی۔

مسلم لیگ کے لیے فوری طور پر اہم ترین مسئلہ ایک نیا سیاسی پروگرام پیش کرنے کے بجائے پاکستان کو ایک زندہ اور فعال مملکت بنانا تھا۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد مسلم لیگ سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وُہ اقتصادی ترقی و استحکام اور پاکستان میں جمہوری معاشرے کے قیام پر توجہ کر سکے گی۔ چونکہ کوئی بھی دوسری تنظیم اس کام کی اہل نہیں تھی اس لیے مسلم لیگ کی ضرورت پہلے سے اور بھی زیادہ تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر قائداعظم نے بھی، جو ہمیشہ جمہوری اصُولوں اور مقاصد کے علمبردار رہے، عوام کو یہی تلقین کی کہ وُہ ایک ہی سیاسی پارٹی سے وابستہ اور اس کے پرچم تلے متحد رہیں[3]۔ قائداعظم کا یہ خیال صرف وقتی حالات کے پیشِ نظر تھا۔ ورنہ عقائد کے اعتبار سے وُہ یک جماعتی نظام کے سخت مخالف تھے۔

۱۹۳۷ء تک مسلم لیگ رؤسا کی جماعت سمجھی جاتی تھی اور اس کی رکنیت بھی بڑی محدود تھی۔ لیکن اس کے بعد عام لوگ بھی اس میں کشش محسوس کرنے لگے تھے۔ اس کی بڑی وجہ قائداعظم کی بے مثل شخصیت اور

---

۱ : پاکستان ٹائمز ۲۳ نومبر ۱۹۴۷ء۔

۲ : ایضاً

۳ : پاکستان ٹائمز ۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء۔

Marfat.com

ان کی شبانہ روز جدوجہد تھی۔ ۱۹۴۰ء میں جب مسلم لیگ نے قرارداد لاہور منظور کی اور حصولِ پاکستان کو اپنا نصب العین بنایا، تو مسلم لیگ کے پیغام اور دعوت کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور برصغیر کے طول وعرض میں غریب مسلمانوں کے جھونپڑوں تک بھی قائداعظم کی آواز پہنچنے لگی۔ لیکن اب اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ پاکستان کا خواب حقیقت کا روپ دھار چکا تھا اور یہ بات واضح تھی کہ پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں مسلم سیاسیات کو نیا رُخ اختیار کرنا پڑے گا۔ اس لیے مسلم لیگ کو خود بھی نئے تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب یہ اعلان کیا گیا کہ لیگ کے آئندہ پروگرام کا جائزہ لینے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دسمبر ۱۹۴۷ء میں کراچی میں منعقد ہوگا تو اس اعلان کا عام طور پر خیر مقدم کیا گیا۔[1]

۱۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس آخری دفعہ پاکستان کی سرزمین پر منعقد ہوا۔ صبح کے وقت اجلاس گورنر جنرل کی اور شام کے وقت وزیراعظم کی رہائش گاہ پر ہوا۔ قائداعظم خرابی صحت کے سبب صرف صبح والے اجلاس میں شریک ہو سکے۔ ورکنگ کمیٹی نے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اس ضمن میں ریزولیشن کونسل کے سامنے پیش کیا جائے۔[2]

۱؎ : پاکستان ٹائمز ۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء

۲؎ : What Price Freedom محمد رضا خاں۔ ممبر مدراس لیجسلیٹو اور ممبر مسلم لیگ کونسل۔ نوری پریس مدراس (۱۹۶۹ء) ص ۳۶۰

Marfat.com

آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس ۱۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال کراچی میں ہُوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ اپنی نوعیت کا پہلا اجلاس تھا۔ کونسل نے ایک قرارداد مرتب کی جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کو دو علیحدہ اور جُداگانہ تنظیموں میں تقسیم کر دینے کی سفارش کی۔ ایک تنظیم پاکستان کے لیے اور دوسری بھارت کے لیے[1] اس اجلاس کی صدارت قائدِاعظم کر رہے تھے۔

یہ اجلاس اس لحاظ سے اہم تھا کہ اس میں قائدِاعظم نے بطور صدر مسلم لیگ آخری مرتبہ شرکت کی۔ گزشتہ چند سالوں کی بے پناہ محنت اور جدوجہد نے ان کی صحت کو بُری طرح متاثر کیا تھا۔ خاص طور پر تقسیم برِّصغیر کے بعد فرقہ وارانہ فسادات، متروکہ جائیداد، مہاجرین کی آبادکاری اور مسئلہ کشمیر جیسے اہم معاملات نے ان کی صحت کا شیرازہ بکھیر دیا تھا اور ڈاکٹر نے بھی انھیں کونسل کے اجلاس میں شرکت سے منع کیا تھا لیکن اس کے باوجود وُہ کونسل کے اجلاس میں شریک ہوئے اور گھنٹہ بھر تقریر بھی کی۔ ان کی تقریر کا اُردو متن سردار عبدالرب نشتر نے پیش کیا۔ اجلاس کا ماحول بڑا پژمردہ تھا۔ فضا پر اداسی چھائی ہُوئی تھی اور کونسلروں کے چہروں پر غم کی پرچھائیاں عیاں تھیں۔ مسلمانانِ ہند و پاک کے وُہ راہنما جنھوں نے متحد ہو کر نصف صدی تک انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف جنگ لڑی تھی اور دُکھ سُکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا آج حالات کے اس موڑ پر آن کھڑے ہُوئے تھے جہاں سے ان کی راہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہوجاتی تھیں۔ ان کو اس امر کا بھی احساس تھا کہ مستقبل ان کے درمیان حائل ہونے والی

---

[1]: ڈان کراچی ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء۔

Marfat.com

دیواروں کو اور بھی بلند کر دے گا حتّٰی کہ وہ ایک دُوسرے کے شناسا بھی نہ رہیں گے۔ حالانکہ قائداعظم کی شخصیّت قانون اور دستور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور جذبات کا مدوجزر ان کو متاثر نہیں کرتا تھا لیکن اس اجلاس کی افسردہ فضا نے ان کے دل پر بھی اثر کیا۔ چنانچہ جب ان کی تقریر میں ہندو مسلم فسادات اور قتل و غارت کا ذکر آیا تو ان کا چہرہ سوگوار ہو گیا۔ شدّتِ غم سے ان کا دل پگھل گیا اور پھر مسلم لیگ کے کونسلروں نے دیکھا کہ وہ قائداعظم جو سنجیدگی، صبر اور متانت کا نمونہ تھے۔ آج ان کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی برسات جاری تھی شائد خود انہیں بھی اندازہ نہ تھا کہ آزادی کی صبح اس قدر خون آلُودہ ہوگی ؎[1]

اس اجلاس میں ایک کونسلر جمال میاں فرنگی محلی نے تقریر کرتے ہُوئے بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ جذبات کی رو میں بہہ کر قائداعظم سے یہ کہا کہ :

"ہم ہندوستان میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں۔ آپ وہاں آئیں اور ہماری قیادت فرمائیں۔"

قائداعظم نے کہا کہ :

"مسلم لیگ کونسل نے مجھے پاکستان کا گورنر جنرل بنایا ہے، تاکہ مَیں مُلک کو بحران سے نکال سکوں۔ لیکن اگر اب کونسل یہ فیصلہ کرے تو مَیں گورنر جنرل کے عہدے سے مُستعفی ہو کر نتائج کی پروا کیے بغیر ہندوستان جانے کو تیار ہُوں۔ لیکن میں آپ سے پُوچھتا ہُوں کہ آپ کب تک میری قیادت پر بھروسہ کیے بیٹھے رہیں گے۔ اگر میں مر

---

[1] : بحوالہ محمد رضا خان ۔ صفحہ ۳۶۰ - ۳۶۱ -

جاؤں تو آپ کیا کریں گے"۔ [1]

اس اجلاس میں شرکت کے لیے برِصغیر کے طول و عرض سے کُل ۴۷۵ میں سے ۲۵۰ کونسلر کراچی پہنچے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کی قرارداد بڑی بھاری اکثریت سے منظور ہو گئی۔ اس قرارداد کے خلاف صرف ۵ ووٹ ڈالے گئے۔

اجلاس میں یہ قرارداد پیش کی گئی تھی :-

"آل انڈیا مسلم لیگ کا بنیادی مقصد پورا ہو گیا ہے۔ اور ہند دو آزاد و خود مختار ملکوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس لیے آل انڈیا مسلم لیگ کے ڈھانچہ، اغراض و مقاصد اور پالیسیوں میں بعض تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ یہ بات محتاجِ وضاحت نہیں کہ اب پاکستان اور بھارت کے مسلمان ایک ہی مشترکہ سیاسی تنظیم سے وابستہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے کونسل کا یہ فیصلہ ہے کہ :

۱ : آل انڈیا مسلم لیگ کے بجائے پاکستان اور بھارت کے لیے مسلم لیگ کی علیحدہ علیحدہ تنظیمیں ہونی چاہئیں۔ جن کے حسب ذیل کنوینر ہوں گے :-

ا۔ پاکستان مسلم لیگ کے لیے لیاقت علی خان۔

ب۔ بھارت میں مسلم لیگ کے لیے محمد اسماعیل [2]

---

[1] : بحوالہ محمد رضا خان۔ صفحہ ۳۶۲۔

[2] : محمد اسماعیل ایک پرانے اور ممتاز مسلم لیگی تھے اور مدراس مسلم لیگ کے صدر رہے تھے۔

Marfat.com

۲ : آل انڈیا مسلم لیگ کے وُہ تمام کونسلر، جو اب پاکستان پر مشتمل علاقوں میں رہائش پذیر ہیں اور پاکستان دستور ساز اسمبلی کے تمام ارکان جو مسلم لیگ کے ابتدائی ارکان ہیں۔ وہ پاکستان مسلم لیگ کی کونسل کے ارکان متصوّر ہوں گے۔

۳ : پاکستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس کراچی میں ہوگا۔

۴ : آل انڈیا مسلم لیگ کے جو ابتدائی ارکان اِب پاکستان میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ سب کے سب پاکستان مسلم لیگ کے ابتدائی ارکان متصوّر ہوں گے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے جو ارکان بھارت میں رہائش پذیر ہیں یا وہاں آباد ہو چکے ہیں، وہ انڈین یونین مسلم لیگ کے ارکان متصوّر ہوں گے۔

۵ : جب دونوں کونسلوں کے اپنے اپنے اجلاس منعقد ہوں گے تو ہر کونسل اپنے نمائندے چُنے گی۔ جن کی تعداد تین سے زیادہ نہیں ہوگی۔ یہ نمائندے ایک مشترکہ ایڈ ہاک کمیٹی کے ارکان ہوں گے۔ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے اثاثوں اور واجبات کو پاکستان مسلم لیگ اور انڈین یونین مسلم لیگ میں منصفانہ طور پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کرے گی۔ اس کمیٹی میں اختلافِ رائے کی صورت میں متنازعہ فیہ اموُر پر قائد اعظم فیصلہ صادر کریں گے۔

۶ : آل انڈیا مسلم لیگ کا موجُودہ مرکزی پارلیمانی بورڈ پاکستان میں مسلم لیگ کے آئین و قواعد کے مطابق اس وقت تک کام کرتا رہے گا جب تک پاکستان مسلم لیگ

Marfat.com

کی کونسل کا اجلاس منعقد نہیں ہوتا۔" [1]

مسلم لیگ کونسل نے ایک اور قرارداد میں اسلامیانِ پاکستان پر زور دیا کہ وُہ معاشرتی انصاف اور اسلامی اصولوں کی بنیاد پر پاکستان کو ایک جمہوری مملکت بنانے کے لیے پُوری کوشش کریں۔ اِس قرارداد کا متن حسبِ ذیل ہے:

"یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کو بڑی خوشی اور اطمینان ہے کہ اس نے اپنا بنیادی مقصد یعنی —— پاکستان کا قیام —— حاصل کر لیا ہے اور اسلامیانِ برِّصغیر کو ان قربانیوں پر خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔ جو انھوں نے اپنے قومی نصب العین کے حصُول کی خاطر کی ہیں۔ کونسل اس یقین و اعتماد سے سرشار ہے کہ مسلم لیگ نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی عظیم الشان قیادت میں ایک مکمّل آزاد و خودمختار ملک کے قیام کے لیے جو منفرد جدوجہد کی ہے اور اسے دنیا کی پانچویں بڑی اور سب سے بڑی اسلامی مملکت کے قیام میں آخرکار جو فتح و کامرانی حاصل ہوئی ہے، اسے تاریخ عصرِ حاضر میں ایک نہایت شاندار کارنامے کی لازوال حیثیت دی جائے گی۔ کونسل اسلامیانِ پاکستان اور مملکت کے تمام دُوسرے وفادار شہریوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وُہ اس نوزائیدہ مملکت کی تعمیر و ترقی میں حتی الوسع زیادہ سے زیادہ حصّہ لیں تاکہ کم از کم عرصہ میں اس

---

[1]: پاکستان ٹائمز۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۷ء۔

Marfat.com

مملکت کو معاشرتی انصاف پر مبنی ایک مثالی جمہوری مملکت کے طور پر دُنیا میں باعزت مقام و مرتبہ حاصل ہو سکے، اور یہ مملکت اسلامی تعلیمات کے مطابق انسانی آزادی اور عالمی امن کی علمبردار بن سکے اور پاکستان ایک ایسا مُلک بن سکے جو عسکری اعتبار سے مضبوط، اخلاقی اور مادی دولت سے مالا مال ہو، اور جس میں تمام شہری مساوی حقوق سے بہرہ مند ہوں اور خوف، احتیاج اور جہالت سے مکمل طور پر آزاد ہوں۔"[۱]

آل انڈیا مسلم لیگ کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کے بعد کونسل کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ ماحول بہت افسردہ اور غمگین تھا کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بعض ایسے ارکان اپنے پاکستانی بھائیوں کو الوداع کہہ رہے تھے، جنھوں نے مُسلمانوں کے نصبُ العین کے لیے بڑی قربانیاں کی تھیں۔ اگرچہ ان کا خواب پُورا ہو گیا تھا لیکن ان کی سعی و جہد ختم نہیں ہوئی تھی کیونکہ انھیں ابھی بھارت میں مُسلمانوں کے تحفّظ کے لیے اپنی جدو جہد جاری رکھنی تھی۔ دُوسری طرف مسلم لیگ کے جو ارکان اب پاکستان میں رہائش پذیر تھے وہ اپنی نئی ذمّہ داریوں سے عُہدہ برآ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

مسلم لیگ کی کونسل نے اپنی قرارداد میں اسلامیانِ پاکستان سے مطالبہ کیا تھا کہ وُہ اسلامی اصولوں پر مبنی ایک مثالی جمہوری مملکت قائم کریں اور دنیا کے سامنے نئی اور روشن مثالیں قائم رکھیں۔ اس سے

---

[۱]: سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۷ء۔

Marfat.com

ظاہر ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے مطالبے کی بُنیاد اسلام پر تھی اور یہ کہ ظہورِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ پر جو نئی ذمہ داری عائد ہوتی تھی وُہ اس سے بے خبر نہیں تھی۔ لیکن ابھی یہ جائزہ لینا باقی ہے کہ اس قرارداد میں جن مقاصد عالیہ کی نشان دہی کی گئی تھی مسلم لیگ ان کے حصول میں کس حد تک کامیاب ہُوئی؟ بہرحال اس قرارداد نے اس اصُول کی بھی توثیق کر دی کہ پاکستان کا نظریہ اسلامی اور فلاحی مملکت کے تصوّر پہ مبنی تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کے فیصلہ کو مسلم لیگی کارکنوں کے تمام حلقوں نے سراہا۔ سوا ان کے، جن کے بھارت سے مفادات وابستہ تھے۔ عام احساس یہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو تقسیم کر کے پاکستان مسلم لیگ قائم کرنے سے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہو گئی ہے۔ برّ صغیر کی تقسیم کے بعد کوئی ایسی سیاسی جماعت ممکن نہیں رہی تھی جس کی شاخیں دونوں ملکوں میں ہوں۔ انڈین یونین مسلم لیگ کی کونسل کے کنوینر محمد اسماعیل نے بھی اس فیصلے کو سراہا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے جس کی عقلِ سلیم اس سے توقع کرتی تھی۔[1]

مسلم لیگ کو دو حصّوں میں بانٹنے کی تحریک کے ضمن میں تین مکاتیب فکر تھے :-

ایک گروہ کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کو ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ نئی سیاسی غیر فرقہ دارانہ

---

[1] : سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۷ء۔

Marfat.com

تنظیمیں قائم کی جائیں ۔ اس مکتبۂ فکر کے راہنما یو۔ پی کے زیڈ۔ ایچ لاری تھے اور انھیں مغربی پنجاب کے ترقی پسند کونسلروں کی بھی حمایت حاصل تھی ۔

دُوسرا گروہ جسے اکثریت کی حمایت حاصل تھی، اس نقطۂ نظر کا حامی تھا کہ مسلم لیگ کو دونوں ممالک میں قائم رہنا چاہیئے ۔ اس خیال کی حمایت میں مولانا محمد اکرم پیش پیش تھے ۔

تیسرا مکتبۂ فکر ان کونسلروں پر مشتمل تھا جو پاکستان میں مسلم لیگ کے قیام کی حمایت کرتے تھے لیکن ہندوستان میں کسی غیر فرقہ وارانہ سیاسی تنظیم کو فروغ دینے کے حق میں تھے ۔[1]

کچھ کونسلروں کا یہ خیال بھی تھا کہ مسلم لیگ ہی پاکستان اور بھارت میں مضبوط ترین رشتہ بن سکتی ہے اور اگر اسے دو آزاد اور علیحدہ تنظیموں میں تقسیم کر دیا گیا تو یہ رشتہ منقطع ہو جائے گا ۔ اور یہ بات بالآخر بھارت اور پاکستان کے مابین دوستانہ تعلقات کو فروغ دینے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوگی ۔

دُوسری طرف جو لوگ لیگ کونسل کے اس اقدام کے حامی تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ جب امریکہ اور برطانیہ میں بہترین دوستانہ تعلقات برقرار رہ سکتے ہیں اور دونوں نے دو عالمی جنگوں میں بھی ایک دُوسرے کا پُورا ساتھ دیا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان اور بھارت اس طرح دوستانہ تعلقات استوار نہ کر سکیں ۔[2]

لیگ کونسل کے اس فیصلے پر نکتہ چینی کسی ٹھوس دلیل پر مبنی نہ تھی

---

[1] : پاکستان ٹائمز ۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۷ء ۔

[2] : پاکستان ٹائمز ۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۴۷ء ۔

Marfat.com

کیونکہ اگر دونوں ملکوں میں ایک ہی پارٹی کام کرتی، تو ہر ملک میں اس کی وفاداری پر شک و شبہ کا احتمال تھا۔

یہ بات بھی یقینی تھی کہ بھارتی حکومت کسی صورت میں بھی کسی ایسی سیاسی پارٹی کا وجود برداشت نہ کرتی، جس کی مادر تنظیم پاکستان میں ہو۔ سیاسی پارٹیاں اپنے ملک کے حالات اور تقاضوں کے مطابق اپنے پروگرام مرتب کرتی ہیں اور مسلم لیگ کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہ ہوتا کہ وہ دونوں ملکوں کے لیے یکساں پروگرام اختیار کرتی اور آخری بات یہ کہ اگر مسلم لیگ ایک ہی پارٹی رہتی تو اسے ایک ہی متحدہ قیادت کے تحت کام کرنا پڑتا جو ہرگز ممکن نہ تھا۔

یہ دلیل کہ مسلم لیگ کے دو حصّوں میں منقسم ہو جانے سے دونوں ملکوں میں دوستی کا رشتہ ٹوٹ جائے گا، درست اور معقول نہ تھی، کیونکہ مختلف پالیسیوں پر عمل پیرا ہونے کے باوجود دوستانہ تعلقات برقرار رکھے جا سکتے ہیں۔

کچھ سرکردہ مسلم لیگیوں نے اس موقع پر یہ خدشہ ظاہر کیا کہ پاکستان میں مسلم لیگ کو صرف مسلمانوں تک محدود رکھنے سے فسطائیت، اور تنگ نظرانہ فرقہ پرستی تک نوبت پہنچ جائے گی۔ ان میں حسین شہید سہروردی بھی شامل تھے، جنھوں نے قیام پاکستان سے قبل متحدہ بنگال کی تجویز پیش کی تھی[1] اور قیام پاکستان کے بعد بھارت میں رہنے کو

---

[1]: وی۔ پی مینن

The Transfer of Power in India

پرنسٹن یونیورسٹی پریس۔ صفحہ ۳۵۵۔

Marfat.com

ترجیح دی تھی تاکہ وہاں مسلم اقلیّت کے حقوق و مفادات کی حفاظت کریں۔ سہروردی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر پاکستان مسلم لیگ صرف اور محض مسلمانوں کی تنظیم رہے اور یہی جماعت پاکستان کے لیے پالیسی بھی مرتب کرے۔ تو پھر فسطائیت اور فرقہ پرستی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر پاکستان میں مسلم لیگ نے صرف مسلمانوں کی ہی معاشرتی و تعلیمی ترقی کو اپنا مطمح نظر بنا لیا اور یہ جماعت ایک ایسی سلطنت بن گئی جس میں مذہب کو رکنیت کے معاملہ میں "کھل جا سم سم" کی حیثیت حاصل ہوئی تو غیر مسلم فرقوں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا احتمال رہے گا اور مملکت کی غیر جانب داری پر ان کا اعتماد مضبوط نہ ہوگا۔

مسلم لیگ کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کا اقدام اس وقت تک بے معنی اور بے جواز ثابت ہوگا۔ جب تک ان دونوں تنظیموں کے آئین میں ایسی تبدیلیاں نہیں کی جاتیں، جن سے صاف صاف ظاہر ہو کہ مسائل زندگی کے بارے میں نئے نقطۂ ہائے نظر اختیار کیے جا رہے ہیں۔[1]

اس گروپ نے تو یہ تک بھی تجویز پیش کی کہ غیر مسلموں کو جماعت میں شامل ہونے کی اجازت دے کر پاکستان مسلم لیگ کا نام "پاکستان لیگ" میں تبدیل کر دیا جائے۔[2]

---

[1] : سہروردی کے بیان پر اداراتی تبصرہ۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۷ء

[2] : سیّد نور احمد "مارشل لاء سے مارشل لاء تک" (لاہور ۱۹۶۷ء) صفحہ ۳۵۴۔

Marfat.com

سہروردی کا یہ نظریہ انتہا پسندانہ فکر کا آئینہ دار تھا اور اس زمانے میں اسے قبول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی یہ دلیل دو نکات پر مبنی تھی :

اوّلاً : مسلم لیگ نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ اس لیے نئے حالات کے مطابق اس کے آئین میں ترمیم ہونی چاہیئے ورنہ اس بات کا خدشہ ہے کہ حکومت کی پالیسیاں صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود تک محدود و مرکوز رہیں گی اور اقلیتی فرقے نظر انداز ہو کر رہ جائیں گے۔

ثانیاً : بھارت میں انڈین یونین مسلم لیگ کو اپنی رکنیّت کے دروازے بھارت کے تمام شہریوں پر کھول دینے چاہئیں تاکہ اس کی رکنیّت صرف مسلمانوں تک محدود نہ رہے اور اسے دُوسرے فرقوں کے لوگوں کی بھی حمایت و تائید حاصل ہو سکے۔

مسلم لیگ میں اس مسئلہ پر شدید اختلافِ رائے تھا۔ جو حلقے اس تحریک کے حامی تھے ان کی دلیل یہ تھی کہ پاکستان مسلم لیگ کو لامحالہ سیاست اور ملک کی انتظامیہ میں غلبہ حاصل رہے گا۔ اس لیے اسے پاکستان میں آباد تمام فرقوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے بصورت دیگر یہ خطرہ لاحق ہو جائے گا اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اقلیتی فرقے رہنمائی کے لیے بھارت کی طرف دیکھتے رہیں گے۔ یہ حلقے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مثال بھی پیش کرتے تھے۔ جس نے اپنی رکنیت کے سلسلے میں مذہب، نسل اور عقیدے کی بنیاد پر کوئی پابندی عائد

Marfat.com

نہیں کی تھی - یہ حلقے اس بات پر مصر تھے کہ مسلم لیگ کو بھی اب اپنا محدود کردار ترک کر دینا چاہیئے اور پاکستان کی اقلیتوں کے لیے اپنے دروازے کھول کر وسیع تر بنیادوں پر کام کرنا چاہیئے - لیکن جو حلقے اس اندازِ فکر کے خلاف تھے، وہ اکثریت میں تھے۔ ان کی رائے میں مسلم لیگ کا صرف مسلمانوں تک محدود و مخصوص رہنا اس تنظیم کا ایک بنیادی اصول تھا جس کی کسی طرح بھی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیئے [۱]۔

یہ حلقے اس استدلال کی صحت و صداقت پر شک و شبہ کرتے تھے کہ اگر اقلیتوں کو مسلم لیگ میں شامل نہ ہونے دیا گیا تو رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ان کی نظریں بھارت کی طرف اُٹھتی رہیں گی - ان کا خیال بلکہ یقین یہ تھا کہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کے باوجود ان کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور اس بات کا امکان ہے کہ ان کے مسلم لیگ میں شامل ہونے سے آگے چل کر مشکلات پیدا ہو جائیں - اور یہ بات پاکستان کے لیے مشکلات اور مسائل پیدا کرنے کا باعث بنی - اس حلقے کی طرف سے

---

[۱]: اس ضمن میں قائداعظم نے بھی بی بی سی کے نمائندہ رابرٹ سٹمسن کو ایک انٹرویو دیا جس میں انھوں نے کہا کہ ابھی وُہ وقت نہیں آیا کہ مسلم لیگ کے دروازے غیر مُسلموں پر کھول دیے جائیں کیونکہ ابھی اس کے لیے مُسلمانوں کی رائے عامہ تیار نہیں - ہمیں ایسے نعروں سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ غیر مُسلموں پر پابندی کوئی حتمی اور آخری فیصلہ نہیں - ضرورت پڑنے پر اس اصُول کو بدلا جا سکتا ہے -

(پاکستان ٹائمز - ۲ ردسمبر ۱۹۴۷ء)

Marfat.com

دُوسری دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جس کے قیام کی راہ صرف مسلمانوں کی جدوجہد سے ہموار ہوئی اور ہند کی آبادی کے دُوسرے طبقے ہمیشہ اور ہر دور میں مُسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی مخالفت کرتے رہے۔ اس جدوجہد کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے کا حق صرف مسلمانوں کو حاصل ہے، اس لیے مسلم لیگ کو خالصتاً صرف مسلمانوں کی تنظیم رہنا چاہیئے۔ چنانچہ آئین میں کوئی ترمیم نہ کی گئی اور مسلم لیگ کی رُکنیت صرف مسلمانوں تک محدود رکھی گئی۔

مسلم لیگ کو صرف مسلمانوں تک محدود رکھنے کے حق میں اس دوسری دلیل کو بجا طور پر ہدفِ تنقید بنایا جا سکتا ہے کہ پاکستان چونکہ صرف مسلمانوں کی جدوجہد کا ثمر ہے۔ اس لیے وُہی مراعات یافتہ طبقہ ہیں اور صرف انہی کو سیاسیات میں حصّہ لینے کا حق ہے۔ جمہوری ملکوں میں ہر شہری کو آئین کے تحت سیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اقلیتوں کی سرگرمیوں پر اس وقت تک مذہبی بنیادوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ جب تک وہ مملکت کے مفاد کو ملحوظ رکھیں۔

پاکستان مسلم لیگ کا ڈھانچہ :

پاکستان مسلم لیگ کا ڈھانچہ تقریباً وُہی تھا، جو آل انڈیا مسلم لیگ کا تھا اور وہ مختصراً حسب ذیل تھا۔
آل انڈیا مسلم لیگ ایک صدر، کونسل اور ورکنگ کمیٹی پر مشتمل تھی۔

Marfat.com

اس کے ذیلی اداروں میں ایک مجلسِ عمل اور پارلیمانی بورڈ بھی تھے اور مقامی تنظیمی ادارے مثلاً ضلع لیگ وغیرہ۔ لیکن اس کے سب سے زیادہ با اختیار ادارے ورکنگ کمیٹی اور کونسل تھے۔ کونسل اور ورکنگ کمیٹی کی حیثیت مسلم لیگ کی پارلیمنٹ اور کابینہ کی سی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کے مطابق صدر کا انتخاب ہر سال ہوتا تھا۔ ورکنگ کمیٹی کا تقرر صدر کرتا تھا جس کے ارکان سالانہ اجلاس کے موقع پر کونسل کے ارکان میں سے نامزد کئے جاتے تھے [۱]

ورکنگ کمیٹی مختلف صوبائی لیگوں پر کنٹرول کرنے اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنے اور ان کے لیے لائحہ عمل طے کرنے کی مجاز و مختار تھی، جو صوبائی لیگ اس کی رائے میں اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہے یا اس کے فیصلوں اور ہدایات کی خلاف ورزی کرے، ورکنگ کمیٹی اس کی جگہ نئی صوبائی لیگ قائم کرنے، اسے یکسر توڑ دینے یا اس کا الحاق ختم کر دینے کا اختیار بھی رکھتی تھی۔ [۲]

کونسل اپنے فیصلوں اور ہدایات کی خلاف ورزی کے مرتکب ہر رکن کے خلاف انضباطی کارروائی کرنے کی مجاز و مختار تھی۔ اگر کوئی صوبائی لیگ مرکزی جماعت کی پالیسی اور پروگرام کے خلاف کام کرے تو کونسل اسے توڑ سکتی تھی۔ ورکنگ کمیٹی اور لیگ کونسل کے اختیارات کم و بیش یکساں تھے۔ لیکن ایک فعال و سرگرم ادارے کے طور پر ورکنگ کمیٹی ہی زیادہ تر فیصلے کرتی تھی۔ بہت وسیع ادارے ہونے کے باعث لیگ کونسل کا اجلاس طویل

---

۱ : آل انڈیا مسلم لیگ۔ آئین اور قواعد (دہلی ۱۹۴۴ء)۔

۲ : ایضاً۔

Marfat.com

وقفوں کے بعد ہوتا تھا۔ اس لیے اقدام میں پہل بالعموم ورکنگ کمیٹی کی طرف سے ہوتی تھی[1] اور کونسل سے توقع کی جاتی تھی کہ اس کے فیصلوں کی توثیق کرے۔ مرکزی مسلم لیگ نے صوبائی مسلم لیگوں پر اپنے کنٹرول کو سخت اور موثر بنانے کے لیے ایک "مجلس عمل" بھی قائم کی تھی۔ مجلس عمل کو صدر نامزد کرتا تھا۔ اس سلسلے میں پابندی صرف یہ تھی کہ اس کے ارکان کی تعداد پانچ سے کم اور سات سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔[2]

آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کو بڑے وسیع اختیارات حاصل تھے اور صوبائی پارلیمانی بورڈوں کو محض ذیلی اداروں کی حیثیت حاصل تھی۔ مرکزی بورڈ سے یہ توقع بھی کی جاتی تھی کہ وہ صوبائی پارلیمانی پارٹیوں کی نگرانی کرے۔ مرکزی بورڈ قیام پاکستان کے بعد بھی عمل پیرا رہا۔[3]

صدر اور اس کی ورکنگ کمیٹی سے لے کر صوبوں میں پرائمری لیگوں تک ہیئتِ حاکمہ کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ مرکزی مسلم لیگ اگر صوبائی مسلم لیگوں کی سرگرمیوں کی نگرانی کرتی تھی تو صوبائی لیگوں سے ضلع لیگوں کی نگرانی کی توقع کی جاتی تھی۔ ضلعی لیگیں آئینی طور پر صوبائی لیگوں سے موصول ہونے

---

[1] : ۱۹۴۷ء میں کونسل ۴۷۵ ممبران پر مشتمل تھی۔ جب کہ ورکنگ کمیٹی کے کل ممبر ۲۳ تھے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۳ دسمبر ۱۹۴۷ء)

[2] : آل انڈیا مسلم لیگ۔ آئین اور ضوابط۔

[3]

Marfat.com

والی ہدایات پر عمل درآمد کرنے کی پابند تھیں۔[۲] پرائمری لیگوں کی نگرانی ضلع مسلم لیگ کے دائرہ کار میں آتی تھی۔[۳]

پاکستان مسلم لیگ کے لیے بعض اصلاحات کے ساتھ یہی ڈھانچہ برقرار رکھا گیا۔ پاکستان مسلم لیگ اپنے صدر کے علاوہ کنونشن، کونسل اور ورکنگ کمیٹی اور صوبائی، ضلعی اور پرائمری مسلم لیگوں پر مشتمل تھی۔ ۱۹۴۸ء کے ابتدائی آئین میں تحصیل کی سطح پر مسلم لیگ کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ اس کے لیے بعد میں گنجائش پیدا کی گئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی طرح پاکستان مسلم لیگ کے لیے بھی ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ اور صوبائی پارلیمانی بورڈوں کا اہتمام کیا گیا۔

۱۸ سال سے بڑا ہر پاکستانی پرائمری مسلم لیگ کا رکن بننے کا مجاز اور اہل تھا۔ رکنیّت کے لیے لیگ کے اغراض و مقاصد سے اظہارِ اتفاق ضروری تھا، اور دو آنے چندہ ادا کرنا پڑتا تھا۔[۴]

کنونشن سے مراد وہ اجتماع تھا، جس میں مرکزی اور صوبائی لیگ کونسلوں کے ارکان شامل ہوتے تھے۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد پہلے ۹ برسوں میں ایک مرتبہ بھی کنونشن منعقد نہ ہوئی۔ اواخر ۱۹۵۴ء میں ایک کنونشن کے لیے دعوت نامے جاری کیے گئے تھے لیکن اجلاس کی تاریخ سے ۹ دن پہلے اسے ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے صرف دو دن بعد

---

۱ : ایضاً

۲ : ایضاً

۳ : پاکستان مسلم لیگ کا آئین (۱۹۴۸ء)

Marfat.com

دستور ساز اسمبلی کو معطل کر دیا گیا[1]

آغاز میں پاکستان مسلم لیگ کی کونسل تقریباً چار سو ارکان پر مشتمل تھی جن کا انتخاب زیادہ تر ہر تین سال کے بعد صوبائی کونسلیں کرتی تھیں۔ کونسل میں مرکزی قانون ساز ادارے کے مسلم لیگی ارکان، جماعت کے عہدیدار اور بعض نامزد ارکان بھی شامل ہوتے تھے۔ ۱۹۴۸ء کے آئین میں کونسل کے منتخب ارکان کی تعداد ۴۴۰ مقرر کی گئی۔ ۲۶۰ مغربی پاکستان سے اور ۱۸۰ مشرقی پاکستان سے۔ ۱۹۵۲ء میں آئین میں ترمیم کے ذریعہ کونسل کے ارکان کی تعداد ۴۶۵ کر دی گئی اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے ارکان کی تعداد مساوی کر دی گئی۔ ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان میں ایک یونٹ کے قیام کے بعد کونسل میں ہر صوبے کے ارکان کی تعداد ۱۸۰ کر دی گئی تھی[2]

پاکستان مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس سال میں دو مرتبہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ ایک اجلاس مشرقی پاکستان میں منعقد ہو۔ دستور کی باقی شقوں کے مانند اس شق پر بھی عمل نہ کیا گیا۔ نتیجے کے طور پر ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک کونسل کے صرف سات اجلاس ہوئے جن میں صرف ایک اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ باقی چھ اجلاس مغربی پاکستان میں ہوئے، جس کے سبب جہاں مسلم لیگ کی مقبولیت متاثر ہوئی وہاں قومی یکجہتی کے تصوّر کو بھی نقصان پہنچا۔ کونسل کا اجلاس طلب کرنے کا اختیار صدر

---

۱ : ڈان کراچی۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۵۴ء

۲ : بحوالہ کیتھ کیلارڈ۔ صفحہ ۱۴

Marfat.com

کو حاصل تھا یا ۷۵ ارکان صدر کو تحریری درخواست بھیج کر کونسل کا خاص اجلاس بلا سکتے تھے۔ کونسل کا بنیادی فریضہ جماعت کے عُہدیداروں کا انتخاب تھا۔ علاوہ ازیں وُہ قراردادیں منظور کر کے اپنی سفارشات کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کو بھیج سکتی تھی۔ کونسل کو آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ علاوہ ازیں وُہ کسی صوبائی لیگ کا الحاق کرنے یا الحاق ختم کرنے معطّل کرنے اور توڑ دینے کی بھی مجاز تھی۔[1]

ورکنگ کمیٹی کو صدر نامزد کرتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ پابندی تھی کہ اس کے ارکان کی تعداد ۲۲ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ مسلم لیگ کے عہدیدار یعنی صدر، نائب صدر، جنرل سیکرٹری، خزانچی اور جوائنٹ سیکرٹری بہ حیثیت عہدہ ورکنگ کمیٹی کے رکن ہوتے تھے۔ ان عہدیداروں کا انتخاب لیگ کونسل تین سال کے لیے کرتی تھی۔

کونسل کے مقابلے میں مختصر ہونے کے باعث ورکنگ کمیٹی نسبتاً زیادہ فعّال و سرگرم ادارہ ہوتی تھی۔ اس سے صوبائی لیگوں کی سرگرمیوں کی نگرانی کی توقع کی جاتی تھی اور وہ ہر انفرادی رکن یا آئینی تنظیم کے خلاف انضباطی کارروائی کرنے کی مجاز تھی۔ متاثرہ افراد اور اداروں کو اس کے خلاف کونسل سے اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔

مرکزی پارلیمانی بورڈ جس کا انتخاب تین سال کے لیے عمل میں آتا تھا۔ بارہ ارکان پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر صُوبے سے چھ چھ ارکان لیے جاتے تھے۔ مسلم لیگ کا صدر ہی اس کا بہ حیثیت عہدہ چیئرمین ہوتا تھا۔ بورڈ کا بنیادی کام مرکزی مجلسِ قانون ساز کے لیے موزوں اُمیدواروں کی نامزدگی تھا

---

[1] : ایضاً۔ ص ۱۴

یہ نامزدگی صوبائی پارلیمانی بورڈ کے مشورہ سے عمل میں آتی ۔بورڈ سے مرکزی مجلسِ قانون ساز کی مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کی عمومی نگرانی کی بھی توقع کی جاتی تھی ۔ علاوہ ازیں وہ صوبائی پارلیمانی بورڈوں اور صوبائی اسمبلیوں میں مسلم لیگ پارٹیوں کی سرگرمیوں کی بھی نگرانی کرتا تھا۔[1]

آئین کی ترتیب و تدوین :

لیاقت علی خان نے جو پاکستان مسلم لیگ کے اوّلین کنوینر مقرر ہوئے تھے لیگ کونسل کا پہلا اجلاس ۲۴ر فروری ۱۹۴۸ء کو طلب کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں ۱۴-۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو منعقد ہونے والے لیگ کونسل کے اجلاس کی قرارداد کے مطابق پاکستان مسلم لیگ کونسل کے تمام مجاز ارکان سے کہا گیا کہ وہ اس اخباری اعلان کو ہی اجلاس کی باضابطہ اطّلاع تصوّر کریں۔[2]

آل پاکستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بالآخر ۲۱ر فروری ۱۹۴۸ء کو منعقد ہوا[3] کونسل کا ایک اہم فریضہ پاکستان مسلم لیگ کے آئین کی توثیق تھا۔ لیاقت علی خان نے ۶۵ دفعات پرمشتمل مسودۂ آئین کونسل کے سامنے پیش کیا۔ اجلاس میں گیارہ ارکان پرمشتمل ایک آئینی سب کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور سردار عبد الرّب نشتر اس کے کنوینر بنائے گئے۔ اس سب کمیٹی کو مسودۂ آئین کا بغور جائزہ لینے کے بعد کونسل کے سامنے

---

۱ : ایضاً - ص ۲۴ -

۲ : پاکستان ٹائمز لاہور ۴ر فروری ۱۹۴۸ء -

۳ : پاکستان ٹائمز لاہور ۲۲ر فروری ۱۹۴۸ء -

Marfat.com

اپنی رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی گئی۔[۱] اس کمیٹی کی رپورٹ پر کونسل نے اپنے ۲۴ر-۲۵ر فروری کے اجلاس میں غور کیا۔ لیکن ابھی صرف ۹ دفعات ہی منظور کی گئی تھیں کہ کونسل کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔[۲] اگلے دن جب کونسل کا اجلاس ہُوا تو یہ سوال بحث و نزاع کا موضوع بن گیا کہ حکومتی عُہدے داروں کو پاکستان مسلم لیگ میں عُہدے دار بننے کی اجازت ہونی چاہیئے یا نہیں؟ حکومتی عُہدیداروں کے ضمن میں وزراء وغیرہ آتے تھے۔

قائدِ اعظم کا خیال تھا کہ حکومت اور مسلم لیگ کو علیحدہ علیحدہ نہیں رکھنا چاہیئے کیونکہ اگر کسی وقت بھی مسلم لیگ کی صفیں اعلیٰ لیڈر شپ سے خالی ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ اسے قیادت کے لیے حکومتی عہدیداران میں سے کسی کی ضرورت محسوس ہو۔ علاوہ ازیں ان کا خیال تھا کہ جماعت اور حکومت کی قیادت کی علیحدگی سے مسلم لیگ کے صدر اور وزیرِ اعظم اور اس طرح صوبائی مسلم لیگ کے صدر اور وزیرِ اعلےٰ کے درمیان مستقل آویزش اور رسہ کشی کی بنیاد رکھ دی جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دُوسرے کا Stooge بن کر رہنا پڑے گا، اور اس طرح یا حکومت کو نقصان پہنچے گا یا مسلم لیگ کو۔[۳] چنانچہ انھوں نے کہا کہ اسے دستور

---

[۱]: پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۲۲ر فروری ۱۹۴۸ء۔

[۲]: پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۲۶ر فروری ۱۹۴۸ء۔

[۳]: Father and Daughter جہاں آرا شاہنواز
نگارشات لاہور (۱۹۷۱ء) صفحہ نمبر ۳۵-۲۳۴۔

Marfat.com

کا حصّہ نہ بنائیں بلکہ روایت (Prccedent) کا درجہ دیں۔

قائداعظم کے اس استدلال کے جواب میں سرحد کے پیر مانکی شریف نے یہ ترمیم پیش کی کہ اس اصُول سے قائداعظم کو مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ قائداعظم اس وقت صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے یہ تجویز اس بنیاد پر مسترد کر دی کہ گورنر جنرل کی حیثیت میں آبادی کے تمام طبقات کے مفادات کی ذمّہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے وہ جماعت میں کوئی عہدہ نہیں لے سکتے۔ اگرچہ انھوں نے اس ترمیم کو ٹال دیا اور اپنی ناپسندیدگی کا زیادہ اظہار نہیں کیا لیکن عام کونسلروں کا خیال ہے کہ قائداعظم نے اس تحریک کا بُرا مانا کیونکہ وہ شاید یہ سمجھے کہ ان کے اصولی اختلاف سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ وُہ اپنے لیے کوئی عُہدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں[۱]۔ بہر حال مسلم لیگ کونسل نے قائداعظم کی تجویز کو قبول نہ کیا اور حکومتی عہدیداروں پر جماعت میں عہدے قبول کرنے پر پابندی عائد کر دی[۲]۔ علاوہ ازیں یہ پابندی بھی لگا دی گئی کہ پارلیمانی بورڈ کے ممبران اسمبلیوں کے انتخابات میں حصّہ نہیں لے سکیں گے۔ اس پابندی کا مقصد پارلیمانی بورڈ کو سازشوں سے پاک رکھنا تھا۔

---

[۱]: مصنف کا مولانا ظفر احمد انصاری ایم این اے سے ذاتی انٹرویو۔ مولانا اس اجلاس میں موجُود تھے اور اسٹیج پر قائداعظم کے قریب بیٹھے تھے۔ آپ دستور سب کمیٹی کے بھی رُکن تھے۔ اور اس سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری بھی رہ چکے تھے۔

[۲]: پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۲۶ر فروری ۱۹۴۸ء۔

Marfat.com

اس بحث سے دو باتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں :- اوّل تو یہ کہ قائد اعظم کے نزدیک سربراہ مملکت کو جماعتی سیاست سے بلند ہو کر ملک کے تمام طبقوں کے حقوق کی نگہداشت کرنی چاہیئے۔ دوم اس تاثر کی بھی تردید ہوتی ہے کہ قائد اعظمؒ مخالفت برداشت نہیں کرتے تھے یا یہ کہ مسلم لیگ کونسل ان کے سامنے محض ایک بے بس ادارہ تھی۔

اس پابندی کے لیے بنیادی دلیل یہ تھی کہ پاکستان مسلم لیگ حکمران پارٹی تھی۔ اس لیے جماعت میں وزیروں کو عہدیدار بنانے پر پابندی عائد کرنا ضروری تھا۔ تاکہ حکومت اور جماعت میں امتیاز برقرار رکھا جا سکتا یہ دلیل اس نقطہ نظر سے معقول تھی کہ مسلم لیگ اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھ کر عوام کی بہتر خدمت کر سکتی تھی کیونکہ اس طرح وہ حکومت پر تنقید بھی کر سکتی تھی۔ اس کی رہنمائی بھی کر سکتی تھی اور حکومت تک عوام کے احساسات بھی پہنچا سکتی تھی۔ حکومتی اور جماعتی قیادت کے یکجا کرنے میں خطرہ یہ تھا کہ مبادا پارٹی حکومت کی محض ترجمان بن کر رہ جائے اور معدودے چند سیاست دانوں کے سوا عوام کی ترجمانی کا کوئی بھی مؤثر ادارہ باقی نہ رہے لہٰذا عوام کی سیاسی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جائے لیکن تجربے نے قائد اعظم کے استدلال اور پیش گوئی کو درست ثابت کر دیا۔ حکومتی اور جماعتی قیادت کو الگ رکھنے کے فیصلے نے مسلم لیگ اور حکومت میں مستقل آویزش اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کو جنم دیا، جس کے 98

Marfat.com

نتیجے کے طور پر مسلم لیگ گروہی سیاست کا شکار ہو کر رہ گئی۔ وزراء اعلیٰ اور صوبائی لیگوں کے درمیان رسہ کشی نے حکومت اور مسلم لیگ دونوں کی ساکھ کو بے حد نقصان پہنچایا اور یہیں سے مسلم لیگ کا زوال شروع ہوا۔

Marfat.com

باب ۳

مسلم لیگ کی قیادت

آئین کی توثیق اور چیف آرگنائزر کے انتخاب کے لیے لیگ کونسل کا اجلاس ۲۶ فروری ۱۹۴۸ء کو منعقد ہوا۔ اس عہدے کے لیے کئی سرکردہ اور ممتاز ارکان اُمیدوار تھے۔ کراچی میں کونسل کے اجلاس میں متعدد اصحاب کے نام تجویز کیے گئے اور بحث وتمحیص میں اتنی گرما گرمی پیدا ہوگئی کہ قائداعظم جو اجلاس کی صدارت کر رہے تھے یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ آپ کسی ایک نام پر دو منٹ کے اندر اتفاق کر لیں ورنہ میں اُٹھ کر چلا جاؤں گا۔[1]

قائداعظم کے اس اعلان پر مکمل سکوت طاری ہوگیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے اور دو منٹ گزرنے کے بعد فی الواقع اجلاس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ غالب امکان یہ تھا کہ یہ اجلاس افراتفری کی نذر ہو جائے گا۔

---

۱ : مسٹر ابوسعید انور کا تعلق لاہور سے ہے۔ آپ کونسل کے اجلاس میں شریک تھے۔ اُنھوں نے یہ بات ذاتی ملاقات میں بتائی۔ موصوف مسلم لیگ کے ایک ممتاز کارکن رہے ہیں اور اس زمانے میں کونسلر تھے۔

Marfat.com

لیکن ابوسعید انور نے اس مرحلہ میں یہ تجویز پیش کی کہ آپ مرزا عبدالرب نشتر صدارت کے فرائض ادا کریں[1] یہ تجویز منظور ہوگئی اور اجلاس کی کارروائی دوبارہ شروع ہوگئی۔

چودھری خلیق الزماں انھی دنوں بھارت سے ترکِ وطن کرکے آئے تھے اور انھیں لیگ کا ایک مخلص اور بے لوث کارکن سمجھا جاتا تھا۔ چیف آرگنائزر کے عہدہ کے لیے ان کا نام تجویز کیا گیا اور اکثریت نے اس کی حمایت کی[2]

چودھری خلیق الزماں نے اس ذمہ داری کو اپنے ناتواں کندھوں پر بھاری بوجھ قرار دیا۔ چیف آرگنائزر کی حیثیت سے ان کے بنیادی فرائض پرائمری اداروں کا قیام، رکنیت سازی اور صوبوں میں جماعت کے نئے انتخابات کا انتظام کرنا تھا۔ صوبائی جماعتوں کے نمائندوں سے پاکستان

---

[1]: ایضاً (بحوالہ ابوسعید انور)

[2]: مصنّف کو یہ بات مسلم لیگ کے بہت سے کارکنوں اور رہنماؤں نے بتائی کہ قائداعظم چودھری خلیق الزماں کے انتخاب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لیاقت علی خان ہی چیف آرگنائزر رہوں لیکن جب مسلم لیگ کی کونسل نے وزراء پر پابندی لگادی تو قائداعظم کو ناگوار گزرا۔ اگرچہ انھوں نے کھُل کر چودھری صاحب کی مخالفت نہ کی اور اکثریت کے فیصلے کا پُورا احترام کیا لیکن تقریباً سارے کونسلر قائداعظم کی رائے سے واقف تھے۔ اس سے بہرحال یہ تاثر ختم ہوجاتا ہے کہ قائداعظم آمر تھے اور اختلافِ رائے برداشت نہیں کرتے تھے۔

Marfat.com

مسلم لیگ کی نئی کونسل کی تشکیل ہونی تھی اور نئی کونسل کو پاکستان مسلم لیگ کے عہدیداروں کا انتخاب کرنا تھا۔ چنانچہ تنظیم نو کی تکمیل کا مرحلہ طے ہو جانے تک منشور پر مکمل عمل درآمد ملتوی کر دیا گیا

چودھری خلیق الزمان نے سارے ملک میں رکنیت سازی کی مہم شروع کر دی اور اس مہم کی نگرانی کا فریضہ سابق صوبائی صدروں اور سابق سیکرٹریوں کو تفویض کر کے انھیں علاقائی آرگنائزر بنا دیا۔ اسی طرح اضلاع میں بھی آرگنائزر مقرر کیے گئے۔ مسلم لیگ کے سرکردہ راہنماؤں نے ملک کے طول و عرض میں انتخابی دورے کیے۔ اس دوران میں تمام صوبائی لیگیں سرگرم عمل تھیں اور ملک کی سیاسی فضا میں جوش و خروش پایا جاتا تھا۔

چودھری صاحب اکثر مقامات پر مسلم لیگ کے آئندہ کردار کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ "اگر نئی مسلم لیگ نے پاکستان کے عوام کی حالت بہتر بنانے کا راستہ اختیار نہ کیا تو یہ لوگوں کے لیے رحمت اور برکت کا باعث بننے کی بجائے لعنت ثابت ہو گی۔" [۱]

اگرچہ رکنیت سازی کی مہم سارے صوبوں میں کافی زوروں پر تھی۔ لیکن اس زمانے میں بھی مسلم لیگ کی سیاست گھٹیا سازشوں اور سیاسی جوڑ توڑ سے مبرّا نہ تھی۔ ہر صوبے میں قیادت دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی اور ہر گروپ دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے تھا۔ اس سازشی جوڑ توڑ کا زہر ضلعی کی سطح پر بھی سرایت کر گیا تھا۔ جہاں صوبائی قائدین

---

۱ : پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۶ مئی ۱۹۴۸ء۔

Marfat.com

کے پیروکاروں نے جائز و ناجائز ذرائع سے اپنے گروہ کی زیادہ سے زیادہ رکنیت سازی کے لیے ہر غیر جمہوری طریقے کو روا رکھا ہُوا تھا۔ گویا اس وسیع رکنیت سازی کا مقصد پارٹی کا استحکام نہیں تھا بلکہ رکنیت سازی میں اکثریت حاصل کر کے مخالف دھڑے پر غلبہ حاصل کرنا تھا۔ بالفاظِ دیگر جماعتی تنظیم پیشِ نظر نہ تھی اصل مطمحِ نظر عہدے تھے۔ اس طرح پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے فوراً ہی بعد حصولِ اقتدار کے لیے سیاست کے گندے کھیل کا آغاز ہوگیا اور وہ اب تک جاری ہے۔

۱۹۴۸ء کی رکنیت سازی کا دور وُہ دور تھا جب ابھی تحریکِ پاکستان کے جذبے کی آگ سرد نہیں پڑی تھی۔ اس لیے توقع یہ تھی کہ مسلم لیگ کے کارکن اس مہم کے دوران ڈسپلن اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کریں گے لیکن لیگی کارکنوں اور راہنماؤں نے جس پستیٔ کردار کا مظاہرہ کیا اور جس طرح حصولِ اقتدار کے لیے سازشوں کا جال بچھایا، اس سے نہ صرف مسلم لیگ ہی کی ساکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا بلکہ پُوری قوم کے جذبات کو ٹھیس لگی۔ باشعور حلقوں نے اس سے یہ تاثر لیا کہ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کے سوا باقی سب کے نزدیک حصُولِ پاکستان کا مقصد محض عہدے حاصل کرنا تھا یا یہ کہہ لیجیے کہ مسلم لیگی قیادت اپنے کارکنوں کو صحیح سیاسی تربیت دینے میں ناکام رہی تھی جس کا نتیجہ اس کردار کا مظاہرہ تھا۔

ان سیاسی کھلاڑیوں نے یہ مطلق احساس نہ کیا کہ ملک بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے اور مسلم لیگ کے جن رہنماؤں کو تحریکِ پاکستان میں قیادت کا شرف حاصل ہے انھیں قیامِ پاکستان کے بعد ایک سال سے بھی کم عرصے کے اندر اندر محض اقتدار کے لیے سیاست کا یہ کھیل زیب

Marfat.com

نہیں دیتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نچلی سطح پر مسلم لیگی رہنماؤں کو قوم اور ملک کے مسائل و مشکلات کا کماحقّہٗ شعور اور احساس نہیں تھا۔ بہرحال جب سازش اور جوڑ توڑ کا سلسلہ شروع ہوگیا تو پھر اس کے ختم ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی۔ جماعت کی صفوں میں در آنے والی اس کش مکش نے مسلم لیگ کی تنظیم کو بھی انتشار میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ پاکستان مسلم لیگ کی رکنیت سازی کی اوّلین مہم جمہوری طور پر جاری نہ رہ سکی۔

ایک مرتبہ بدعنوانی اور بے ضابطگی کی بنیاد رکھ دی جائے تو پھر یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

انتخابات ہُوئے اور پنجاب میں میاں افتخار الدین بھاری اکثریت سے صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ سیکرٹری کے عہدہ کے لیے مولانا علاؤ الدین صدیقی کو چُن لیا گیا [۱]

صدر منتخب ہونے کے بعد میاں افتخار الدین نے صُوبے کا دورہ کیا اور لوگوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہونے اور اسلام کی تعلیمات کے مطابق پاکستان کو ایک عظیم جمہوری مملکت بنانے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دینے کی تلقین کی۔ ان کے خیال میں یہ خواب اسی طرح شرمندۂ تعبیر ہو سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ مسلم لیگ کے رُکن بن کر اسے ایک جاندار اور مضبوط تنظیم بنا دیں۔ رکنیت سازی کی مہم "لیگ کا ہفتۂ رکنیت سازی" منانے پر ختم ہوئی جس میں کارکنوں نے رکنیت سازی کے لیے اپنی مساعی کو تیز تر کر دیا۔ صرف پنجاب میں گیارہ لاکھ افراد نے

---

[۱] : پاکستان ٹائمز لاہور ۱۸ نومبر ۱۹۴۷ء

Marfat.com

مسلم لیگ کی رُکنیّت قبول کی۔ چنانچہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر نے صُوبے کے لوگوں کو رکنیّت سازی کا ریکارڈ قائم کرنے پر مبارکباد پیش کی۔[1]

دُوسرے علاقوں کی طرح سرحد میں بھی رکنیّت سازی کے کام میں انصاف اور ضوابط کے تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھا گیا۔ وہاں کے وزیرِ اعلےٰ خان عبدالقیوم رکنیّت سازی کو صرف اپنے پیروکاروں تک محدود رکھنے کے خواہاں و کوشاں تھے۔ تاکہ اسمبلی کے باہر بھی پارٹی ان کی مرغ دست آموز بنی رہے۔

چودھری خلیق الزمان اس صُورتِ حال سے پُوری طرح باخبر تھے۔ لیکن چونکہ وُہ خود پاکستان مسلم لیگ کا صدر بننے کے لیے وزیرِ اعلیٰ سرحد کی امداد اور حمایت کی آس لگائے بیٹھے تھے اس لیے اُس کی تمام غیر جمہوری حرکات سے چشم پوشی کرتے تھے۔

پیر مانکی شریف مسلم لیگ کے ایک دیرینہ، مخلص کارکن، اور بے لوث رہنما تھے۔ انھوں نے نہ صرف ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے دن رات کام کیا تھا بلکہ ۱۹۴۷ء کے استصواب میں بھی مسلم لیگ کی عہد آفریں کامیابی میں ان کی مساعی کا حصّہ دُوسرے صُوبائی راہنماؤں سے بہرحال زیادہ تھا۔ خان عبدالقیوم خان پیر صاحب کی مقبولیت سے خوفزدہ تھے اور انھیں سیاسی حریف سمجھتے تھے۔ چنانچہ پیر صاحب کو مسلم لیگ سے نکالنے کے لیے قیوم خان کے اشارے پر سرحد کی تنظیمی کمیٹی نے پیر صاحب کے حامیوں کو رکنیّت سازی کے فارم مہیّا نہ کیے۔[2]

---

[1] : پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۱۸ جون ۱۹۴۸ء۔

[2] : پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۹ نومبر ۱۹۴۸ء۔

Marfat.com

پیر صاحب نے حکمران گروپ کے اس رویے پر شدید احتجاج کیا اور یہ الزام عائد کیا کہ :- "تنظیمی کمیٹی نے بڑے منظم طریقے سے مسلم لیگ کی رکنیت سازی کو صرف موجودہ حکمران ٹولے کے وفاداروں تک محدود رکھا ہے۔ چنانچہ عام لوگ ابھی سے مسلم لیگ سے کردار پر شک وشبہ ظاہر کرنے لگے ہیں۔"[۱] انھوں نے الزامات کا جائزہ لینے کے لیے تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن ان کے احتجاج کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ چنانچہ پیر صاحب مسلم لیگ کی انتخابی کمیٹی کے اجلاس سے بطور احتجاج واک آؤٹ کر گئے۔[۲] اس کے بعد چودھری خلیق الزمان نے پیر صاحب سے ملاقات کی اور خان عبدالقیوم خاں کے ساتھ ان کے اختلاف کو رفع کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر انھیں ناکامی ہوئی۔ جس کے نتیجے کے طور پر سرحد میں سیاسی صورت حال پر کشیدگی بدستور سایہ فگن رہی۔ بہرحال سرحد میں مسلم لیگ اپنے ایک دیرینہ، مخلص اور بارسوخ کارکن کی حمایت سے محروم ہو گئی۔ اس رسوا کن داستان کا اعادہ دوسرے صوبوں میں بھی ہوتا رہا۔

سرحد اور پنجاب کی طرح سندھ میں بھی متحارب دھڑے ابھر آئے۔ یہ دھڑے محمد ایوب کھوڑو اور پیر الٰہی بخش کے تھے۔ یہ دونوں اصحاب مسلم لیگ کے پرانے اور سرکردہ رہنما تھے۔ بالآخر انتخابی مہم میں کھوڑو گروپ کامیاب و کامران رہا۔ کھوڑو گروپ کی کامیابی میں ان تمام غیر جمہوری ہتھکنڈوں کا بھرپور حصہ تھا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

---

۱ : پاکستان ٹائمز - ۱۷ر نومبر ۱۹۴۸ء۔

۲ : پاکستان ٹائمز - ۹ر دسمبر ۱۹۴۸ء۔

Marfat.com

رکنیت سازی کی مہم جون ۱۹۴۸ء میں ختم ہوئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں ۲۵ لاکھ سے زائد پرائمری ارکان بنائے گئے ہیں [1]

انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ کونسل کا قیام معرض وجود میں آیا جس کا اگلا اجلاس ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو ہوا۔ اس میں ۳۰۰ کونسلر شریک ہوئے۔ چیف آرگنائزر نے اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا کہ :۔ "مسلم لیگ کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی اتنی تیزی سے رکنیت سازی نہیں ہوئی۔" [2]

93

کونسل نے چودھری خلیق الزمان کو پاکستان مسلم لیگ کا پہلا صدر منتخب کیا۔ دوسرے عہدے دار یہ تھے :۔ جنرل سیکرٹری یوسف خٹک۔ نائب صدر مولانا عبدالباقی۔ جوائنٹ سیکرٹری غیاث الدین اور نبی بخش۔ [3]

ان عہدیداروں میں کسی کا بھی تعلق پنجاب سے نہیں تھا۔ حالانکہ اس صوبے میں پرائمری ارکان کی تعداد سب صوبوں سے زیادہ تھی۔

کونسل کے اجلاس میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا۔

یہ بورڈ ان آٹھ اصحاب پر مشتمل تھا :۔ (۱) مولانا عبدالباقی (۲) عبدالکریم (۳) مولوی تمیز الدین خان (۴) سید خلیل الرحمان

---

[1] : پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۱۳ مئی ۱۹۴۸ء۔

[2] : ڈان کراچی۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء۔

[3] : پاکستان ٹائمز لاہور ۲۲ فروری ۱۹۴۹ء

Marfat.com

(۵) چودھری نصیر احمد ملہی (٦) خان محمد ابراہیم خان (۷) آغا غلام نبی پٹھان، اور (۸) قاضی محمد عیسیٰ۔ [۱]

چودھری خلیق الزمان اگرچہ اتفاقِ رائے سے صدر منتخب ہوئے تھے۔ تاہم یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ انھوں نے صوبوں میں رکنیت سازی اور انتخابات کے سلسلے میں اپنے حامیوں کی جائز اور ناجائز ہر طریقے سے مدد کی تھی تاکہ جب وہ خود صدارت کے لیے کھڑے ہوں، تو ان کے ممنونِ احسان حلقے بھی ان کی حمایت کریں۔ اخبارات نے چودھری خلیق الزمان کے انتخاب کو پسند نہ کیا اور جب انھوں نے موجودہ قیادت کے تحت مسلم لیگ کو مضبوط و متحد بنانے کی اپیل کی تو لاہور کے اخبارات نے ان کے خلاف مہم شروع کر دی۔ [۲]

---

[۱]: ڈان کراچی۔ ۲۲ فروری ۱۹۴۹ء۔

[۲]: لاہور کے تمام اخبارات نے ماسوا روزنامہ "احسان" اور "غازی" کے چودھری خلیق الزمان کے خلاف مضامین شائع کیے۔

روزنامہ "زمیندار" نے لکھا:

"موقع پرستی کے میدان میں چودھری خلیق الزمان کا کوئی ثانی اور حریف نہیں۔ پنجاب میں سیاست ابھی کٹھالی میں ہے اور کوئی شخص بھی یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ کامیابی کس دھڑے کے قدم چومے گی۔"

روزنامہ "امروز" نے لکھا کہ:۔ "انھوں نے صوبائی لیگ کے رہنماؤں میں نفاق و افتراق کا بیج (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

Marfat.com

سیاسی جماعتوں کے وقار اور شہرت کا بڑی حد تک انحصار ان کے لیڈروں کی شہرت پر ہوتا ہے۔ جب تک مسلم لیگ کو قائدِ اعظم کی رہنمائی نصیب رہی اس کی مقبولیّت کا دائرہ بے حد وسیع رہا۔ برِّصغیر پاکستان و بھارت کی تقسیم کے بعد مسلم لیگ کو ایک ایسے ہی قابل اور مقبولِ عوام رہنما کی ضرورت تھی جو اس کے بنیادی مقاصد کے حصُول کے لیے عوام کی حمایت حاصل کر سکتا اور مسلم لیگ کو عوامی تحریک بنا سکتا۔ لیکن چودھری خلیق الزمان ان تمام صفات سے عاری تھے۔ مسلم لیگ کو ایسی قیادت درکار تھی جو ایک طرف قوم کو متحد رکھ سکتی اور دُوسری طرف اس کی صلاحیتوں کو نوزائیدہ مملکت کی تعمیر و ترقی کے لیے بروئے کار لا سکتی کیونکہ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کو نہ صرف اپنے وُہ وعدے پُورے کرنا تھے جو اس نے جدوجہد آزادی کے زمانے میں عوام سے کیے تھے بلکہ عوام کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی حالت بھی بہتر بنانا تھی۔

بقیہ :۔ فٹ نوٹ ۔ صفحہ گزشتہ سے آگے :۔

بو دیا ہے اور اب انھیں یہ فصل کاٹنی ہوگی۔"

روزنامہ" نوائے وقت" نے چودھری خلیق الزمان پر صدارتی گدی پر براجمان ہونے کے لیے سازش کرنے کا الزام عائد کرتے ہوئے لکھا کہ :

" اگر وُہ اپنا مطمحِ نظر متحارب عناصر میں مصالحت اور لیگ کے وقار کی بحالی قرار دیتے ہیں تو ہم یہ عرض کریں گے کہ ان کا یہ دعوے فراڈ ہے۔"

۸، ۹، ۱۰ مارچ ۱۹۴۹ء کے اخبارات ملاحظہ فرمائیں

Marfat.com

ان مقاصد کے حصول کے لیے مسلم لیگ کو ایک مخلص، ایمان دار اور قابل رہنما کی ضرورت تھی۔ عام احساس یہی تھا کہ چودھری خلیق الزمان کسی اعتبار سے بھی قائد اعظم کی جانشینی کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ وہ مسلم لیگ کو ایک عوامی اور ہر دلعزیز جماعت بنانے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ساکھ تیزی سے گر رہی تھی۔ چنانچہ جب وہ مارچ ۱۹۴۹ء میں لاہور آئے تو لاہور ریلوے سٹیشن پر ان کا استقبال کالی جھنڈیوں سے کیا گیا۔

مظاہرین نے جو کتبے اٹھا رکھے تھے۔ ان پر :۔ "بھارتی مسلمانوں کا قاتل"۔ "واپس جاؤ"۔ "مسلم لیگ کو سازشیوں سے پاک کرو"۔ "نامزدگیاں ختم کرو" اور "اصلی مسلم لیگ بحال کرو" کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ ؎

مظاہرے کسی سیاسی جماعت کی عدم مقبولیت کا صحیح معیار نہیں ہوتے لیکن چودھری خلیق الزمان کے خلاف یہ مظاہرے لوگوں کے دلی جذبات کے آئینہ دار تھے اور ان سے جماعت کی ساکھ کو بڑا نقصان پہنچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں مسلم لیگ سازشوں کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ لیگ میں بدعنوانی اور گھٹیا دھڑے بندی سے لوگ بے زار اور متنفر تھے۔ اگرچہ پاکستان مسلم لیگ کا سربراہ اس صورتِ حال کے لیے صوبائی رہنماؤں کے برابر ذمہ دار نہیں تھا لیکن لوگوں نے جماعت کے سربراہ کے خلاف مظاہروں سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر دیا۔

صدر منتخب ہونے کے بعد چودھری خلیق الزمان کو ورکنگ کمیٹی

؎ : پاکستان ٹائمز، لاہور۔ ۲۵ مارچ ۱۹۴۹ء۔

Marfat.com

کے ارکان کا اعلان کرنا تھا۔ انھوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۹ء کو حسب ذیل ارکان کا اعلان کیا :-

لیاقت علی خان - مولانا شبیر احمد عثمانی - یوسف ہارون - میاں ممتاز دولتانہ - خان افتخار حسین ممدوٹ - بیگم شاہ نواز - بیگم شوکت نواز - صوفی عبد الحمید - مولانا علاؤ الدین صدیقی - مولانا اکرم خان - نور الامین - یوسف علی چودھری - مولوی عبد المجید - خان عبد القیوم خان - سردار اورنگ زیب اور قاضی محمد عیسیٰ۔ [1]

چودھری خلیق الزمان ۱۳ اگست ۱۹۵۰ء تک پاکستان مسلم لیگ کے صدر رہے جب انھیں اپنی رہائش گاہ کے سامنے مہاجرین کے مظاہرے کی وجہ سے مستعفی ہونا پڑا۔ [2] اس مظاہرے کی دو وجوہ تھیں :- ایک یہ کہ مہاجرین یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ چودھری خلیق الزمان کی قیادت میں مسلم لیگ ان کی بحالی کا مسئلہ حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ قائد اعظم کی وفات کے بعد ڈان ٹرسٹ کے صرف دو متولی مس فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان بقید حیات تھے اور چودھری خلیق الزمان بہ حیثیت صدر پاکستان مسلم لیگ اس ٹرسٹ کے متولی بننے کے خواہاں تھے۔ کراچی کے عوام کو جو مس فاطمہ جناح کا بڑا احترام کرتے تھے، یہ احساس ہوا کہ چودھری خلیق الزمان ان پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ [3]

---

۱ : پاکستان ٹائمز - ۶ مارچ ۱۹۴۹ء -

۲ : ڈان کراچی - ۱۴ اگست ۱۹۵۰ء -

۳ : روزنامہ "مشرق" لاہور ۱۸ اپریل ۱۹۶۴ء (سوانح حیات راجہ غضنفر علی خان - از سید نور احمد) -

Marfat.com

اس سے ان کے جذبات بھڑک اُٹھے۔

چودھری خلیق الزمان نے ایک اخباری بیان میں یہ کہا کہ: "بعض مفاد پرست گروپ چونکہ مہاجرین کے ایک حلقے کو یہ گمراہ کن بات باور کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ ان کے مفادات میرے ہاتھوں محفوظ نہیں ہیں اور وُہ ہماری آزادی کی چوتھی سالگرہ سے عین پہلے ناگوار صُورتِ حال پیدا کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی ذات کو امنِ عامہ میں خلل ڈالنے کا باعث نہیں بننے دُوں گا۔" [۱]

مسلم لیگ کے کئی ممتاز رہنماؤں نے جن میں میاں ممتاز دولتانہ بھی شامل تھے، چودھری خلیق الزمان پر اپنا استعفا واپس لینے کے لیے زور دیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مہاجرین کے ایک طبقے کا مظاہرہ صدر کے مستعفی ہو جانے کے لیے کافی جواز نہیں ہے۔ زیڈ۔ اے۔ ایچ لاری نے کہا:۔
" چودھری خلیق الزمان حکومت کی طرف سے بحالیات کے کام میں مؤثر حصّہ لیتے رہے ہیں لیکن اتنے مختصر وقت میں کوئی معجزہ نہیں دکھایا جا سکتا۔" [۲] میاں ممتاز دولتانہ نے یہ کہا کہ:۔" چودھری صاحب صرف مسلم لیگ کے سامنے ہی جواب دہ ہیں۔" [۳]

روزنامہ" نوائے وقت" لاہور نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

---

۱ : ڈان کراچی ۔ ۱۴ اگست ۱۹۵۰ء۔

۲ : ڈان کراچی ۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء ۔

۳ : پاکستان ٹائمز لاہور ۔ ۱۷ اگست ۱۹۵۰ء۔

Marfat.com

"چودھری خلیق الزمان کا استعفا قیام پاکستان کے بعد اِس مُلک کے عوام کی پہلی فتح ہے۔"[۱] چودھری صاحب کی حیثیت اِتنی کمزور اور بے وقعت ہو چکی تھی کہ : "صرف ایک مظاہرے کے بعد وُہ مستعفی ہو گئے۔"[۲]

چودھری خلیق الزمان مستعفی تو ہو گئے تھے لیکن انھیں یہ توقع تھی کہ ان کا استعفا منظور نہیں کیا جائے گا اور وُہ مسلم لیگ کونسل سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے کونسلروں کی حمایت و تائید حاصل کرنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ اس ضمن میں سندھ کے محمد ایوب کھوڑو اور پنجاب کے میاں ممتاز دولتانہ نے انھیں پورا یقین بھی دلایا کہ وہ نہ صرف ان کی حمایت کریں گے بلکہ اس بات کی کوشش بھی کریں گے کہ لیگ کونسل ان کا استعفا منظور نہ کرے۔[۳] لیکن لیاقت علی خان کی حمایت کے بغیر یہ بات ممکن نہ تھی۔ اس لیے ان کا استعفا منظور ہو گیا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ چودھری خلیق الزمان نے استعفا دے دیا تھا لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے ورکنگ کمیٹی کے ارکان نامزد کرنے کے سلسلہ میں اپنے اختیارات استعمال کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس

---

۱ : نوائے وقت لاہور۔ ۱۷ اگست ۱۹۵۰ء۔

۲ : "حکومت اور سیاسیات پاکستان میں" از مشتاق احمد (کراچی) صفحہ ۱۳۳۔

۳ : نوائے وقت لاہور۔ ۲۱ اگست ۱۹۵۰ء۔

Marfat.com

نہ کی اور ۲۳ اگست ۱۹۵۰ء کو حسب ذیل ناموں کا اعلان کر دیا :-

بیگم سلمیٰ تصدق حسین - بیگم جی - اے خان - بیگم فاطمہ - خان عبدالوحید خان - سردار محمد ظفراللہ - نواب زادہ رشید علی خان - چودھری عزیزالدین - سیّد زین العابدین شاہ - سیّد حمیداللہ - چودھری عبدالقوی - ملک ظل خان - سیّد غلام مصطفےٰ خالد گیلانی - محمود احمد منٹو - سیّد علی حسین شاہ - سردار عبدالحمید - نوراحمد - شیر بہادر - راجہ غضنفر مہدی - چودھری فضل الٰہی - چودھری لبشیراللہ - صلاح الدین اور میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ - [1]

اس فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے ۸۰ فی صد کا تعلق صرف پنجاب سے تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ نام میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نے تجویز کیے ہوں گے اور چودھری خلیق الزمان نے اپنے خودغرضانہ مفاد میں ان پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہوگی۔" غرض مند، دیوانہ" کے مصداق یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی کہ صرف پنجاب کے نمائندوں سے ورکنگ کمیٹی کو بھر دینے کا دوسرے صوبوں میں کیا ردِّ عمل ہوگا؟ بلاشبہ بڑے رہنماؤں کی چھوٹی باتوں نے پاکستان میں مسلم لیگ کو بڑا نقصان پہنچایا۔

چودھری خلیق الزمان کے زمانۂ صدارت میں یہ احساس روز بروز بڑھ رہا تھا کہ لیگ کے پاس معاشی، معاشرتی اور سیاسی ترقی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ مسلم لیگ کے راہنماؤں کے طور طریقوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ اسے عوام کی فلاح و بہبود کے مقابلے میں وزارتی سیاست

---

[1] : پاکستان ٹائمز لاہور - ۲۴ اگست ۱۹۵۰ء

Marfat.com

سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اخبارات چودھری صاحب کو پنجاب میں مسلم لیگ کے زوال کا ذمّہ دار قرار دیتے تھے۔ جب کہ مسلم لیگ کے ایک حلقے کا یہ خیال تھا کہ تمام صُوبے جس صُورتِ حال سے دوچار ہیں، اس کی ذمہ داری لیاقت علی خان پر بھی عائد ہوتی ہے۔

اس زمانے میں یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ مسلم لیگ کی رکنیت سازی کی مہم کا چرچا تو بہت کیا گیا تھا لیکن اس میں انصاف اور راست بازی سے کام نہیں لیا گیا۔ یہ الزام بڑی حد تک درست تھا کیونکہ ایک ضلع میں رکن بنائے جانے والے افراد کی تعداد اس ضلع کی بالغ آبادی سے بھی زیادہ تھی۔[1]

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ رکنیت سازی کی مہم میں کس قسم کے ہتھکنڈے روا رکھے گئے تھے۔ اگرچہ سرکاری طور پر رکنیت سازی کی مہم ختم ہو گئی تھی، لیکن رکنیت کے فارموں پر پہلے کی تاریخیں ڈال کر زیادہ سے زیادہ حامی تلاش کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ موروثی مشائخ اور بڑے زمیندار اس مہم میں پیش پیش تھے اور مسلم لیگ کے مستقبل کا فیصلہ جاگیرداروں کی سیاسی سیاسی لڑائی کے رُوپ میں کیا جا رہا تھا۔ اس لڑائی میں برادری اور قبیلے کی بُنیاد پر گٹھ جوڑ اور شخصی معاہدوں کو خاص الخاص ہتھیاروں کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔[2] اس زمانے میں اس حقیقت کا اعتراف ہونے لگا تھا کہ مسلم لیگ اپنی ساکھ سے محروم ہوتی جا رہی ہے

---

۱ : پاکستان ٹائمز۔ ۵ مارچ ۱۹۵۰ء۔

۲ : ایضاً

85

Marfat.com

اور بڑھتی ہوئی بے چینی سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں رہی۔

صدر کے طور پر چودھری خلیق الزمان نے لیگ کی حیثیت بہتر اور بلند کرنے کی کچھ کوشش کی اور اسے "اعلیٰ اور غالب ادارہ" بنانے کے لیے اپنی مساعی صرف کیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہر جگہ لیگی وزارتیں مسلم لیگ کی تنظیم اور اس کے ساتھ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ انھوں نے پے در پے اس قسم کے اعلان بھی کیے کہ لیگ تمام وزارتوں کے اقدامات کے ساتھ فرداً فرداً وزیروں کے اعمال کا بھی محاسبہ کرے گی۔[1] چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو بھی ایک سخت خط لکھا کہ :۔ "وہ بھارت اور حیدر آباد کی جنگ کے سلسلے میں حکومتِ پاکستان کی پوزیشن کی وضاحت کریں۔"[2] انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ وزیر اعظم اس مسئلے پر مسلم لیگ سے مشورہ کریں۔ اسی طرح جب لیاقت علی خان امریکہ کے دورے سے واپس آئے تو انھیں دورے کے تاثرات مسلم لیگ کے سامنے پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس ضمن میں جب لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبران نے ان سے فوجی امداد اور دوسرے دفاعی معاملات پر سوالات کیے تو انھوں نے یہ کہہ کر سب کو چپ کرا دیا کہ :

"یہ معاملات خفیہ ہیں اور کابینہ کا ہر ممبر انھیں خفیہ

---

[1] : پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۶ مئی ۱۹۴۸ء۔

[2] : پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۸ء۔

Marfat.com

رکھنے کا حلف اٹھاتا ہے۔" ¹

اس سے چودھری صاحب کا مسلم لیگ کو حکومت سے بھی بلند تر تنظیم بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، کیونکہ لیاقت علی خان بہر حال چودھری خلیق الزمان سے زیادہ مقبول اور طاقت ور لیڈر تھے۔ لیکن چودھری صاحب کی ان کوششوں اور ایسے نظریات کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ سارے صوبوں میں مسلم لیگ کے راہنماؤں اور وزراء اعلیٰ میں کش مکش شروع ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں کرنے لگے جس سے مسلم لیگ کو بے پناہ نقصان پہنچا۔ چنانچہ اس Dual لیڈر شپ کے تصور کو ختم کرنے کے لیے مسلم لیگ کے دستور میں دوبارہ ترمیم کی گئی اور وزراء پر مسلم لیگ کے عہدے قبول کرنے کی پابندی ختم کر دی گئی۔

ایک طرف Dual لیڈر شپ کے سبب صوبوں میں مسلم لیگ اور حکومت کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے ناخدا حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازشیں کرنے لگے اور یہ جرأت انھیں اس لیے ہوئی کہ وہ مسلم لیگ پر قابض تھے اور حکومت مسلم لیگ کی تھی۔ چنانچہ وہ وزیر اعظم کو بھی اپنے سے کم تر سمجھنے لگے تھے۔ اسی طرح کی ایک سازش جو کامیاب نہ ہو سکی، چودھری خلیق الزمان، غلام محمد، خواجہ شہاب الدین اور گورمانی نے لیاقت علی خان کو ہٹانے کے لیے اس وقت کی جب وہ دورے پر امریکہ گئے ہوئے تھے لیکن لیاقت علی خان

---

¹ : مصنف کا انٹرویو عبدالوحید خان کے ساتھ۔ عبدالوحید خان مسلم لیگ کے مشہور کارکن اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔

Marfat.com

کی مقبولیت کے سبب یہ سازش کامیاب نہ ہوسکی۔[1]

چودھری خلیق الزمان کے استعفا کے بعد ان کے جانشین کے انتخاب کا فوری مسئلہ پیدا ہوگیا۔ ہر ذمہ دار لیگی یہی محسوس کرتا تھا کہ ایک فعال و متحرک اور ہر دلعزیز لیڈر ہی مسلم لیگ کی ساکھ ایک مضبوط و مؤثر جماعت کے طور پر بحال کرسکتا ہے۔[2] اس سلسلے میں ایک عام خیال یہ تھا کہ لیاقت علی خان نہ صرف اچھی شہرت کے مالک ہیں بلکہ لوگوں کو بھی ان کی ذات پر اعتماد ہے، لیکن بعض ارکان نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ حکومت اور جماعت کی رہنمائی کو یکجا کرنا جماعت کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ علاوہ ازیں اس سے آمرانہ رجحانات کی حوصلہ افزائی کا بھی امکان ہے۔

لیاقت علی خان کو بطور صدر منتخب کرنے کی افواہیں بالآخر درست ثابت ہوئیں۔ پاکستان مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری میر نبی بخش نے انھیں منتخب کرنے کی تجویز کی برملا حمایت کی۔

انھوں نے کہا کہ:- "اگر اس نازک مرحلے میں لیاقت علی خان کو قومی تنظیم کا ناخدا بننے پر آمادہ کیا جاسکے تو یہ نیک فال ہوگی۔"[3] اس سلسلے میں حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ صورتِ حال وزیر اعظم کی رضامندی اور اجازت سے یا اس کے بغیر پیدا ہوئی تھی تاہم لیاقت علی خان کے انتخاب میں ایک آئینی رکاوٹ تھی۔ مسلم لیگ کے آئین کے تحت حکومتی عہدیدار جماعت میں عہدے قبول نہیں کرسکتے تھے، چونکہ

---

[1]: ایضاً۔

[2]: ڈان کراچی - ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۰ء۔

[3]: پاکستان ٹائمز لاہور - ۶ر اکتوبر ۱۹۵۰ء۔

Marfat.com

اس تجویز کو اکثریت کی حمایت اور بعد ازاں وزیر اعظم کی آشیرباد بھی حاصل ہو گئی تھی۔ اس لیے آئین میں ترمیم کوئی مشکل مسئلہ نہ رہا۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے اس سلسلے میں پہل کی۔ اس نے کونسل سے یہ سفارش کی کہ :-

"اس پابندی کو ہٹا دیا جائے اور پارلیمانی بورڈوں کے ارکان کو مرکزی اور صوبائی تنظیموں کے عہدوں کا انتخاب لڑنے کی اجازت دے دی جائے۔"

جماعت کے آئین میں مطلوبہ ترمیم کر دی گئی اور کونسل نے ۹ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو نواب زادہ لیاقت علی خان کو اتفاق رائے سے پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب کر کے حکومت اور پارٹی کی قیادت کو یک جا کر دیا۔[1] 76

وزیر اعظم نے جب صدارتی کرسی سنبھالی تو ۳۰۰ کونسلروں نے پُرزور تالیوں سے انھیں ہدیۂ تہنیت پیش کیا۔[2] ممتاز راہنماؤں نے جن میں صوبائی صدر اور وزرائے اعلیٰ بھی شامل تھے، اپنے نئے صدر کو مکمل اور صدق دلانہ تعاون کا یقین دلایا۔

لیاقت علی خان نے اپنی تقریر میں مسلم لیگ کی مضبوطی کو پاکستان کی مضبوطی قرار دیا اور یہ کہا کہ مسلم لیگ کو مضبوط و مستحکم بنانا ہر پاکستانی کا مقدس فریضہ ہے۔ انھوں نے مسلم لیگ کے کارکنوں کو پُرزور تلقین کی کہ وہ پاکستان کے عوام میں ازسرِنو سیاسی بیداری پیدا کریں۔[3]

صدر منتخب ہونے کے بعد لیاقت علی خان نے نئی ورکنگ کمیٹی نامزد کی۔ یہ کمیٹی ۱۵ ارکان پر مشتمل تھی۔ جن میں سے ۱۲ کا اعلان انھوں

---

۱ : ڈان کراچی ۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء۔

۲ : ایضاً۔

۳ : ایضاً۔

Marfat.com

نے اپنے انتخاب کے فوراً بعد کر دیا۔ ان کے نام یہ تھے :۔

(۱) مولانا محمد اکرم خان (۲) نور الامین (۳) سیّد عبد المجید (۴) یوسف علی چوہدری (۵) صوفی عبد الحمید (۶) میاں ممتاز محمد خان دولتانہ (۷) بیگم شاہنواز (۸) خان عبد القیوم خان (۹) ایم۔اے کھوڑو (۱۰) ابراہیم خان جھگڑا (۱۱) قاضی فضل اللہ۔ اور (۱۲) قاضی محمد عیسیٰ۔

حکومتی عہدے داروں کو مسلم لیگ میں مناصب لینے سے روکنے کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ حکومت اور جماعت میں امتیاز برقرار رکھا جائے تاکہ لیگ بطور جماعت حکومت کے کنٹرول کے بغیر آزاد ماحول میں اپنے فرائض سرانجام دے سکے۔ اُس صورت میں مسلم لیگ کو حکومت پر تنقید کرنے کی آزادی بھی حاصل تھی اور وُہ وزیروں سے وضاحت بھی طلب کر سکتی تھی، لیکن جب وزیر اعظم ہی جماعت کا سربراہ بن گیا تو پارٹی کی اہمیت کا گھٹنا لازمی امر تھا۔ 76

مزید برآں لیاقت علی خان سربراہِ حکومت ہونے کی وجہ سے قومی معاملات میں از حد مصروف رہتے تھے اور وُہ لیگ کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکتے تھے۔

مسلم لیگ کی عام حالت یہ تھی کہ وُہ ایک ایسی پارٹی بن کر رہ گئی تھی جس کا کوئی پروگرام نہیں تھا، وُہ ایک ایسا کاروان تھا، جس کی کوئی منزل نہیں تھی اور نچلی سطحوں پر لیگ کے رہنما نہ دیانتدار تھے اور نہ ہی عوام میں مقبول۔ چنانچہ مسلم لیگ کو توانا بنانے کی ضرورت تھی، لیکن کوئی بھی شخص اس کی تنظیم میں نئی رُوح پھُونکنے کی اہلیت کا حامل نظر نہ آتا تھا۔

Marfat.com

دُوسری طرف ملک میں کوئی اور ایسی سیاسی جماعت موجود نہ تھی جو سیاسی فضا کو گرم رکھ سکتی اور عوام کو سیاسی تربیّت دے سکتی۔ نتیجے کے طور پر مسلم لیگ سے عام آدمی کی دلچسپی روز بروز کم ہونے لگی اور وُہ آہستہ آہستہ عوامی تحریک کی سطح سے گر کر محلاتی جماعت بن کر رہ گئی۔

چودھری خلیق الزمان کے زمانے میں مسلم لیگ کو "اعلیٰ اور غالب ادارہ" (Super Body) کی حیثیت حاصل تھی۔ لیاقت علی خان کے صدر بننے سے وُہ محض ایک حکومتی ترجمان کی سطح پر اُتر آئی۔ اب اس کا اہم اور بنیادی فریضہ یہ تھا کہ حکومت کی پالیسیوں کی وکالت فرمائے اور صفائی پیش کرتی رہے[1] پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ خان افتخار حسین ممدوٹ نے جماعت سے مستعفی ہوتے وقت یہی بات کہی۔

یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ چودھری خلیق الزمان کے زمانۂ صدارت میں سازشوں کا جو سلسلہ شروع ہُوا تھا لیاقت علی خان بھی مسلم لیگ کو ان سازشوں سے پاک نہ کر سکے۔ آہستہ آہستہ وُہ خود بھی سیاست برائے اقتدار کا شکار ہو کر رہ گئے۔ جماعت کو مضبوط و مستحکم بنانے اور اسے عام لوگوں سے قریب تر لانے کے بجائے لیاقت علی خان نے پارٹی میں اپنے ایسے حامیوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جو اپنے سیاسی مخالفوں کو پُوری سختی سے دباتے تھے اور اپنی بالادستی برقرار رکھتے تھے۔ اس معاملے میں لیاقت علی خان نے خود جو مثال پیش کی اس کی صوبائی سربراہوں نے بڑے اخلاص کے ساتھ پیروی کی۔ اس صورتِ حال سے بیزار اور رنجیدہ ہو کر کئی کارکن مستعفی ہو گئے۔ جہاں تک ان کے اخلاص، حب الوطنی اور مقبولیت کا تعلق ہے وہ قوم کے سچے راہنما تھے اور

---

[1] : نوائے وقت۔ لاہور۔ ۱۳ر اگست ۱۹۵۰ء۔

Marfat.com

قائدِ اعظم کے بعد پاکستان کی تعمیر میں ان کا حصّہ سب سے زیادہ تھا۔ لیاقت علی خان[1]

---

[1]: لیاقت علی خان کا قتل ایک ایسا معمّہ ہے، جو اکیس سال گزرنے کے باوجود حل نہیں ہُوا اور نہ آئندہ اس امر کی کوئی توقع ہے کہ وزیرِ اعظم کے قاتلوں کا سراغ مل سکے گا۔ یہ یقیناً کوئی ایسی گہری سازش تھی جس میں اپنے اور بیگانے دونوں شریک تھے۔ اس راز کے راز رہنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سازش کے کردار کسی نہ کسی طرح اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ اس لیے تحقیق مکمل نہ ہو سکی۔" دُنیا نے تو یہ دیکھا کہ غلام محمد صاحب کو وزارت سے نکالا جا رہا تھا۔ انھوں نے استعفیٰ دینے سے پہلے چند دن کی مہلت مانگی تھی۔ اس مدت کے اختتام سے پہلے یہ واقعہ ظہور پذیر ہُوا اور وہ گورنر جنرل بن گئے۔ آئی جی پولیس (قربان علی) وزیرِ اعظم کی حفاظت کے ذمّہ دار تھے۔ انھوں نے جس طرح اپنے فرض کو انجام دیا اس کے عوض وُہ ترقی کر کے بلوچستان کے گورنر بنا دیے گئے۔ جس افسر نے قاتل کو گولی مار کر موقع پر ہلاک کر دیا تھا اس کو ترقی پر ترقی ملتی رہی لیکن دم مارنے کی کسے مجال تھی۔ اعتزاز الدین صاحب آئی جی پولیس کے سپرد تحقیق تھی۔ ان سے پوچھا تو کچھ نہ بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ میاں موت سر پر کھیل رہی ہے۔ آخر دورانِ سفر ہوائی جہاز کے حادثے کا شکار ہُوئے۔ ان کے ساتھ وہ کاغذات بھی تباہ ہُوئے جو اس مسئلے پر روشنی ڈال سکتے تھے۔"

ہنگاموں میں زندگی ۔ مصنف مشتاق احمد (کمپٹرولر جنرل ریٹائرڈ)

مسودہ زیرِ طبع ۔ صفحہ ۱۶۰ ۔

Marfat.com

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی میں قتل ہو گئے۔ اس طرح وہ ایک سال تک پاکستان مسلم لیگ کے صدر رہے۔ ان کی وفات سے پاکستانی سیاست میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جو پھر پُر نہ ہو سکا۔ ان کی زندگی میں پاکستان کا وقار بیرونی دنیا میں بلند رہا اور اندرونی طور پر بھی ملک مستحکم رہا لیکن ان کے جانشین اتنے پست کردار نکلے کہ انھوں نے جمہوریت، ملکی وقار اور نظریۂ پاکستان کو اقتدار کی بھینٹ چڑھا دیا۔

لیاقت علی خان کا قتل ایک ایسا واقعہ ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ اور بھی اُلجھ گیا ہے۔ اور اب تو یُوں محسوس ہو رہا ہے جیسے مستقبل میں بھی اس راز سے پردہ نہیں اٹھ سکے گا۔ یہ کس قدر اذیت ناک احساس ہے کہ قوم کا وزیر اعظم دن دہاڑے لاکھوں لوگوں کے سامنے قتل کر دیا گیا، لیکن آج تک قوم اپنے راہنما کے اصلی قاتلوں سے بے خبر ہے، اس راز کو افشا کرنے کے لیے جتنی کوششیں بھی کی گئیں، ادھوری رہیں۔ اعتزاز الدین آئی جی سپیشل پولیس کو حکومتِ پاکستان نے اس کام پر مامُور کیا تو انھوں نے دن رات تحقیق اور تفتیش کرنے کے بعد کہا کہ انھیں سراغ مل گیا ہے۔

اس اعلان کے چند ہی روز بعد وُہ طیارہ جس میں اعتزاز صاحب سفر کر رہے تھے اور جس میں اس مقدمے سے متعلق تمام اہم کاغذات اور فائلیں تھیں گر کر تباہ ہو گیا۔ عام گمان یہی ہے کہ یہ حادثہ بھی اسی سازش کی ایک کڑی تھا۔

سکاٹ لینڈ یارڈ کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن قوم کو ان کی تحقیق پر اعتبار نہ تھا، کیونکہ موت سے قبل لیاقت علی خان حکومتِ برطانیہ کے بڑے

Marfat.com

مخالف ہو گئے تھے اور لوگ اس حکومت پر بھی شُبہ کرتے تھے۔ محمد علی بوگرہ نے ایف بی آئی (امریکہ) کی خدمات لینا چاہیں تو غلام محمد نے انھیں منع کر دیا۔ ایسا کیوں ہُوا، کسی کو علم نہیں اور جو بتا سکتے تھے، وُہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خود وزیر اعظم کے قتل کے کئی کردار اس جہان سے رخصت ہو چکے ہیں اور جو زندہ ہیں ان سے کسی کو پُوچھنے کی جراُت نہیں۔

اس پس منظر کے باوجود فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو اصرار تھا، کہ یہ قتل کسی سازش کا شاخسانہ نہ تھا، بلکہ فردِ واحد کا کارنامہ تھا۔ [1]

بیگم لیاقت علی خان اور قوم کو بہر حال یہ یقین ہے کہ لیاقت علی خان کا قتل کسی گہری سازش کا نتیجہ تھا۔ جس میں حکومت کے بااثر افسران شامل تھے۔ اس خیال کو کچھ ایسے حقائق سے بھی تقویت ملتی ہے جنھیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

مثلاً یہ کہ:

"سید اکبر کو شہر کی حدود سے باہر جانے کی ممانعت تھی اور پولیس کو صبح شام اس امر کا اطمینان کرنا ضروری تھا۔ لیکن ہوتا کیا ہے کہ اسے وزیر اعظم کے خفیہ پروگرام کا جسے صرف حکومت کے چند خاص عمال جانتے تھے، کئی دن پہلے علم ہو جاتا ہے۔" [2]

---

[1]: Friends, Not Masters - محمد ایوب خان۔
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۷ء۔ صفحہ ۴۱۔ ۴۲۔

[2]: بے تیغ سپاہی - صدیق علی خان (آپ وزیر اعظم کے سیکرٹری تھے)
الائڈ بک کارپوریشن کراچی ۱۹۷۱ء صفحہ ۵۰۷

Marfat.com

جب سید اکبر ہزارہ سے پنڈی پہنچا تو وہاں سی آئی ڈی کو اس کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ سید اکبر جس ہوٹل میں ٹھہرا وہاں اس نے اپنے آپ کو سی آئی ڈی کا سپاہی بتایا۔ پھر راولپنڈی سی آئی ڈی کا سپاہی اس ہوٹل کے مینجر سے یہ تصدیق کرنے بھی گیا کہ وہاں سید اکبر ٹھہرا ہوا ہے یا نہیں۔ اس کے باوجود سید اکبر کو کھلی چھٹی دی گئی اور وہ جلسے کی پہلی قطار میں جگہ پانے میں کامیاب ہو گیا حالانکہ وہاں پولیس کا پہرہ تھا اور پولیس سید اکبر کو جانتی تھی۔ [1]

سید اکبر نے جب گولی چلائی تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا لیکن اتنے میں ایک سب انسپکٹر پولیس محمد شاہ آیا۔ اس نے ریوالور نکال کر قاتل کو قتل کر دیا۔

آخر یہ کیوں ہوا؟

کوئی نہیں بتا سکے گا۔ ہاں البتہ محمد شاہ کو اس جرم کی پاداش میں ڈسچارج کر کے پنشن دے دی گئی اور پنڈی کے کمشنر انعام الرحیم کو جبری طور پر ریٹائر کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ قدرے منہ پھٹ تھے اور سچی بات کہہ دیتے تھے۔ ان کے سوا باقی تمام افسران ترقیاں پاتے رہے۔ [2]

پھر یہ بات بھی عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ:

"۱۶ اکتوبر کو مرکزی کابینہ کے دو اہم وزراء غلام محمد اور مشتاق گورمانی راولپنڈی میں موجود تھے اور یہ اعلان ہو

---

[1]: روزنامہ مشرق ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء محمود جاوید کا مضمون ملاحظہ فرمائیں۔ یہ صاحب اس جلسے میں شریک تھے)

[2]: ایضاً۔

Marfat.com

چکا تھا کہ وزیر اعظم اس جلسے میں انتہائی اہم تقریر کریں گے۔
اس کے باوجود یہ دونوں وزراء جلسے میں شریک نہیں ہوئے
حالانکہ لیاقت علی خان انتہائی مقبول اور با اثر وزیر اعظم تھے"[1]
یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ :

" وزیر اعظم نے غلام محمد اور نواب مشتاق گورمانی کو کابینہ سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خواجہ شہاب الدین کو بھی وزارت سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، تاکہ مملکت کے کام اور اچھی طرح انجام پائیں"۔[2]

سید اکبر کی تحقیق کے ضمن میں یہ بھی پتہ چلا کہ اس کی جیب میں دو ہزار روپے تھے جو شاید وہ فرار کے لیے زادِ راہ کے طور پر لایا تھا اور اس کے گھر کی تلاشی سے دس ہزار روپے بر آمد ہوئے۔ حالانکہ وہ ایک عام انسان تھا اور حکومتِ پاکستان سے معمولی پنشن پاتا تھا۔ علاوہ ازیں جب جسٹس منیر کو عدالتی تحقیقات پر مامور کیا گیا تو اکثر گواہوں نے عدالت سے شکایت کی کہ سی آئی ڈی ان کا تعاقب کرتی ہے۔ ایک موقعہ پر خود جج صاحب نے ایڈووکیٹ جنرل سے کہا تھا کہ وہ عدالت کے باہر سے سی آئی ڈی ہٹانے کا انتظام کریں، وگرنہ وہ عدالت لاہور لے جائیں گے۔[3]

اس کے بعد جب بیگم لیاقت علی خان نے بار بار یہ کہنا شروع کیا کہ

---

[1] : روزنامہ مشرق ۱۷ / اکتوبر ۱۹۶۸ء۔

[2] : بحوالہ صدیق علی خان۔ صفحہ نمبر ۵۱۵۔

[3] : ڈان کراچی۔ ۲۹ / نومبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

ان کے خاوند کا قتل کسی گہری سازش کا نتیجہ ہے جس میں کوئی غیر ملک بھی ملوث ہے:

"تو ان کا منہ بند کرنے کے لیے انھیں سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔" [1]

بعض لوگوں کی تو یہ بھی رائے ہے کہ:

"خود محمد علی بوگرہ کی وزارتِ عظمیٰ سے محرومی کی ایک وجہ لیاقت علی خان کے مقدمہ کی تحقیقات میں غیر معمولی دلچسپی تھی۔" [2]

اس سارے بیان سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ لیاقت علی خان کا قتل بہرحال ایک سازش کا شاخسانہ تھا اور اس کی پشت پر مقتدر لوگ تھے۔ اس لیے یہ راز افشا نہ ہو سکا۔

نوابزادہ لیاقت علی خان کے قتل پر ان کے رفقاء نے جس بے حسی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی ایک معمولی سی جھلک پاکستان کے لیڈروں کی ذہنیت اور ہوسِ اقتدار کے راز کو فاش کر دے گی:

---

[1]: روز نامہ "سویرا" ۲۳ اپریل ۱۹۵۶ء۔

[2]: Eclipse of East Pakistan

از Jyoti Sen Gupta

رنیکو پبلی کیشن کلکتہ (۱۹۶۳ء) صفحہ نمبر ۲۳

اس کے علاوہ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں:۔

Political Conspiracies in Pakistan

از جمنا داس اختر۔ دہلی (۱۹۶۹ء) باب بعنوان "لیاقت" ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

"کرنل میاں دوسرے کمرے میں جہاں میں لاش کے پاس بیٹھا ہُوا تھا تشریف لائے۔ مجھے پُرسا دیا اور میّت کو غسل دینے کی اجازت مانگی .... میں نے کہا کہ بہتر ہے کہ نواب گرمانی سے مشورہ کر لیا جائے۔ نواب صاحب کو ٹیلی فون کیا گیا تو جواب ملا کہ ان کو اطلاع نہیں دی جا سکتی، وُہ کانفرنس میں مشغول ہیں۔ دو بارہ میرے اصرار پر ٹیلیفون کیا گیا لیکن دونوں وقت ۔ یہی اطلاع ملی کہ کمرہ کے اندر کوئی نہیں جا سکتا۔ وہ غلام محمد کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہیں۔"[1]

"شہیدِ ملّت کے چند رفقائے کار یعنی چند اراکینِ کابینہ اس جانکاہ وقوعہ کے بعد جب کہ میّت ہسپتال میں رکھی ہوئی تھی، برطانوی اور امریکی روایت کو فوراً تازہ کرنے بیٹھ گئے یعنی بادشاہ مر گیا اور بادشاہ زندہ باد۔ ان کی یہ حرکت بڑی بھونڈی، دل آزار اور انسانیت کے منافی تھی۔"[2]

"میّت کراچی پہنچائی گئی۔ گرمی قسم کھائے بیٹھی تھی۔ زخموں سے خون رِس رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں لاش کو منتقل کیا گیا اور برف کی سلیں رکھ کر اسے صحیح و سالم رکھنے کی کوششیں کی گئیں۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ کابینہ کی کانفرنس جاری تھی اور گورنر جنرل کی غیر موجودگی میں میّت کیسے اٹھائی جاتی، آخر کار نواب زادہ کے قریبی دوست کرنل جعفر، جو

---

۱ : بحوالہ صدیق علی خان ۔ صفحہ نمبر ۴۸۲ ۔

۲ : ایضاً صفحہ نمبر ۴۸۷ ۔

Marfat.com

لیلیٰ وزارت کے مجنونوں کے تماشے دیکھ اور سن رہے تھے، نے تنگ آکر گورنمنٹ ہاؤس آخری پیغام بھیجا کہ اگر آپ لوگ فوراً نہیں آتے تو ہم میت لے کر دفن کرنے کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔" [1]

اس ساری تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وزیر اعظم کا قتل بہرحال ایک سازش کا نتیجہ تھا اور اسے فردِ واحد کا کارنامہ کہنا جسے وزیر اعظم سے کسی طرح بھی پرخاش نہیں تھی، حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔

"جب لوگوں کا غم ذرا ہلکا ہوا تو وہ سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ شہیدِ ملت کو کسی گہری سازش کے تحت قتل کیا گیا ہے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ لوگ بغیر کسی مبیّنہ شہادت کے سازشیوں کے نام بھی گنوانے لگے۔ شک و شبہ کی بناء پر بغیر کسی عینی یا کم از کم قرائنی شہادت کے کسی کو اس بیسویں صدی میں سولی پر تو نہیں چڑھایا جا سکتا لیکن اس مسلم قول کی ہمہ گیری سے بھی کوئی بالکل چشم پوشی نہیں کر سکتا جس کی رُو سے کہا گیا ہے کہ "زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔" [2]

وزیر اعظم کے قتل کے بعد جو میٹنگ مشتاق گرمانی اور غلام محمد کے درمیان راولپنڈی میں ہوئی تھی، اس میں یہ طے پایا تھا کہ غلام محمد وزیر اعظم

---

[1] : بحوالہ صدیق علی خان۔ صفحہ نمبر ۴۹۰ - ۴۹۱۔

[2] : ایضاً صفحہ نمبر ۴۹۲۔

Marfat.com

بنیں گے لیکن جب خواجہ ناظم الدین نتھیا گلی سے لوٹے تو انہوں نے تیار کردہ خاکہ بدلوا کر یہ منوا لیا کہ غلام محمد صاحب گورنر جنرل اور وُہ خود وزیر اعظم ہوں گے۔[1]

یہ کارروائی بہرحال مسلم لیگ پارٹی اور قومی اسمبلی سے بالا بالا ہو رہی تھی کیونکہ ان صاحبان کے نزدیک ان دونوں اداروں کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہ تھی۔ خواجہ صاحب کے وزارتِ عظمیٰ چُن لینے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے لیاقت علی خان جیسا باوقار اور با اختیار وزیر اعظم دیکھا تھا اور وُہ بھُول گئے کہ اختیار اور وقار کا انحصار کافی حد تک خود اپنی شخصیّت پر ہوتا ہے۔

بہرحال یہ معاملہ بذاتِ خود تحقیق طلب ہے کہ غلام محمد جو منتخب نمائندہ نہیں تھا اور نہ ہی سیاسی پس منظر رکھتا تھا، کس طرح گورنر جنرل بن گیا؟ جُوں جُوں ان معاملات کی تہہ میں جائیں، سازشیں لپٹی ہوُئی ملتی ہیں۔ انہی سازشوں نے آغاز ہی میں پاکستان میں جمہوریّت کی بنیادیں کمزور کر دیں اور بالآخر ۱۹۵۸ء میں جمہوریّت کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔

خواجہ ناظم الدین کے وزیر اعظم بننے کے بعد پاکستان مسلم لیگ کونسل کے ارکان نے متفقہ طور پر ان سے یہ التماس کی کہ وُہ مسلم لیگ کی صدارت بھی قبول کر لیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو اخباری بیان جاری کیا، اس میں یہ کہا گیا تھا کہ:

"موجُودہ حالات میں مسلم لیگ کی ذمّہ داریوں اور فرائض

---

[1]: ایضاً - صفحہ ۴۸۹

کو ایک ایسی قیادت کے تحت مربوط کرنے کی انتہائی شدید ضرورت ہے، جسے اس قومی تنظیم کے تمام عناصر کی غیر مشروط حمایت و اعتماد حاصل ہو۔ [1]

ایسی ہی درخواست کراچی اور بلوچستان کی مسلم لیگوں کی طرف سے بھی کی گئی کہ وہ اس عہدہ کو ضرور قبول کرلیں۔ [2]

۱۶ر نومبر ۱۹۵۰ء کو وہ دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے اتفاق رائے سے لیڈر چن لیے گئے اور اسی خود کار طریقے سے وہ اگلے دن ۱۷ر نومبر ۱۹۵۰ء کو پاکستان مسلم لیگ کے بھی صدر منتخب ہو گئے۔

خواجہ ناظم الدین کے انتخاب کا خیر مقدم ملک کے ہر حصہ سے کیا گیا۔ ان کے انتخاب پر عام ردِّ عمل یہ تھا کہ یہ خواجہ صاحب کے اوصاف کو بہت بڑا خراجِ تحسین ہے کہ انھوں نے قومی زندگی میں دوسری مرتبہ بہت بڑا خلا پُر کیا ہے۔ ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم کے انتقال پر انہیں پاکستان کا گورنر جنرل بنایا گیا تھا۔ قبل ازیں وہ مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ان کے انتخاب کو خاص طور پر اس لیے بہت خوشگوار قرار دیا گیا کہ وہ مسلم الثبوت وفادار ہونے کے ساتھ صحت مند اندازِ فکر کے بھی مالک ہیں۔ وہ وقار، اہلیت اور تجربے کا نمونہ تھے۔ [3]

اخبارات نے بھی ان کے انتخاب پر نیک خیالات کا اظہار کیا، اور کم و بیش تمام اخبارات نے یہ رائے ظاہر کی کہ موجودہ غیر معمولی

---

۱ : پاکستان ٹائمز لاہور ۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۵۱ء۔

۲ : ڈان کراچی ۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۵۱ء

۳ : ایضاً ۲۰ر نومبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

حالات کے نازک تقاضوں کے باعث قومی تنظیم کے صدر کے لیے پر ان کا انتخاب ناگزیر تھا۔

تحریکِ پاکستان میں نمایاں کردار ادا کرنے کے باعث ملک بھر میں خواجہ ناظم الدین کا احترام کیا جاتا تھا۔ بیشک وہ ہردلعزیز تھے لیکن ان میں اس عہدہ کے لیے ایک لازمی شرط یعنی جوشِ کردار کی کمی تھی، جس کی اس مرحلہ پر اشد ضرورت تھی۔[۱]

پاکستان مسلم لیگ کا کنونشن اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ اس کنونشن میں خواجہ ناظم الدین نے اپنے صدارتی خطاب میں اس بات پر زور دیا کہ "اتحاد" کو قومی اصول و نصب العین بنانا چاہیئے، تاکہ مسلم لیگ پاکستان کو مضبوط اور خوش حال بنانے کے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔[۲]

اگلے دن خواجہ صاحب دوبارہ مسلم لیگ کے صدر منتخب کر لیے گئے اور انھوں نے لیگ کے ارکان کو یقین دلایا کہ وہ اپنے فرائض دیانت داری، وفاداری اور غیر جانب داری سے ادا کریں گے۔ یوسف ہارون نائب صدر اور پنجاب کے چودھری صلاح الدین جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے۔[۳]

غیاث الدین پٹھان کو جوائنٹ سیکرٹری منتخب کرنے کے علاوہ کونسل نے اختر شاہ کو جوائنٹ سیکرٹری اور مخدوم الملک میراں شاہ

۱: مارننگ نیوز کراچی - ۱۸ر نومبر ۱۹۵۱ء -

۲: ڈان کراچی - ۱۱ر اکتوبر ۱۹۵۲ء -

۳: ایضاً ۱۲ر اکتوبر ۱۹۵۲ء -

Marfat.com

کو خزانچی منتخب کیا۔ اس اجلاس میں نئے منتخب صدر نے یہ تازہ نعرہ دیا:

"لیگ عوام کے لیے اور عوام لیگ کے لیے۔" [1]

ڈھاکہ کنونشن میں مسلم لیگ کے آئین میں چند ترامیم بھی کی گئیں۔ جن کے ذریعے لیگ کونسل میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے لیے مساوی نیابت کا اہتمام کیا گیا، اور ہر سال انتخاب کرانے کے بجائے تین سال کے لیے انتخاب کا طریقہ منظور کیا گیا۔ علاوہ ازیں مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد میں ترمیم کی گئی۔

آئین میں پہلی ترمیم کے ذریعے مختلف علاقوں سے لیگ کونسل کے لیے حسبِ ذیل کوٹہ مقرر کیا گیا:۔

- مشرقی پاکستان سے ۳۲۷ ارکان
- پنجاب : ۱۸۴
- قبائلی علاقے : ۵۸
- سندھ اور خیرپور : ۴۵
- بہاول پور : ۱۸
- کراچی : ۱۱

لیگ کونسل کے کل ارکان : ۶۵۴

صدر کو بہ حیثیت عہدہ ارکان میں سے دس ارکان نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا۔ [2]

نئی کونسل میں کراچی کے لیے ۱۱۔ ارکان کا کوٹہ مقرر کر کے پہلی مرتبہ

---

[1] : ڈان کراچی ۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۵۲ء ۔

[2] : ایضاً ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۲ء ۔

Marfat.com

اس کی جداگانہ صوبائی حیثیت کو تسلیم کیا گیا۔

دوسری ترمیم میں پرائمری ارکان اور عہدیداروں کی میعاد ایک سال سے بڑھا کر تین سال کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس ترمیم پر گرماگرم بحث ہوئی۔ اس ترمیم کے مخالفین کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ میعاد میں توسیع سے تنظیم بے عملی کا شکار ہو جائے گی۔ ان کے خیال میں یہ تجویز برسرِ اقتدار اصحاب کو ہمیشہ کے لیے مسلط کرنے کی کوشش تھی۔

اس ترمیم کی حمایت کرنے والوں کا خیال یہ تھا کہ اس طرح عہدیداروں کو تنظیم کے بہتر بنانے اور پروگرام پر عمل درآمد کے لیے مناسب مہلت مل جائے گی۔ ان کے خیال میں ایک سالہ میعاد میں یہ بات ممکن نہ تھی ہر سال انتخابات کرانے کا نظام ویسے بھی ناقابل عمل ثابت ہو چکا تھا۔ اس نظام پر قائد اعظم کے زمانے میں بھی شاذونادر ہی عمل ہوتا تھا ظاہر ہے کہ انتخابی عمل میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔

سابق رکن اسمبلی ابوسعید انور نے اجلاس میں یہی نقطۂ نظر اختیار کیا۔ انھوں نے کہا:

"تنظیم کا بنیادی مقصد بعض لوگوں کو چند عہدوں پر فائز کرنا نہیں بلکہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ہے۔ لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ ابھی ایک انتخاب کے مراحل مکمل نہیں ہوتے کہ آئندہ انتخاب کے لیے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔" [۱]

"جب اس ترمیم پر رائے شماری ہوئی تو ارکان

---

[۱]: ڈان کراچی۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۲ء۔

Marfat.com

نے بڑی بھاری اکثریت سے اسے منظوری عطا کر دی۔" [1]

تیسری ترمیم کو جس کا تعلق مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد میں تبدیلی سے تھا، کسی جرح و تنقید کے بغیر منظور کر لیا گیا۔ مسلم لیگ کے نئے اغراض و مقاصد حسبِ ذیل تھے :۔

(۱) پاکستان کی آزادی و سالمیّت کا دفاع و تحفّظ۔

(۲) اس امر کی ضمانت کہ :۔

ا : پاکستان میں اسلام کی تعلیمات کے مطابق جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے گا اور انھیں نافذ کیا جائے گا۔

ب : پاکستان میں انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کو قرآن و سُنّت کی روشنی میں اسلام کی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔

ج : پاکستان کے تمام شہریوں کو ملکی قانون اور اخلاقِ عامہ کے تحت بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔ ان میں قانون کے تحت مساوی سلوک، مساوی مرتبہ اور مواقع، معاشی، معاشرتی اور سیاسی انصاف، خیال و اظہار، عقیدہ و عبادت اور اجتماع و تنظیم کی آزادی کے حقوق شامل ہیں۔

د : اقلیتوں کے جائز اور قانونی مفادات کی پوری حفاظت

---

[1] : ڈان کراچی۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۲ء۔

Marfat.com

کی جائے گی ، انھیں اپنے عقیدے کے اظہار اور اس پر عمل کی آزادی حاصل ہوگی ۔

ہ : آبادی کے پس ماندہ حصّوں سے ترجیحی اور فراخدلانہ سلوک کیا جائے گا ، تاکہ وہ تعلیمی ، معاشی اور معاشرتی شعبوں میں تیزی سے ترقی کر سکیں ۔

و : عدلیہ کی آزادی اور غیر جانبداری کو برقرار رکھنے کی ضمانت دی جائے گی ۔

ز : قوم کی اخلاقی ، مادی ، معاشرتی ، معاشی اور ثقافتی زندگی کی ترقی کے لیے اقدامات کیے جائیں گے ، تاکہ پاکستان کے عوام کو اقوامِ عالم میں اپنا جائز اور باعزت مرتبہ حاصل ہو سکے اور وہ امن و صلح ، خوشحالی اور انسانی ترقی میں کما حقہٗ حصّہ لے سکیں ۔

ح : دنیا کی دوسری امن پسند اقوام کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا قیام و اہتمام ، خاص طور پر دوسرے مسلم ملکوں کے ساتھ برادرانہ روابط کا استحکام ۔

ط : دنیا بھر میں امن و صلح ، آزادی و حریت ، عدل و انصاف اور جمہوریت کے مقاصد کو فروغ دیا جائے گا ، اور ان مقاصد کے حصول و فروغ کے لیے وقتاً فوقتاً عملی قدم بھی اٹھائے جائیں گے ۔[1]

خواجہ ناظم الدین نے بڑے نامساعد موقع پر قوم کی راہنمائی کی

---

[1] : ڈان کراچی ۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء (اس پروگرام میں معاشی حالت کو بہتر بنانے کا کوئی ذکر نہیں تھا اور نہ ہی بنیادی مسائل حل کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا)

ذمہ داری سنبھالی تھی ۔ آئینی اور اقتصادی آندھیوں کے آثار لیاقت علی خان کے زمانے میں ہی دکھائی دینے لگے تھے ، لیکن اب وُہ سیاہ بادلوں کا رُوپ دھار کر ملک کے افق پر چھا رہے تھے۔ ان کے وزارتِ عظمٰی کے منصب پر فائز ہونے کے چند ہی ماہ بعد یہ تاثر اُبھرنے لگا تھا کہ خواجہ صاحب انتظامی صلاحیتوں سے عاری ہیں اور بروقت فیصلے نہیں کیے جا رہے ۔ اس لیے قومی معاملات میں انحراف خطرناک صُورت اختیار کر گیا ہے ۔ حکومت سے بڑھتی ہوئی بیزاری سے مسلم لیگ کو بھی بطور تنظیم گزند پہنچا۔

خواجہ صاحب کی کمزور شخصیت سے غلام محمد نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ سازشیں اتنی شدّت اختیار کر گئیں کہ ان سے مسلم لیگ کو جس کا وقار پہلے ہی رو بہ زوال تھا ، سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ سندھ ، پنجاب اور سرحد میں خواجہ ناظم الدین کو بڑے سنگین مسائل سے دوچار ہونا پڑا اور وہ ان مسائل سے مؤثر طور پر عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہے۔

قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ایک قابلِ قبول آئین کے لیے کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔

لیاقت علی خان نے بھی اس ضمن میں کوشش کی لیکن وُہ آئین کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

خواجہ ناظم الدین کو بھی اسی تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ آئینی بحران دروازے پر دستک دے رہا تھا ۔ لیکن کسی بھی سیاسی راہنما میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ ملک کو اس بحران سے نکال سکتا۔

اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ :

Marfat.com

"آئین کی ترتیب و تدوین کے کام نے ایسی وقتی مصلحتوں کا روپ دھار لیا تھا جن میں شریک افراد موقع ملتے ہی ان سے بے تعلق ہو جاتے تھے۔" [۱]

خواجہ ناظم الدین نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ مرتب کرانے اور اسے دستور ساز اسمبلی میں پیش کرنے کے لیے بڑی محنت کی۔ توقع یہ تھی کہ کمیٹی نے جو فارمولا وضع کیا ہے۔ وہ آبادی کے تمام حصّوں کے لیے قابلِ قبول ہوگا لیکن مسلم لیگ ہی کے زیر اہتمام بعض مقامات مثلاً: لاہور، چٹاگانگ میں جن مذاکروں کا انتظام کیا گیا ان میں بھی اس رپورٹ کو شدید جرح و تنقید کا ہدف بنایا گیا۔ [۲]

اس رپورٹ کی مساوی نمائندگی (Parity) کی تجویز نے مسلم لیگ کے اندر ایک سلسلۂ نزاعات شروع کر دیا جس نے آئینی انتشار کو اور بڑھا دیا۔

اس کے بعد اینٹی قادیانی تحریک شروع ہوگئی، جسے تحفظِ ختمِ نبوّت تحریک بھی کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد اسلام کی برادری سے احمدیوں کا اخراج تھا۔ اس تحریک کے نتیجے کے طور پر مغربی پاکستان کے کئی شہروں میں امن و امان کی حالت ابتر ہوگئی، لیکن سب سے زیادہ خراب صورتِ حال لاہور میں تھی۔ ملک کے ہر حصّے

۱: Constitutional Development in Pakistan
از۔ جی ڈبلیو چودھری (مطبوعہ پاکستان شاخ لانگ مین گرین اینڈ کمپنی ۱۹۵۹ء) صفحہ ۱۳۶۔

۲: ڈان کراچی۔ ۱۱۔۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء۔

Marfat.com

سے فرقہ وارانہ کشیدگی کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ لاہور میں تو حالات اس قدر بگڑ گئے کہ انہیں معمول پر لانے کے لئے ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو مارشل لار نافذ کرنا پڑا۔

میاں ممتاز دولتانہ وزیر اعلےٰ پنجاب بُنیادی اصُولوں کی کمیٹی کے رُکن تھے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ دسمبر ۱۹۵۲ء میں پیش کی جس کا بنیادی اصول Parity تھا۔

دولتانہ صاحب کا دعوےٰ تھا کہ انھوں نے اس رپورٹ پر اختلافی نوٹ کے ساتھ دستخط کیے تھے کیونکہ ان کے خیال میں اس رپورٹ کے بنیادی اصول یکساں نمائندگی سے پنجاب کو نقصان پہنچتا ہے۔ دُوسری طرف وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کہتے تھے کہ دولتانہ نے اس رپورٹ کو پوری طرح قبول کر لیا ہے[1]

بہرحال اس سے دولتانہ صاحب اور خواجہ صاحب کے درمیان ٹھن گئی۔ چنانچہ دولتانہ صاحب خواجہ صاحب کو وزارتِ عظمیٰ سے ہٹانے کی ترکیبیں سوچنے لگے تاکہ خود قبضہ کر سکیں۔ دوم ان کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح پنجاب کو یکساں نمائندگی کے اصُول سے

---

[1]: Report of the Court of Inquiry Constituted under Punjab Act II of 1954, to Enquire into the Punjab Disturbances of 1953, Govt. Printing Press, Lahore, 1954, Pages 285-286.

Marfat.com

نجات دلائی جائے۔

چنانچہ دولتانہ صاحب نے اینٹی قادیانی تحریک کو غنیمت جانا اور اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اِس تحریک کو احرار نے جنم دیا، علماء نے پروان چڑھایا، خواجہ ناظم الدین کے مذہبی جھکاؤ، کاہلی، علماء سے خوف اور نا اہلی نے پھلنے پھُولنے کا موقع بہم پہنچایا اور جب اس تحریک کی لگائی ہوئی آگ بھڑک اٹھی تو دولتانہ نے اس کا رُخ مرکزی حکومت کی طرف پھیر دیا۔ ؎

حتّٰی کہ اس آگ نے جہاں خواجہ صاحب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، وہاں دولتانہ صاحب کا "سیاسی" آشیاں بھی جلا کر راکھ کر دیا۔ غلام محمد نے سیاسی راہنماؤں کے نفاق سے فائدہ اٹھا کر خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا اور اپنی حیثیت مزید مستحکم کر لی۔ اس ایجی ٹیشن نے وزیرِ اعظم کی کمزور انتظامیہ کو بے نقاب کر دیا، جس سے ان کی ساکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔

عوامی حلقوں میں یہ تاثر عام تھا کہ :

خواجہ ناظم الدین علماء کے ایک حلقے کی سرپرستی کرتے تھے اور یہ سرپرستی ہی اینٹی قادیانی تحریک کے راہنماؤں کی حوصلہ افزائی کا

؎ : ایضاً۔

Marfat.com

باعث بن رہی تھی۔ ؎۱

بہرحال اینٹی قادیانی تحریک کے دوران میں خونریز واقعات کی وجہ سے آئینی بحران کو ثانوی اہمیت حاصل ہوگئی لیکن اس تحریک کے طوفان نے خود خواجہ صاحب اور ان کی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

اس دوران میں خوراک کی صورتِ حال بھی بڑی خراب ہوچکی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ الزام عاید کیا جاتا تھا کہ موجودہ اقتصادی بحران منصوبہ بندی کے فقدان اور ترقی پسندانہ اقتصادی پالیسیوں سے انحراف کا نتیجہ ہے۔

"یہ سنگین غلطی وزیر اعظم کے ایک رفیق کار پیرزادہ عبدالستار کی ہے جنھوں نے خوراک کی صورتِ حال کا ستیاناس کر دیا ہے۔" ؎۲

خوراک کی قلّت کے مسئلے کے بارے میں عام تاثر یہی تھا جو کافی حدتک درست بھی ہے کہ حکومت کی پالیسی میں غیر یقینی اور بے عملی نے خوراک کی صورتِ حال ابتر بنا دی تھی۔

"دوسری طرف اقتصادی بحران کو مناسب طریقے سے دُور کرنے کے لیے بصیرت اور جرأت سے کام لینے کے بجائے حکومت کی نااہلی اور بے عملی کو پردہ پوشی کے لیے استعمال کیا جارہا تھا اور مُلک جس

؎۱ : زیڈ اے سلیری Pakistan's Lost Years
کراچی - صفحہ نمبر ۴۷ -

؎۲ : سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور - ۱۹ر اپریل ۱۹۵۳ء -

Marfat.com

خطرناک مرض کے چنگل میں گرفتار تھا اس سے بچنے کے لیے واضح پالیسی وضع کرنے اور اس پر عملدر آمد سے پہلو تہی کی جاتی رہی ہے۔" لہ

ان وجوہ کے علاوہ ایک وجہ ذاتی بھی تھی :-

لہ : پاکستان ٹائمز لاہور - ۱۲ر اپریل ۱۹۵۳ء -

(نوٹ : خواجہ صاحب کی سادگی اور بے عملی کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ گندم کے لیے امریکہ پر آس لگائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ ان کی حکومت ملکی ذرائع استعمال کرنے کے خیال سے غافل تھی۔ دُوسری طرف اینٹی قادیانی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور علماء نے وزیر خارجہ ظفراللہ خان کی برطرفی کا مطالبہ زور و شور سے کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن خواجہ صاحب ظفراللہ خان کو اس خوف سے کچھ نہیں کہتے تھے کہ اگر انھیں برطرف کر دیا گیا تو امریکہ گندم دینے سے انکار کر دے گا۔ بحوالہ انکوائری کورٹ کی رپورٹ بہ سلسلہ پنجاب کے ہنگامے (منیر رپورٹ) ۱۹۵۳ء صفحہ نمبر ۲۹۶)

اس سے حکومتِ پاکستان کی مجبوری اور بے بسی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور غیر ملکی امداد کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے گندم حاصل کرنے کے لیے اینٹی قادیانی تحریک سے چشم پوشی کی لیکن جب وُہ گندم کراچی کے ساحل پر اُتری، خواجہ صاحب وزارتِ عظمٰی کا بستر لپیٹ چکے تھے۔ مملکتِ خداداد پاکستان کے حکمران اور حکمرانی کے خواب دیکھنے والے اس سے عبرت حاصل کریں۔

Marfat.com

"عہدہ سنبھالتے ہی غلام محمد اور خواجہ ناظم الدین میں اقتدار اور اختیارات کی گتھم گتھا شروع ہوگئی اور اس وقت تک رسہ کشی جاری رہی جب تک غلام محمد نے خواجہ صاحب کی موٹر کار اور رہائش گاہ سے پاکستانی پرچم اور جھنڈی نہ اتروالی، ٹیلیفون نہ کٹوا دیا اور ان کو نظر بند نہ کر دیا۔" ؎۱

اس رسہ کشی کی وجہ یہ تھی کہ غلام محمد بحیثیت گورنر جنرل ان تمام اختیارات کو تنہا استعمال کرنا چاہتے تھے۔ جو قوم نے قائد اعظم کو دیے تھے۔ دوسری طرف خواجہ صاحب لیاقت علی خان کا سا وقار اور اختیار چاہتے تھے۔ غلام محمد کو نمائشی گورنر بننا گوارا نہ تھا چنانچہ اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوگئی۔ اس رسہ کشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب خواجہ صاحب دولت مشترکہ کی کانفرنس پر لندن گئے تو انھوں نے آئین کے تحت ملکہ انگلستان سے غلام محمد کی برخواستگی کی پُرزور سفارش کی۔ ملکہ نے اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس واقعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے سیاسی آقاؤں کو کس طرح حکومتِ برطانیہ کی اشیرباد حاصل رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کبھی برطانیہ اور کبھی امریکہ کے وفادار ہم پر حاکم رہے ہیں۔ بہرحال جب یہ خبر گورنر جنرل کو پہنچی تو وہ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگے۔ غلام محمد نے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے آئین کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ؎۲

؎۱ : بحوالہ صدیق علی خان۔ صفحہ نمبر ۴۹۷۔

؎۲ : ایضاً صفحہ نمبر ۴۹۸۔

گورنر جنرل غلام محمد نے جب ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین کو وزارتِ عظمٰی کے منصب سے برطرف کیا تو اس کے پس منظر میں یہ تمام عوامل اور محرکات کارفرما تھے۔ اس ضمن میں گورنر جنرل کی طرف سے جو فرمان جاری ہُوا۔ اس میں یہ کہا گیا تھا :

"مَیں بہ امر مجبوری اس نتیجہ پر پہنچا ہُوں کہ مُلک کو جو مشکلات درپیش ہیں، خواجہ ناظم الدین کی کابینہ ان کا مقابلہ کرنے میں یکسر ناکام رہی ہے۔" [۱]

خواجہ ناظم الدین اکثریتی پارٹی کے رہنما تھے۔ گورنر جنرل غلام محمد نے انھیں برطرف کر کے ایک انتہائی غیر جمہوری قدم اٹھایا تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگوں نے اس اقدام کو جائز ثابت کرنے کی کوشش میں یہ تک کہا کہ گورنر جنرل کی یہ کارروائی دفعہ ۱۰ اکے

---

[۱]: ڈان کراچی ۔ ۱۸ اپریل ۱۹۵۳ء ۔

(نوٹ :۔ اس رائے کے حق میں کوئی دستاویزی ثبوت تو موجود نہیں ۔ تاہم پاکستان میں سیاسی حلقوں کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ خواجہ ناظم الدین کے خلاف اس اقدام کے لیے راہ اینٹی قادیانی تحریک اور گندم کے قحط نے ہموار کی تاہم پس پردہ گندم دینے والے مُلک کا ہاتھ بھی کارفرما تھا اور اس کے ایماء پر محمد علی بوگرہ کو خواجہ صاحب کا جانشین چنا گیا۔ بوگرہ صاحب نے حقِ وفاداری ادا کرنے کے لیے ملک کو دفاعی معاہدوں میں جھونک دیا۔

الفاظ و معانی سے ہم آہنگ تھی۔ [1]

ملک کے تمام غیر جانب دار مبصرین نے اسے قابلِ اعتراض اور غیر جمہوری فیصلہ قرار دیا۔ اس لیے کہ وزیرِ اعظم اکثریتی پارٹی کا لیڈر تھا اور اسے قوم کا بھی اعتماد حاصل تھا۔ اسے ایک ایسے گورنر جنرل نے برطرف کیا جو عوام کا نمائندہ نہیں تھا اس لیے گورنر جنرل کے اس اقدام کو جائز اور مبنی بر انصاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک امر اہلِ سیاست کی ذہنیت اور رویّہ تھا۔ جب تک خواجہ ناظم الدین برسرِ اقتدار رہے، دستور ساز اسمبلی کے ارکان انھیں پوری حمایت و تائید کا پُر زور یقین دلاتے رہے۔ [2] ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا رہا۔ ان کے اعزاز میں تقاریب منعقد کی گئیں۔ پنجاب، سرحد، سندھ اور بنگال کی صوبائی مسلم لیگیوں نے انہیں سپاسنامے پیش کیے لیکن جُونہی وُہ وزارتِ عظمیٰ سے علیحدہ کیے گئے، انہی اداروں نے انھیں ہدفِ مذمّت بنانے کے لیے قرار دادیں منظور کیں۔ [3] گویا جب تک وُہ برسرِ اقتدار تھے قائدِ ملّت تھے، لیکن اقتدار سے محرُومی نے انھیں قائدِ قلّت بنا دیا۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ برسرِ اقتدار فرد کی خوشامد اور محرومِ اقتدار

---

[1]: بحوالہ زیڈ۔ اے سلیری۔ صفحہ ۷۔ (سلیری صاحب اس اقدام کو دستور کے منافی نہیں سمجھتے)۔

[2]: ڈان کراچی۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء۔

[3]: نوائے وقت۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۳ء۔

Marfat.com

کی مذمت کی جو قابلِ نفرت روایت خواجہ ناظم الدین کی غیر جمہوری برطرفی سے شروع ہوئی وہ ہمارے سیاسی کردار کا ایک مستقل حصّہ بن چکی ہے اور ہمارے قومی کردار کی پستی کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی گورنر جنرل نے جب ایک سال بعد ایک مرتبہ پھر غیر جمہوری اقدام کیا اور دستور ساز اسمبلی توڑ دی تو ایسے ہی افسوسناک رویے کا اعادہ کیا گیا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

گورنر جنرل نے امریکہ میں متعیّن سفیرِ پاکستان محمد علی بوگرہ کو خواجہ ناظم الدین کی جگہ وزیر اعظم نامزد کیا اور مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے بلا چوں وچرا جھٹ سے انھیں اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔[۱] اس کے بعد "وفادار لیگیوں" نے خواجہ

۱: ڈان کراچی ۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۳ء (نوٹ: یہ بات مسلم لیگ کے پارلیمانی لیڈروں کی انتہائی پستی اور کمزوری کی دلیل تھی اور لیڈر شپ کے قحط کا بھی ثبوت تھی کہ قوم کے منتخب نمائندوں کے بجائے ملک کے نامزد گورنر جنرل نے قوم کا لیڈر (وزیر اعظم) نامزد کیا اور مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے اسے اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ حالانکہ وزیر اعظم کا انتخاب غلام محمد کے سازشی ذہن کا شاہکار تھا اور گندم کے عطیہ کا تحفہ بھی اور یہ صورتِ حال کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھی۔ اگر مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے ارکان کچھ دم خم کا مظاہرہ کرتے تو شاید غلام محمد کو قوم کی تقدیر سے یوں کھیلنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ غلام محمد کے اس اقدام سے مشرقی پاکستان میں بڑا ناخوشگوار ردِّ عمل ہوا اور وہاں علیحدگی پسند لیڈروں کو یہ پراپیگنڈہ کرنے کا موقع مل گیا کہ پنجاب مشرقی پاکستان سے نفرت کرتا ہے اور اسے اپنی Colony سمجھتا ہے۔ اگرچہ محمد علی بوگرہ بھی مشرقی پاکستان سے تھے لیکن وہ وہاں کے منتخب نمائندہ نہیں تھے۔ اس لیے انھیں سیاسی حمایت حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے عوام انھیں اپنا نہیں بلکہ امریکہ کا نمائندہ سمجھتے تھے۔

Marfat.com

ناظم الدین کو مسلم لیگ کی صدارت سے ہٹانے کی مہم شروع کر دی۔ وہ نئے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ پر زور دینے لگے کہ :

> وہ ملک کی وزارتِ عظمیٰ کے ساتھ حکمران پارٹی مسلم لیگ کی قیادت بھی سنبھال لیں۔

محمد علی بوگرہ کے حق میں انہی دلائل کا اعادہ کیا گیا جن کا اس سے قبل خواجہ ناظم الدین کی حمایت میں انبار لگایا گیا تھا۔

یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ :

> دونوں عہدوں کو یک جا کرنے سے مسلم لیگ کی تنظیم میں نئی روح اور جان پڑ جائے گی۔[1]

مسلم لیگ کے زوال اور مقبولیت میں روز بروز کمی کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ :

> عوام سے اس کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا اور اس کا ربط و تعلق خاص الخواص کے اونچے حلقوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ بہ حیثیت سیاسی جماعت، مسلم لیگ بے حد کمزور ہو چکی تھی اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ گورنر جنرل مسلم لیگ کے صدر نامزد کرتا تھا اور عوام کے نمائندے انھیں بخوشی قبول کرتے تھے۔ اب جن دو عہدوں کو یک جا کرنے پر زور دیا جا رہا تھا، اس کا تجربہ تو لیاقت علی خان کے زمانے سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ محمد علی بوگرہ کی قیادت بھی اس وقت تک مسلم لیگ کے لیے بہتر اور مفید ثابت

---

[1] : روزنامہ "نوائے وقت" لاہور - ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۳ء۔

Marfat.com

نہیں ہو سکتی تھی، جب تک تنظیم پر عوام کا اعتماد بحال نہ کیا جاتا۔ اس کے لیے راہنماؤں اور کارکنوں کی طرف سے بے لوث شبانہ روز محنت کی ضرورت تھی، لیکن حالت یہ تھی کہ سیاسی راہنما ملک کو اپنی میراث سمجھنے لگے تھے اور ان کی ساری تگ و دو کرسیوں کے حصول اور تحفظ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کارکن ان کی تقلید کر رہے تھے یا اس کھیل سے بے زار ہو کر سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ نتیجے کے طور پر نظریۂ پاکستان کی روشنی مدھم پڑنے لگی اور عوام مایوسی کا شکار ہونے لگے ان حالات میں وزارت اور لیگ کی قیادت کو یکجا کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

خواجہ ناظم الدین کی جگہ محمد علی بوگرہ کو پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب کرانے کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں، تو مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی اور جماعتی تنظیم میں پہلے سے موجود کش مکش نے سیاسی فضا میں کشیدگی پیدا کر دی۔

لیکن خواجہ ناظم الدین نے اس مرحلے میں اپنی بے غرضی کا مظاہرہ کیا اور عہدے سے چمٹے رہنے کے بجائے مسلم لیگ کی صدارت سے از خود استعفیٰ دے دیا۔

ان کی خواہش یہ تھی کہ:

حکومت اور جماعت کے درمیان تعلقات کشیدہ نہیں رہنے چاہئیں۔ مستعفی ہونے کے ساتھ اُنھوں نے

Marfat.com

عملی سیاسیات سے بھی سبکدوش ہونے کا اعلان کر دیا۔[1]
یہ ایک طرح سے ملکی سیاست سے مایوسی کا اظہار تھا۔
خواجہ ناظم الدین کے مستعفی ہونے سے مسلم لیگ کے نئے صدر کے انتخاب کی ضرورت پیدا ہوئی تو اکتوبر ۱۹۵۳ء میں لیگ کونسل کا اجلاس

---

[1]: نورالامین صاحب اس زمانے میں مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ انھوں نے راقم کو یہ بتایا کہ خواجہ صاحب کی معطلی کا مشرقی پاکستان میں سخت ردِّ عمل ہُوا تھا اور وہاں عوام نے اسے اپنے خلاف سازش قرار دیا تھا۔

انھوں نے مزید بتایا کہ یہ خبر سُن کر وُہ خود کراچی پہنچے تو گورنر جنرل کا نمائندہ انھیں لینے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھا لیکن انھوں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور سیدھے خواجہ صاحب کے پاس چلے گئے۔ کیونکہ وُہ اس غیر جمہوری اقدام کے خلاف تحریک چلانا چاہتے تھے لیکن خواجہ صاحب نے منع کر دیا کہ میری وجہ سے ملک میں کشیدگی پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔

بعد ازاں نورالامین نے ایک اخباری انٹرویو میں یہ انکشاف کیا کہ گورنر جنرل نے یہ اقدام کمانڈر انچیف کی مدد اور مرضی سے کیا تھا اور خواجہ صاحب کو یہ خدشہ تھا کہ اگر اس فیصلے کے خلاف کوئی تحریک چلائی گئی یا مسلم لیگ پارٹی نے کسی ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا تو پھر فوج کی مدد سے گورنر جنرل ملک میں مارشل لاء نافذ کر دے گا اور اس طرح جمہوریّت کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

روزنامہ "مشرق" لاہور - ۱۵ اپریل ۱۹۷۳ء

Marfat.com

کراچی میں ہُوا اور محمد علی بوگرہ کو صدر منتخب کر لیا گیا۔
ان کا مقابلہ قاضی محمد عیسےٰ (بلوچستان) نے کیا۔ وہ وزارتِ
عظمیٰ اور صدارت کے عہدوں کو یکجا کرنے کے تصوّر
کے مخالف تھے۔ قاضی محمد عیسےٰ نے صرف اس اصُول کی
حمایت کی خاطر انتخاب میں حصّہ لیا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ
"خواہ مجھے ایک ہی ووٹ کیوں نہ ملے، میں انتخاب
لڑوں گا۔" [1] انتخابی نتائج سے معلوم ہُوا کہ ان کے
حق میں ۳۶ ووٹ ڈالے گئے تھے۔ کونسل کے اجلاس میں
حاضرین کی کل تعداد ۲۵۸ تھی۔ [2]

محمد علی بوگرہ کو صدر منتخب کرنے کے بعد مسلم لیگ کونسل نے چند قرار دادیں منظور کیں جن میں آئینی مصالحت کے فارمُولا کی توثیق کرنے کے علاوہ لیگ اسمبلی پارٹی کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ آئین سازی کا کام حتی الوسع جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ کونسل نے حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ لیاقت علی خان کے سانحۂ قتل کی تحقیقات کے لیے جو کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس کی رپورٹ شائع کی جائے۔ [3] لیکن وزارتِ عظمیٰ اور لیگ کی صدارت کو یکجا کرنے کے بعد کونسل کی قرار دادوں کو وُہ اہمیّت اور حیثیت حاصل نہیں رہی تھی جو اس سے پہلے کے زمانے کا معمُول تھی۔ وُہ زمانہ گذر چکا تھا جب لیگ کونسل کی قرار دادیں

---

[1]: روزنامہ "ڈان" کراچی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۳ء۔

[2]: ایضاً ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۳ء۔

[3]: ایضاً

حکومت کے لیے لائحہ عمل متعیّن کرتی تھیں۔ اب تو یہ ساری کارروائی محض رسم پوری کرنے کے لیے کی جاتی تھی ورنہ نہ تو کونسل میں کوئی دم خم باقی رہ گیا تھا اور نہ ہی وزراء کو اس سے کوئی دلچسپی تھی۔

پاکستان مسلم لیگ کے صدر کے طور پر محمد علی بوگرہ کا آغاز بہت خوش گوار تھا۔ انھوں نے ان تمام اصحاب کو مسلم لیگ میں واپس آنے کی دعوت دی جو اس سے الگ ہو چکے تھے تاکہ اسے ایک مرتبہ پھر ہر دلعزیز اور متحرک تنظیم بنایا جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ:۔ "وُہ ماضی کی تلخیوں کو بھول جائیں اور مُسلم لیگ کی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کام کریں۔" [1]

ان کی اس اپیل کا گرم جوشی سے جواب بھی دیا گیا اور کئی پُرانے مسلم لیگی جو جماعت سے دل برداشتہ ہو کر علیحدہ یا گوشہ نشین ہو گئے تھے، دوبارہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ان میں خان افتخار حسین ممدوٹ اور پیر الٰہی بخش جیسے ممتاز اصحاب شامل تھے۔

صدر منتخب ہونے کے بعد محمد علی بوگرہ نے ورکنگ کمیٹی کے ارکان نامزد کیے۔ کمیٹی ۱۵ ارکان پر مشتمل تھی، جن میں حسب ذیل اصحاب بھی شامل تھے:۔

---

[1]: ڈان کراچی۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء۔

(۱) سردار عبدالرب نشتر (۲) خواجہ حبیب اللہ

(۳) عزیز الدین (۴) بیگم شاہ نواز (۵) یوسف ہارُون

(۶) ایم۔ این قزلباش (۷) اے۔ کے۔ بروہی۔

اس سے قبل ۸ ارکان پر مشتمل نامزد ورکنگ کمیٹی نے سندھ اور پنجاب کی مسلم لیگوں کو توڑ دیا تھا۔ اس اقدام پر بڑی بے اطمینانی ظاہر کی جارہی تھی۔ چنانچہ نئے صدر نے یہ فیصلہ کیا کہ نامکمل ورکنگ کمیٹی کے اس حکم پر اس وقت تک عمل درآمد نہیں ہوگا، جب تک مکمل ورکنگ کمیٹی اس کی توثیق نہ کر دے۔[۱]

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی تک پہنچانے والی ایک بنیادی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ وُہ ملک کے لیے آئین مرتب کرنے میں ناکام رہے تھے۔ چنانچہ محمد علی بوگرہ نے اس مسئلے کی طرف پُوری توجہ کی۔ ان کی وزارتِ عظمٰی کے زمانے میں ملک کو اسلامی جمہوریہ پاکستان قرار دینے کا فیصلہ کیا گیا۔[۲] اور آئین کے بنیادی اصولوں کو بھی منظور کر لیا گیا۔[۳] اس کے بعد یہ توقع کی جاتی تھی کہ آئین کی ترتیب و تدوین کا کام بہت جلد مکمل ہو جائے گا اور محمد علی بوگرہ نے خود بھی یہ اعلان کیا کہ نئے آئین کا نفاذ بابائے قوم کے یومِ ولادت ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء پر عمل میں لایا جائے گا۔ لیکن اس اعلان پر عمل درآمد نہ ہوسکا کیوں کہ

---

۱ : پاکستان ٹائمز لاہور، ۶ جنوری ۱۹۵۴ء۔

۲ : ڈان کراچی۔ ۳ نومبر ۱۹۵۳ء۔

۳ : ایضاً ۱۳ نومبر ۱۹۵۳ء۔

Marfat.com

گورنر جنرل نے اس تاریخ سے پہلے ہی دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔

مسلم لیگی لیڈر اپنے روشن مستقبل کے بارے میں ایک نئے اعتماد سے سرشار ہو رہے تھے کہ عوام میں اس جماعت کے غیر مقبول ہو جانے کا ٹھوس ثبوت اوائل ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات کے نتائج کی صورت میں سامنے آ گیا جن میں مسلم لیگ کو شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا۔

قیامِ پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد سے مشرقی پاکستان کی باگ ڈور نورالامین کے ہاتھ میں چلی آتی تھی۔ ان کی قیادت میں مسلم لیگ ایک سراسر غیر مؤثر تنظیم بن کر رہ گئی تھی اور اس کے پاس کوئی مثبت پروگرام نہیں رہا تھا۔

مشرقی پاکستان میں عام تاثر یہ تھا کہ مسلم لیگ اب کوئی مفید کام نہیں کر سکتی اور اب یہ اپنی افادیت کھو چکی ہے۔

نورالامین اور ان کے ساتھیوں نے نہ صرف لیگ کو سازشوں کی آماجگاہ بنا دیا تھا بلکہ انھوں نے جمہوری تقاضوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ تھا کہ ان کے پانچ سالہ دورِ اقتدار میں صوبائی اسمبلی کی ۳۰ سے زائد نشستیں خالی ہوئی تھیں۔ لیکن انھوں نے کسی ایک حلقہ میں بھی ضمنی انتخاب نہیں ہونے دیا تھا۔

دوسری طرف مسلم لیگ کے خلاف صف آرا متحدہ محاذ کے لیڈروں کا نہ صرف عام لوگوں سے وسیع رابطہ تھا، بلکہ انھوں نے عوام کے سامنے جو پروگرام پیش کیا اس میں مغربی پاکستان کے استحصال اور مشرقی پاکستان کی محرومی کے متعلق ہر قسم کی جھوٹی سچی باتوں

Marfat.com

کے علاوہ مکمل صوبائی خود مختاری کا نعرہ بھی شامل تھا۔ متحدہ محاذ کی کامیابی کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے لوگ مسلم لیگ سے مایوس ہو چکے تھے۔

مسلم لیگ کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنے کے لیے بابائے پاکستان کی بہن مس فاطمہ جناح سے بھی مشرقی پاکستان کا انتخابی دورہ کرایا گیا۔ صوبے میں ہر جگہ عام لوگوں نے بڑے احترام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا لیکن مسلم لیگ کے بارے میں عام لوگوں کے دلوں میں جو شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے وہ مس فاطمہ جناح کے دورے سے بھی دور نہ ہو سکے۔ ان کے انتخابی جلسوں میں عوام بڑی کثیر تعداد میں شریک ہوئے اور وہ اس توقع کے ساتھ مشرقی پاکستان سے رخصت ہوئیں کہ عوام ایک مرتبہ پھر مسلم لیگ کا ساتھ دیں گے۔[۱] لیکن جب انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو ہر شخص یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ۳۰۹ میں سے مسلم لیگ نے صرف ۹ نشستیں حاصل کی تھیں۔[۲]

مسلم لیگ جو اب تک پاکستان میں واحد حکمران جماعت تھی، مشرقی پاکستان میں اب اس کا وجود ایک باضابطہ گروپ کے طور پر بھی باقی نہیں رہا تھا۔ آبادی کے لحاظ سے مشرقی پاکستان کی اسمبلی ملک بھر کے ۵۶ فیصد لوگوں کی نمائندہ تھی۔ اسمبلی کے قواعد کے تحت ایک باضابطہ گروپ کی تشکیل کے لیے کم از کم دس ارکان کی حمایت و تائید لازمی تھی۔[۳] بعد میں

---

۱ : ڈان کراچی - ۸ / مارچ ۱۹۵۴ء -

۲ : پاکستان ٹائمز - ۲۷ / مارچ ۱۹۵۴ء -

۳ : ایضاً

Marfat.com

اسمبلی کے ایک آزاد رُکن کے مسلم لیگ میں شامل ہونے سے اسمبلی میں اس کی تعداد دس تک پہنچ گئی جب کہ متحدہ محاذ نے ۲۲۳ نشستیں جیتی تھیں۔[۱]

روزنامہ "ڈان" کراچی نے مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست فاش کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا۔

"مسلم لیگ ایک جماعت کا نام نہیں تھا، بلکہ یہ ایک نظریے کا نام تھا لیکن پچھلے چند برسوں میں مسلم لیگ محض ایک پارٹی تک محدود ہوگئی ہے اور دوسری پارٹیاں اسے چیلنج کرنے کے لیے اُبھر آئی ہیں — یہ صورتِ حال اساسی نظریات پر اختلاف کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ذاتی اور گروہی رقابتوں اور حسد کا کیا دھرا ہے۔"[۲]

مشرقی پاکستان میں انتخابی کامیابی کے بعد متحدہ محاذ کے لیڈر سہروردی اور فضل الحق یہ مطالبہ کرنے لگے تھے کہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا جائے۔

انھوں نے بار بار یہ اعلان کیا کہ اس دستور ساز اسمبلی کا مرتبہ آئین مشرقی پاکستان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ کیونکہ اب اس کی نمائندہ حیثیت متنازعہ فیہ ہوگئی ہے۔[۳]

---

۱ : پاکستان ٹائمز - ۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء (وہ آزاد رُکن چودھری فضل القادر تھے)۔

۲ : ڈان - کراچی - ۱۸ مارچ ۱۹۵۴ء۔

۳ : ایضاً

Marfat.com

محمد علی بوگرہ نے اس کے جواب میں یہ دعوے کیا کہ مشرقی پاکستان کے انتخابی نتائج دستور ساز اسمبلی پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے متعلق متحدہ محاذ کا مطالبہ اپنی جگہ بے جواز نہیں تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کے ہار جانے کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ مرکزی حکومت کو تبدیل اور دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا جائے۔ دستور ساز اسمبلی کے مرتبہ آئین کو ناقابلِ قبول قرار دینے کے سلسلے میں ان کا مطالبہ منفی نقطۂ نظر پر مبنی تھا۔ اگر سہروردی اور فضل الحق کے پاس آئین سازی کا کوئی بہتر فارمولا تھا جو تمام دوسرے صوبوں کے لیے بھی قابلِ قبول ہوتا تو انھیں چاہیئے تھا کہ دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا مطالبہ کرنے کے بجائے اس فارمولے کو منظرِ عام پر لاتے، لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ تھے۔

قومی قیادت (وزارتِ عظمیٰ اور لیگ کی صدارت) کے یکجا ہونے کے بعد بھی مسلم لیگ کی صفوں میں اس کے خلاف تحریک جاری رہی۔

مخالفین کا استدلال یہ تھا کہ وزیر اعظم بے پناہ مصروف آدمی ہوتا ہے اور مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے مناسب توجہ اور وقت نہیں دے سکتا۔ لیگ کو ایک ایسے ہمہ وقتی صدر کی ضرورت ہے جو جماعت کے لیے سارا وقت اور اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر سکے۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست نے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی اور مسلم لیگ کے بہت سے کارکنوں نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ مسلم لیگ کی صدارت اور ملک کی وزارتِ عظمیٰ کے

Marfat.com

عہدوں کو علیحدہ کردیا جائے۔ انھوں نے مسلم لیگ کو از سرِ نو مستحکم بنانے کا بھی مطالبہ کیا، تاکہ دُوسرے صُوبوں میں اسے مشرقی پاکستان کے سے حشر سے بچایا جاسکے۔ چنانچہ مسلم لیگ کے بعض حلقوں کی طرف سے صدارت کے لیے مس فاطمہ جناح کا نام تجویز کیا گیا۔

ان کی دلیل یہ تھی کہ وُہ اب بھی پاکستان کے تمام حصّوں میں مقبول ترین شخصیّت ہیں اور وُہ مسلم لیگ کو دوبارہ ایک عوامی تحریک بنانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ کیونکہ تنظیم کا زیادہ تر انحصار قیادت پر ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کی آئندہ کنونشن اکتوبر ۱۹۵۴ء میں منعقد کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اس اثناء میں پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے پنجاب کے ارکان کو یہ اختیار دیا کہ وہ مسلم لیگ کی صدارت کے لیے مس فاطمہ جناح کے اتفاق رائے سے انتخاب کی کوشش کریں۔[۱]

اس تحریک کی روز افزوں مقبولیت سے مسلم لیگ کے عہدے داروں کو سخت خطرہ لاحق ہوگیا۔ مگر اکثر سیاسی کارکنوں اور عوام کا یہ خیال تھا کہ مسلم لیگ کے احیاء کا یہ واحد موقع ہے کہ اسے معدُودے چند افراد کی وسیع وعریض جیبوں سے نکال کر ایک مرتبہ پھر عوامی تنظیم بنایا جائے۔“[۲]

کنونشن پروگرام کے مطابق ۳۱ر اکتوبر کو شروع ہونی تھی،

---

[۱] : ڈان کراچی - ۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۴ء -

[۲] : ایضاً ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۴ء -

Marfat.com

لیکن کونسل کا ایجنڈا صرف اس شق پر مشتمل تھا کہ کنونیشن میں کس درجہ کے ارکان شامل ہونے کے مجاز ہوں گے۔ ایجنڈے میں نہ نئے صدر کے انتخاب کا کوئی ذکر تھا اور نہ ان اقدامات کی طرف کوئی اشارہ، جو تنظیم کے احیاء کے لیے کیے جانے تھے۔ ؎۱

اس لیے یہ خدشہ عام تھا کہ غالباً کنونشن "ٹائیں ٹائیں فش" کے ماحول میں ختم ہو جائے گی۔

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس سٹیڈیم میں یہ کنونشن ہونے والی ہے آیا مسلم لیگ کے راہنما اسے پارٹی کے احیاء کا گہوارہ بنانے کے بجائے لیگ کا قبرستان بنانے کے درپے ہیں۔" ؎۲

جوں جوں کنونشن کی تاریخ قریب آ رہی تھی نئے آئین کے مسئلے پر ملک کی فضا میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ لیگ کی صفوں میں بھی بعض دستوری اصولوں پر شدید اختلافات نے بڑی شدت اختیار کر لی تھی۔ دستوری کش مکش سے صوبائیت کی چنگاریاں بھی سُلگ رہی تھیں اور اس بات کا پورا امکان تھا کہ کنونشن میں متنازعہ فیہ مسائل کے بارے میں بھی قراردادیں پیش کی جائیں گی۔

بعض حلقوں کو یہ خدشہ تھا کہ جس مقصد کے لیے لیگ کی کنونشن ہو رہی ہے، یعنی مسلم لیگ کا احیاء، وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا۔ البتہ بعض مسائل کی وجہ سے مختلف صوبوں کے مندوبین

؎۱: ڈان کراچی - ۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۴ء۔

؎۲: ایضاً ۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۴ء۔

Marfat.com

کے مابین تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا دستور سازی کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ [1]

عین اس موقع پر مشرقی پاکستان کے کونسلروں نے یہ مطالبہ کر دیا کہ کنونشن کو ملتوی کر دیا جائے، کیونکہ سیلاب کے باعث وُہ کنونشن میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔ [2]

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے کنونشن کو جنوری تک ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کا اعلان کنونشن کے افتتاح سے صرف چند روز پہلے کیا گیا۔

مشرقی پاکستان کے متحدہ محاذ کی طرف سے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا مطالبہ ،کیا جا رہا تھا، لیکن مرکز میں مسلم لیگ کی حکومت نے اسے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ کیونکہ وزیر اعظم کے بقول صوبائی انتخابات کی وجہ سے قومی قانون ساز ادارے کو توڑا نہیں جا سکتا تھا۔

دریں اثنا کراچی کے بعض حلقے بھی جو گورنر جنرل کے قریب تھے، یہی مطالبہ کرنے لگے تھے۔ ان میں "ٹائمز آف کراچی" کے ایڈیٹر زیڈ۔ اے سلیری نمایاں تھے جو خاص طور پر زیورچ گئے جہاں متحدہ محاذ کے لیڈر سہروردی علاج کے سلسلے میں مقیم تھے، اور واپسی پر ان کا مطالبہ بڑے نمایاں انداز سے شائع کیا کہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا جائے۔ یہ اخبار ان دنوں گورنر جنرل غلام محمد کا معتمد تھا۔ اگرچہ

---

[1] : ڈان کراچی۔ ۲۳ ر اکتوبر ۱۹۵۴ء۔

[2] : ایضاً۔

سلیری صاحب کا کہنا ہے کہ وُہ زیورچ کسی کے ایماً پر نہیں گئے تھے پھر بھی عام تاثر یہی ہے کہ ان کو غلام محمد نے بھیجا تھا۔ لیکن جس بات نے بالآخر دستور ساز اسمبلی کی قسمت کا فیصلہ صادر کیا وُہ بڑے پُراسرار انداز میں بہ عجلت تمام ایسے قوانین کی منظوری تھی، جنھوں نے گورنر جنرل کے حقوق و اختیارات بہت محدود کر دیے تھے۔ چنانچہ گورنر جنرل سے وزراء کو برطرف کرنے کا اختیار چھین لیا گیا تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے اسے اپنی ذاتی توہین سمجھا اور اسمبلی سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ گورنر جنرل نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔[۱] یہ معاملہ بعد میں اعلیٰ عدالتوں میں بھی زیرِ بحث آیا لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح ڈیڑھ سال قبل مسلم لیگی ارکانِ اسمبلی نے اپنے اعتماد سے بہرہ مند وزیرِ اعظم کی غیر جمہوری برطرفی پر ضمیر کی کوئی خلش محسوس نہیں کی تھی، اسی طرح اکثر سرکردہ مسلم لیگی لیڈروں نے گورنر جنرل کے اس جوابی اور انتقامی اقدام پر بھی احتجاج کرنے کے بجائے اسے "مناسب" "ضروری" اور "مفید" کارروائی قرار دیا۔ اس خودغرضانہ کوتاہ اندیشی نے پاکستان میں مسلم لیگ کے زوال پر مہرِ توثیق ثبت کر دی۔

گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی توڑنے کے سلسلے میں جو فرمان جاری کیا تھا اس میں کہا گیا تھا :-

"گورنر جنرل نے ملک کو درپیش سیاسی بحران کا جائزہ لیا ہے اور وُہ بڑے افسوس کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آئینی مشینری بالکل ناکارہ ہو گئی ہے۔ اس لیے انھوں نے پاکستان بھر

---

[۱]: اس موضوع پر باب نمبر ۵ میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

Marfat.com

میں ہنگامی حالت کا اعلان کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ موجودہ دستور ساز اسمبلی پر عوام کو اعتماد نہیں رہا اور وہ اب اپنا فریضہ ادا کرنے سے قاصر ہے۔ آخری حق و اختیار عوام کو حاصل ہے اور وُہی اپنے نمائندوں کے ذریعے جو منتخب کیے جائیں گے تمام مسائل کا جن میں آئینی مسائل بھی شامل ہیں فیصلہ کریں گے۔ نئے انتخابات حتی الوسع جلد از جلد منعقد ہوں گے۔"[۱]

گورنر جنرل نے یہ بھی بتایا کہ انتخابات ہونے تک ملک کا انتظام از سرِ نو تشکیل پانے والی کابینہ چلائے گی۔ انھوں نے وزیرِ اعظم محمد علی بوگرہ کو ملک میں ایک جاندار اور مستحکم انتظامیہ کے قیام کے لیے اپنی کابینہ کی تشکیل کی ہدایت کی۔

محمد علی بوگرہ نے اس موقع پر اپنی نشری تقریر میں بتایا کہ دستور ساز اسمبلی کے بعض اقدامات پر عوام کی اکثریت نے اعتراضات کیے ہیں اور یہ اسمبلی عوام کا اعتماد برقرار رکھنے کے باب میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ آئین کو اپنی جگہ اہمیّت حاصل ہے لیکن ملک کی سلامتی زیادہ اہم ہے۔ انھوں نے اس نازک مرحلہ میں یہ ذمہ داری ملک کی طرف سے عائد ہونے والے فرض کے طور پر قبول کی ہے۔[۲]

دستور ساز اسمبلی کے توڑے جانے کے بعد محمد علی بوگرہ نے جو وزارت بنائی اس میں قیامِ پاکستان کے بعد نہ صرف پہلی مرتبہ غیر لیگی ارکان شامل کیے گئے بلکہ اس میں فوج کے سربراہ جنرل محمد ایوب خان کو بھی وزیرِ دفاع بنایا گیا۔ اس طرح مسلم لیگ کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ پہلی مرتبہ فوج بھی حکومت اور سیاست میں ملوّث ہوگئی۔ اس کے بڑے دُور رس نتائج نکلے اور صرف چار سال

---

۱ : ڈان کراچی۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۴ء۔

۲ : ایضاً۔

Marfat.com

بعد جنرل ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر کے پاکستان میں جمہوریت و آئین کی بساط لپیٹ دی۔ یہ اپنی جگہ بڑی اہم اور دردناک داستان ہے، لیکن ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مسلم لیگی لیڈروں نے ہی اپنی خودغرضانہ کوتاہ اندیشیوں سے پاکستان میں غیر جمہوری رجحانات کے لیے راہ ہموار کی اور یہی غیر جمہوری رجحانات پاکستان میں مسلم لیگ کی حکومت ختم کرنے کا باعث بن گئے، حالانکہ اسی مسلم لیگ نے قائداعظم کی بے مثل جمہوری اور آئینی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع کر کے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت قائم کرنے کا منفرد اور لازوال شرف حاصل کیا تھا۔

Marfat.com

باب ۴

صوبائی سیاست — سازشیں اور خلفشار

پنجاب پنجاب میں مسلم لیگی وزارت نے نواب افتخار حسین خان ممدوٹ کی سربراہی میں ۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو حلف اٹھایا تھا۔ کابینہ کے دوسرے ارکان میں ممتاز دولتانہ۔ سردار شوکت حیات اور شیخ کرامت علی تھے[1]۔ لاتعداد مہاجرین کی آمد کے باعث پنجاب میں لیگی وزارت کو آغاز میں ہی بڑی شدید مشکلات اور حوصلہ شکن حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ تقسیم برصغیر کے بعد وسیع پیمانے پر تبادلہ آبادی کئی اعتبار سے ہوشربا تھا۔ انتظامیہ کو نہ صرف لاکھوں افراد کے لیے خوراک لباس رہائش طبی امداد اور سفری سہولتوں کا انتظام کرنا تھا، بلکہ طویل المیعاد بنیادوں پر ان ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال اور بحالی سے بھی عہدہ برآ ہونا تھا جو سب کچھ لٹا کر صرف اپنی جان لے کر پاکستان پہنچے تھے[2]۔

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء

[2] پاکستان میں پہنچنے والے مہاجرین کے جوش و خروش اور اس خطہ زمین سے بے پناہ محبت و عقیدت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کتنے ہی مہاجرین جب سب کچھ لٹا کر پاکستان کی سرزمین میں قدم رکھتے تھے تو وہ پرچم ہلالی دیکھتے ہی شادی مرگ ہو جاتے تھے چنانچہ مہاجر کیمپوں کے نگران رضاکار پاکستان کے جھنڈے اُتار دیتے تھے اور مہاجرین کو کھانا کھلانے اور آرام بہم پہنچانے کے بعد پاکستان کا پرچم دکھاتے تھے (یہ بات مصنف کو ڈاکٹر ضیاء الاسلام نے انٹرویو میں بتائی۔ ڈاکٹر ضیاء الاسلام پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر تھے اور مہاجرین کیمپوں کی نگران کمیٹی کے رکن تھے انہوں نے اس سلسلے میں بے پناہ خدمات انجام دیں) علاوہ ازیں دیکھیں Speeches and Statements of Quid-i-Millat Liaquat Ali Khan, Rafique Afzal Research Society of Pakistan, Lahore, 1967, P. 211

Marfat.com

مہاجرین کی فوری دیکھ بھال اور عارضی قیام کے لیے مغربی پنجاب کے طول و عرض میں مہاجر کیمپ قائم کیے گئے۔ بھارت سے مہاجرین اتنی بڑی تعداد میں آرہے تھے کہ کیمپوں کی تعداد میں ساتھ ہی ساتھ اضافہ رونما ہونے والا ناکافی ثابت ہوتا تھا اور انہیں صوبے کے دوسرے حصوں میں بھیجنے کا بھی انتظام کرنا پڑتا تھا۔ جنوری ۱۹۴۸ء تک ان کیمپوں کی تعداد ۷۵ تک پہنچ چکی تھی[1]۔ لاکھوں افراد کے لیے خوراک اور دوسری ضروریات کا بے پایاں انتظام درکار تھا۔ کیمپوں میں مسلم لیگ کے کارکن طلبہ اور رضاکار دن رات کام کرتے تھے اور انہی کی سعی و جہد کی بدولت حکومت اس بحران پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی۔ حکومت مغربی پنجاب نے مہاجر کیمپوں کے انتظام اور دوسرے معاملات کو مربوط کرنے کے لیے پانچ آئی سی ایس افسروں اور دوسرے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی بھی قائم کی[2]۔

مسلم لیگ وزارت کے لیے امن و امان برقرار رکھنے کا مسئلہ بھی بہت اہم اور سنگین تھا۔ بھارت سے جو لٹے پٹے مسلمان مہاجر آتے تھے، وہ غیر مسلموں کے غیر انسانی ظلم و ستم کی ایسی داستانیں بیان کرتے تھے کہ خون کھول اُٹھتا تھا۔ چنانچہ انتظامیہ جو پہلے ہی بڑی مشکلات سے دوچار تھی، اسے امن و امان کے تحفظ کے سلسلے میں بھی غیر معمولی توجہ اور اہتمام کی ضرورت پیش آتی تھی۔ یہ مسئلہ اس قدر نازک صورت اختیار کر گیا کہ خود قائد اعظم نے لاہور آکر پنجاب کے عوام کو یہ تلقین کی کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیں اور انتقامی کارروائی سے احتراز کریں[3]۔

ابتدا میں پنجاب کی کابینہ میں مہاجرین کا کوئی وزیر نہیں تھا۔ لیکن جلد ہی

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۱۴ راگست ۱۹۴۹ء (یوم پاکستان ایڈیشن ملاحظہ فرمائیں)

[2] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۲ راگست ۱۹۴۷ء

[3] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۳۰ راکتوبر ۱۹۴۷ء

Marfat.com

مہاجرین کے مسئلے کی وسعت اور اہمیت نے حکومت کو علیحدہ وزارت مہاجرین و بحالیات قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ میاں افتخار الدین کو وزیر مہاجرین مقرر کیا گیا۔

قیام پاکستان کے وقت نواب ممدوٹ پنجاب مسلم لیگ کے صدر اور میاں عبدالباری جنرل سیکریٹری تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۱۷ر نومبر ۴۷ء کو لاہور میں ہوا۔ اس اجلاس میں میاں افتخار الدین کو صدر اور مولانا علاؤالدین صدیقی کو جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ میاں صاحب ایک دن پہلے وزارت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ وزارت سے مستعفی ہونے کی کئی وجوہ تھیں۔ اول تو وزیر اعلیٰ سے ان کے نظریاتی اختلافات تھے۔ دوم وہ صوبائی حکومت کے انداز اور کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے۔ سوم وہ جس طرح کی اصلاحات اور معاشی نظام کے حامی تھے اس کے نفاذ کی امید نظر نہ آتی تھی چنانچہ انھوں نے اپنے استعفیٰ میں جو ۱۶ر نومبر ۴۷ء کو اخبارات میں شائع ہوا۔ صوبائی حکومت پر یہ الزام لگایا کہ کابینہ نے ان کی تجویز کردہ اصلاحات اور ان کے پسندیدہ معاشی نظام کے نفاذ کے لئے ان سے مکمل تعاون نہیں کیا۔ میاں صاحب نے یہ شکایت بھی کی کہ انہیں خود اپنے محکمے پر بھی مکمل اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ میاں افتخار الدین کے الزامات کے جواب میں ممدوٹ کا یہ دعویٰ تھا کہ جمہوریت کی بنیاد مشترکہ ذمہ داری پر ہوتی ہے اور کسی ایک وزیر کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بہرحال میاں افتخار الدین اور ممدوٹ کے اختلافات اصولی اور نظریاتی نوعیت کے تھے۔ میاں صاحب سوشلسٹ ذہن رکھتے تھے اور ممدوٹ صاحب اس طرز کے حامی نہ تھے چنانچہ میاں افتخار الدین نے مایوس ہو کر کابینہ سے استعفیٰ دے دیا اور وزیر اعلیٰ کی مخالفت کے باوجود پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے تاکہ مسلم لیگ کو اپنا آلہ کار بنا سکیں۔ مولانا علاؤالدین صدیقی جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔[۱]

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۶ر نومبر ۴۷ء

کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ اسلحہ کی خریداری کے لئے مزید سہولتیں دی جائیں۔ کونسل میں پنجاب کی سیاسی صورت حال پر خاصی بحث ہوئی جس میں اکثر و بیشتر مقررین نے وزارت پر اشارۃً طنز کیا اور کہا کہ اس کے طور طریقے سابق یونینسٹ بیوروکریٹوں سے مختلف نہیں۔ مولانا صدیقی نے کہا۔ ہمارا واحد قصور یہ ہے کہ ہم مسلم لیگی ہیں۔ پولیس کا جو ڈنڈا خضر وزارت کے زمانہ میں ہمارے سروں پر برستا تھا، اب بھی ہمارے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ امرتسر کے سرکردہ مسلم لیگی ملک غلام نبی نے مہاجرین کے ساتھ حکومت پنجاب کے غیر ہمدردانہ سلوک کی شکایت بڑے تلخ انداز میں کی۔ کونسل نے ہر ضلع میں پانچ غیر سرکاری مسلم لیگی ارکان پر مشتمل ایک ایک کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور حکومت سے سفارش کی کہ انہیں مشاورتی کمیٹیوں کی حیثیت دی جائے۔ یہ کمیٹیاں عوامی مفاد کے تحفظ کیلئے مقامی حکام کو صلاح و مشورہ دینے کے لئے بنائی گئی تھیں لہ۔ یہ ایک طرح سے بیوروکریسی سے بے اطمینانی کا اظہار تھا۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ابھی پاکستان کو معرض وجود میں آئے صرف تین ماہ گزرے تھے اور پنجاب مسلم لیگ کی کونسل نے جسے جماعت کی پارلیمنٹ کی حیثیت حاصل تھی، صوبائی حکومت سے بے اطمینانی کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ کونسل نے صوبائی حکومت پر نہ صرف تنقید کی بلکہ اس پر غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کرنے کا بھی الزام لگایا۔ اس سے نہ صرف مسلم لیگ کی صوبائی لیڈر شپ کی مقبولیت کا راز فاش ہو جاتا ہے بلکہ اعلیٰ لیڈر شپ کے محط کا بھی احساس شدید تر ہو جاتا ہے ورنہ صرف تین مہینوں میں اپنی ہی جماعت کی نمائندہ حکومت سے اس قدر بدظنی چہ معنی۔ لیڈر شپ کا یہ دیوالیہ پن بالآخر مسلم لیگ کے زوال کا باعث بنا۔

لہ پاکستان ٹائمز لاہور ۱۸ر نومبر ۱۹۴۷ء

Marfat.com

میاں افتخار الدین بڑے سرگرم اور انتھک شخص تھے۔ انھوں نے سارے صوبے کا دورہ کیا اور عوام کو ظہور پاکستان کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلی اور اس کے تقاضوں سے آگاہ کیا لیکن مسلم لیگ کے بعض لیڈروں نے انہیں کمیونسٹ کہنا شروع کر دیا[۱]۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کے ذاتی نظریات کیا تھے اور وہ پاکستان کے لئے مفید تھے یا مضر، یہ بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے مسلم لیگ کو عوامی تنظیم بنانے کی مخلصانہ کوششیں کیں۔ وہ اپنی تقریروں میں تین نکات پر خاص طور پر زور دیتے تھے۔ ایک یہ کہ عوام اسلامی تعلیمات کے مطابق پاکستان کو ایک عظیم جمہوری مملکت بنائیں۔ دوسرا یہ کہ جاگیرداری کو ختم کر دیا جائے اور صنعت کو قومی تحویل میں لیا جائے[۲]۔ اور تیسرا یہ کہ افسروں میں بڑھتی ہوئی رشوت ستانی کو ختم کیا جائے[۳]۔ ان کے یہ مطالبات آل انڈیا مسلم لیگ کے منشور کے بنیادی اصول تھے اور ملک کی بقا و ترقی کے لئے ان پر عمل درآمد لازمی تھا۔ اگرچہ یہ اصول پاکستان کے خواب کے اہم اور نمایاں پہلو تھے لیکن وہ اپنی صحیح روح کے مطابق کبھی بھی نافذ نہ کئے گئے۔ ورنہ اگر شروع سے ہی عوام کی زندگیاں اسلام کے سانچے میں ڈھال دی جاتیں، جاگیرداری کا زور توڑ دیا جاتا، دولت کی مساوی تقسیم کا انتظام کر لیا جاتا، رشوت ستانی کا قلع قمع ہو جاتا اور بیوروکریسی کو سیاست سے الگ رکھنے کا انتظام عمل میں آ جاتا تو مملکتِ خداداد میں جمہوریت یوں دم نہ توڑتی اور عوام اس طرح ظلم کا نشانہ نہ بنتے جس طرح بعد میں وہ مسلسل بنتے رہے۔

نئی رکنیت سازی کی مہم کے سلسلہ میں پنجاب مسلم لیگ نے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ صوبائی لیگ کے صدر نے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۳۰ مارچ ۱۹۴۸ء

[۲] ایضاً ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء۔ [۳] ایضاً ۲ دسمبر ۱۹۴۷ء

Marfat.com

مسلم لیگ کا رکن بننے کی ابس کی رکنیت سازی کی آخری تاریخ ۲۱ جون ۱۹۴۸ء مقرر کی گئی تھی اور پنجاب مسلم لیگ نے آخری ہفتہ کو "لیگ کی رکنیت سازی کے ہفتہ" کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بعد میں یہ اعلان کیا گیا کہ ملک بھر میں مسلم لیگ کی رکنیت ۲۵ لاکھ افراد نے قبول کی تھی۔ ان میں سے ۱۱ لاکھ صرف پنجاب سے تھے۔

اس دوران میں پنجاب وزارت دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک گروپ کے سربراہ وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ تھے اور دوسرے دھڑے کو زبان زد عام میں "دولتانہ گروپ" کہا جاتا تھا۔ ممدوٹ اور دولتانہ میں اختلافات تقسیم برِ صغیر سے پہلے بھی تھے لیکن بعد ازاں اُنھوں نے باقاعدہ رسہ کشی کی صورت اختیار کر لی۔ اِن اختلافات کی بنیاد کسی اصول پر نہ تھی بلکہ یہ محض "شخصیات کا تصادم" تھا جس کا بنیادی محرک اقتدار کی ہوس اور دونوں طرف کا احساسِ برتری تھا۔ تقسیم سے پہلے ان میں لڑائی اس قدر کھلی اور برملا نہیں تھی کیونکہ اس وقت دونوں قائدِ اعظم کی راہنمائی میں ایک مشترکہ نصب العین کے لئے جد وجہد کر رہے تھے لیکن ظہورِ پاکستان کے بعد وزارتوں کی تقسیم اور اقتدار کی ہوس نے اس اتحاد کی قلعی کھول دی۔ علاوہ ازیں دولتانہ کو ممدوٹ کے ماتحت کام کرنا پڑا جبکہ وہ خود کو ممدوٹ سے بدرجہا قابل اور بہتر لیڈر سمجھتے تھے اور ان پر غالب آنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ ان دونوں نے اپنے دھڑے بنا لئے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں کرنے لگے۔

ملک بڑے نازک اور زہرہ گداز حالات سے دوچار تھا اور اسے قائم رکھنے کے لئے اتحاد اور تنظیم بنیادی ضرورت کی سی اہمیت رکھتے تھے۔ حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ دونوں لیڈر ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کرنے کے بجائے پاکستان کی ترقی و تعمیر کے لئے اپنی ساری مساعی وقف کر دیں لیکن دولتانہ اور

Marfat.com

ممدوٹ اس احساس سے بے نیاز دکھائی دیتے تھے۔ تخت نشینی کی اس جنگ سے مسلم لیگ کی ساکھ کو بڑا نقصان پہنچا اور صوبے بھر میں نچلی سطحوں پر مسلم لیگ کی تنظیم دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ صورتِ حال اس قدر پیچیدہ اور ابتر ہو گئی کہ قائد اعظم کو مداخلت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ انہوں نے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ نواب ممدوٹ میاں ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات اور گورنر موڈی کو کراچی ملاقات کے لیے بلایا اور انہیں ملکی حالات کے پیش نظر خوش اسلوبی سے اپنے اختلافات ختم کر دینے کا مشورہ دیا۔[۱] ان کے پدرانہ مشورہ سے دولتانہ اور ممدوٹ کے اختلافات وقتی طور پر

---

[۱]: پاکستان ٹائمز لاہور ۱۳ مئی ۱۹۴۸ء (نوٹ: کہا جاتا ہے کہ قائد اعظم نے ممتاز دولتانہ، نواب ممدوٹ اور سردار شوکت حیات کو جب دوسری مرتبہ کراچی بلایا تو ان سے مستعفی ہونے کو کہا۔ دولتانہ اور سردار شوکت نے اسی وقت استعفے دے دیئے لیکن نواب ممدوٹ نے غور کرنے کے لئے مہلت مانگی اور لاہور تشریف لے آئے۔ سید نور احمد نے مارشل لاء سے مارشل لاء تک صفحہ نمبر ۳۶۱ پر تینوں کے استعفوں کا ذکر کیا ہے لیکن میری تحقیق کے مطابق نواب ممدوٹ نے استعفیٰ انہیں دیا تھا۔ قائد اعظم نے اس معاملے میں پھر دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ بہر حال اس صورتِ حال نے قائد اعظم کو مسلم لیگ کی عام قیادت سے بالکل مایوس کر دیا اور وہ ملک کے مستقبل کے بارے میں متفکر رہنے لگے۔ کراچی میں ممدوٹ دولتانہ کی قائد اعظم سے ملاقات سے پہلے ڈاکٹر ضیاء الاسلام، شیخ خورشید احمد طالب علم راہنما، قائد اعظم سے ملے اور درخواست کی کہ انہیں اب سیاست سے کنارہ کش ہونے کی اجازت دی جائے چونکہ وہ اپنا مشن مکمل کر چکے ہیں ——— ان کے جواب میں قائد اعظم نے مسلم لیگ کی قیادت سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں سیاست میں ٹھوس اور اعلیٰ کردار سرانجام دینے کی نصیحت کی۔ (مصنف کا ذاتی انٹرویو ڈاکٹر ضیاء الاسلام صدر پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن)۔ (اس بات کی تصدیق سردار شوکت حیات نے بھی ایک ملاقات میں کی اور یہی واقعہ میاں امیر الدین کونسلر مسلم لیگ لاہور نے بھی بتایا) ڈاکٹر ضیاء الاسلام کے بقول جب کراچی سے واپسی پر ان کی ملاقات نواب صاحب سے ہوئی تو انھوں نے ملتے ہی کہا کہ بابا مجھ سے استعفیٰ مانگ رہا ہے لیکن میں استعفیٰ نہیں دوں گا۔

Marfat.com

دب ہو گئے لیکن چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک دوسرے پر تنقید کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا قائد اعظمؒ نے ان کو دوبارہ کراچی بلایا اور ان کے اختلافات سلجھانے کی کوشش کی لیکن بالآخر وہ مایوس ہو گئے اور انھوں نے یہ ذمہ داری گورنر کو سونپ دی ۔ اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی حتیٰ کہ قیام پاکستان کو معرض وجود میں لانے والے اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا اور میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات نے یہ الزام عائد کر کے ممدوٹ وزارت سے استعفیٰ دے دیا کہ " وزارت کے پاس کوئی واضح پروگرام نہیں[1] گویا مستعفی ہونے والوں کے پاس کوئی واضح پروگرام تھا! ویسے اب میاں ممتاز دولتانہ کے پاس استعفیٰ دینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ ممدوٹ نے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ۲۰ مئی ۱۹۴۸ء کو بلا کر اپنے حق میں اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا تھا۔ اپنے استعفے کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے میاں دولتانہ نے بتایا ۔" بعض بنیادی مسائل کے بارے میں کابینہ کے سربراہ سے مجھے اختلافات تھے۔ نیز اہم مسائل کو ملتوی کرتے رہنا ان کی کمزوری ہے ، مثلاً مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ ، کھلی اقتصادی ناانصافی کی اصلاح ، شہری دفاع کے لئے قومی تنظیم ، انتظامیہ میں اختیارات کا ناجائز استعمال جیسے مسائل سے چشم پوشی مہلک اور ناقابل جواز ہے ۔ وزیر اعلیٰ اور میرے درمیان یہ واضح مفاہمت ہوئی تھی کہ اگر ہم قائد اعظم کو مطمئن نہ کر سکے تو ہم وزارت سے مستعفی ہو جائیں گے ۔ لیکن جب میں نے یہ محسوس کیا کہ وزیر اعلیٰ اس مفاہمت کو ملحوظ نہیں رکھنا چاہتے ، تو میں نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا[2] ۔"

دولتانہ اور شوکت کے مستعفی ہو جانے کے چند دن بعد پنجاب مسلم لیگ اسمبلی پارٹی

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۸ مئی ۱۹۴۸ء

[2] ایضاً

Marfat.com

کا اجلاس ہوا جس میں استعفوں سے پیدا شدہ صورتِ حال، کا جائزہ لیا گیا۔ اسمبلی پارٹی کی فضا پر بھی گروہ بندی کا رنگ غالب تھا، چنانچہ دونوں دھڑوں میں خوب رسہ کشی ہوئی اور ہر طرح کا ہنگامہ برپا کیا گیا۔ اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی گئی۔ کہ صوبائی حکومت کی قیادت کے لیے موزوں شخص کو تلاش کرنے کے لئے قائدِ اعظم سے فوری طور پر مداخلت کرنے کی التماس کی جائے، لیکن بعد ازاں یہ قرارداد واپس لے لی گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس میٹنگ کا مقصد صورتِ حال پر غور نہیں بلکہ قوت کا مقابلہ تھا۔ پارٹی میں متحارب دھڑوں کے ظہور سے اجلاس میں نظم و ضبط کے تقاضے بُری طرح پامال کئے گئے حتیٰ کہ پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں شائستگی کے فقدان کے بارے میں ایک رکن یہ کہنے پر مجبور ہو گیا — "کہ اجلاس مچھلی بازار کا منظر پیش کر رہا تھا"[۱]

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء میں قائدِ اعظم وفات پا گئے۔ گورنر جنرل کے طور پر ان کے جانشین مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین مقرر ہوئے لیکن اب ملک میں مرکزی شخصیت لیاقت علی خان کی تھی، جو وزیرِ اعظم تھے یہ تاثر عام تھا کہ میاں ممتاز دولتانہ کو لیاقت علی خان کی سرپرستی حاصل ہے۔ یوں بھی وزیرِ اعظم صوبائی سطح پر کسی نہ کسی دھڑے کی حمایت پر مجبور تھے کیونکہ مسلم لیگ کی قیادت تمام صوبوں میں گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ پنجاب میں دولتانہ کی سرپرستی کی وجہ اول تو وزیرِ اعظم کے وزیرِ اعلیٰ سے ذاتی اختلافات تھے دوم وہ دولتانہ کو ممدوٹ سے زیادہ اہل اور لائق سمجھتے تھے۔

قائدِ اعظم کی وفات سے پاکستان کی قومی زندگی میں ایک عظیم خلاء پیدا ہو گیا اور عوام کے حوصلے پست ہو گئے۔ لیاقت علی خان کو اس امر کا پورا احساس تھا

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۲ر جون ۱۹۴۸ء

چنانچہ انہوں نے ۲۸ ستمبر ۱۹۴۸ء سے مغربی پاکستان کا دورہ شروع کر دیا تاکہ عوام کے حوصلے بلند کر سکیں۔ اس دورے کا دوسرا مقصد صوبائی لیڈروں کے اندرونی اختلافات ختم کرنا تھا تاکہ پوری قوم کو یکجا اور متحد کیا جا سکے۔ اس ضمن میں لیاقت علی خان نے دولتانہ ممدوٹ اختلافات ختم کرانے کی پوری کوششیں کیں چنانچہ نواب ممدوٹ کو دولتانہ اور ملک فیروز خان نون کو اپنی کابینہ میں شامل کرنے پر رضامند کر لیا۔ دولتانہ اور نون بھی راضی ہو گئے۔ لیکن نواب ممدوٹ کو ان کے ساتھیوں نے خوفزدہ کر کے فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ لیاقت علی خان کے جاتے ہی، ممدوٹ اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ اس دوران میں اس سمجھوتے کی کافی تشہیر ہو چکی تھی اور یہ خبر اخبارات میں بھی چھپ چکی تھی اس لئے دولتانہ اور نون نے ممدوٹ کے انکار کو اپنی ذاتی توہین سمجھا۔[1]

نومبر ۱۹۴۸ء میں نواب ممدوٹ کو گورنر کی طرف سے مستعفی ہو جانے کا حکم موصول ہوا اور انہوں نے اپنی کابینہ کا استعفا پیش کر دیا۔ صوبائی گورنر نے نواب ممدوٹ کو نئی وزارت بنانے کی ہدایت کی چنانچہ نئی کابینہ میں نصراللہ خان، عبدالحمید دستی، میجر مبارک علی اور چودھری فضل الٰہی کو شامل کر لیا گیا۔ نواب ممدوٹ بدستور وزیر اعلیٰ رہے۔

دریں اثنا میاں ممتاز دولتانہ اور ملک فیروز خان نون نے مل کر سیاسی محاذ بنا لیا اور اکٹھے ہو کر ممدوٹ وزارت پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ ان کے خیال میں وزارت اخلاص سے عاری ہو چکی تھی۔ ملک فیروز خان نون اکثر ممدوٹ وزارت کو عزت و اعتماد سے محروم اور لڑکھڑاتی ہوئی شخصی حکومت

---

[1] مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ سید نور احمد۔ ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور (۱۹۶۷ء) صفحہ نمبر ۳۷۴-۳۷۵

قرار دیتے تھے۔[1]

مسلم لیگ کی تنظیم نو اور رکنیت سازی کی بنا پر صوبائی لیگ کے صدر کا انتخاب ۲۵ نومبر ۱۹۴۸ء کو ہونے والا تھا۔ میاں ممتاز دولتانہ نے پنجاب مسلم لیگ کا صدر بننے کے لئے سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں کیونکہ اس عہدہ پر فائز ہونے کے بعد وہ وزارت کے لئے مشکلات میں اضافہ کر سکتے تھے۔ مسلم لیگ تنظیم کے متعلق عام تاثر یہ تھا کہ وہ ایک "اعلیٰ اور غالب ادارہ" ہے اور کابینہ مسلم لیگ کی نمائندہ ادارہ ہونے کی حیثیت سے لیگ کونسل کے سامنے جواب دہ ہے۔ چنانچہ اقتدار کے خواہاں سیاست دانوں کے لئے مسلم لیگ کی صدارت سب سے زیادہ مرغوب عہدہ تھا۔ رکن سازی کا مرحلہ طے ہونے کے بعد صوبائی مسلم لیگ کے عہدیداروں کا انتخاب ہونا تھا چنانچہ دولتانہ اور ان کا گروپ ممدوٹ کے ساتھ طاقت آزمائی کے لئے بڑی سرگرمی سے تیاریوں میں منہمک تھا۔ نئے صدارتی انتخاب کا مرحلہ قریب آنے کے ساتھ ہی ووٹوں کے حصول اور ووٹروں کو زیر دام لانے کے لئے جنونی دوڑ شروع ہو گئی۔ پنجاب کے دیہاتی علاقوں سے کونسلروں کو اکٹھا کرنے کے لئے بڑی تعداد میں کاریں اور بسیں استعمال کی جانے لگیں۔[2] اس ڈرامے کی وجہ یہ تھی کہ انتخاب ذاتی اور شخصی بنیادوں پر لڑا جا رہا تھا اور وزارتی رسہ کشی کی طرح اس مقابلہ آرائی میں نہ اصولوں کو کوئی اہمیت حاصل تھی اور نہ پالیسیوں کو۔ گویا یہ جنگ اقتدار کی جنگ تھی۔

ہر دو صدارتی امیدواروں دولتانہ اور علاؤالدین صدیقی نے اپنے اپنے منشور پیش کئے۔ مولانا علاؤالدین صدیقی کو ممدوٹ گروپ کی حمایت حاصل تھی۔

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۱۷ نومبر ۱۹۴۸ء

[2] نوائے وقت لاہور ۲۵ نومبر ۱۹۴۸ء

Marfat.com

انھوں نے اپنے پروگرام میں داخلی اتحاد۔ دفاع وطن کے لئے موثر اقدامات اور قوم کی تشکیل نو پر زور دیا۔ انھوں نے کہا ''اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں ملک کے ہر شہری کو خوراک اور لباس بہم پہنچانے کے لئے منصوبے بنانے چاہئیں۔ اس کے ساتھ اشاعت تعلیم اور بیماریوں سے تحفظ کے لئے پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ مسلم لیگ کو عوامی بہبود کے لئے اپنے وزیروں کے سامنے معتدل لیکن انقلابی پروگرام پیش کرنا چاہیئے''[۱]

میاں ممتاز دولتانہ کا منشور ۱۱ نکات پر مشتمل تھا، اس کے اہم پہلو حسب ذیل تھے۔

۱۔ ہم نے اپنے صوبے کی انتظامیہ کو پاک صاف کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

۲۔ ہمیں انتظامیہ کو عوام کے بنیادی اور اہم مطالبات پر توجہ کرنے پر مجبور کر دینا چاہیئے۔ مسلم لیگ کو منظم ہونا چاہیئے اور عوام کے دل کی دھڑکن بننا چاہیئے۔

۳۔ ہر عہدیدار کا انتخاب صرف اہلیت و استحقاق کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔

۴۔ ہمیں ہر شہری کے لئے لازمی فوجی تربیت کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔

۵۔ ہماری آئندہ نسلیں اس کوتاہی[۲] کو کبھی معاف نہیں کریں گی کہ جب ملک کو شدید خطرہ لاحق تھا تو پاکستان مالیات کی کمی کے باعث پریشان تھا۔ یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے کہ عوام از خود ایسے ذرائع اور اداروں کا مطالبہ کریں کہ ہر شخص اپنی کم از کم ضروریات زندگی سے فاضل ایک ایک پیسہ ملکی دفاع کے استحکام کے لئے پیش کر دے۔

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۷ نومبر ۱۹۴۸ء

[۲] مجھے امید ہے کہ آئندہ نسلوں نے اس کوتاہی کو معاف کر دیا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد جو کوتاہیاں ہوئیں ان کی حیثیت رائی کے سامنے پہاڑ کی سی تھی۔

Marfat.com

۶۔ آزاد کشمیر کے بہادر جانبازوں کی حتی الوسع زیادہ سے زیادہ حمایت اور امداد ہمارا اولین فرض ہے۔

۷۔ ہمیں پوری وضاحت سے بتانا چاہیئے کہ ہماری معاشرتی زندگی، سیاست اور قوانین میں اسلام کی روح اور اصولوں کو کس طرح نافذ کیا جائے گا۔

۸۔ انقلابات سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں خود انقلابی بننا چاہیئے۔ ہمیں دیہات میں کاشتکاروں کے حالات زندگی بہتر بنانے چاہئیں۔ ہمیں اپنے صنعتی مزدوروں کو انتقامی کارروائی سے بچانے کی جدوجہد میں پیش پیش ہونا چاہیئے۔ گرانی، بیروزگاری اور ذخیرہ اندوزوں اور منافع بازوں کی سماج دشمن سرگرمیوں کی آئینہ دار موجودہ اقتصادی صورت حال ہماری زندگی کے سارے ڈھانچے کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر دے گی، اس حشر سے بچنے کے لئے ہمیں انصاف اور معقولیت پر مبنی نظام قائم کرنے کے لئے جرأت سے کام لینا ہو گا۔

۹۔ ہم نے تقریر و تحریر اور سیاسی عمل و اقدام کی مکمل آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کا حلف اٹھا رکھا ہے۔

۱۰۔ مسلم لیگ کا یہ مقدس فرض ہے کہ مغربی پنجاب میں اپنے مہاجر بھائیوں کے خلاف ہر قسم کا تعصب ختم کرنے کی کوشش کرے۔ ہمیں اپنے درمیان انہیں خوشحال اور ہر اعتبار سے مساوی شہری بنانے کے لئے پوری کوشش کرنی چاہیئے۔

۱۱۔ مسلم لیگ کے منشور پر جہاں تک ممکن ہو پوری طرح عمل درآمد کرنا چاہیئے۔[1]

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۷ نومبر ۱۹۴۸ء (خود دولتانہ نے اپنے دورِ حکومت میں اس منشور کو کہاں تک عملی جامہ پہنایا، یہ بذاتِ خود دلچسپ مطالعہ ہے۔)

Marfat.com

میاں ممتاز دولتانہ صدارتی انتخاب میں ۲۲ ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو گئے، اور نوابزادہ ولایت علی جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ ولایت علی پاکستان کے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کے بیٹے تھے۔ اس انتخابی اجلاس میں ۳۷۵ کونسلر اور ۷۰ ارکانِ اسمبلی شریک ہوئے تھے[1]۔ صدر منتخب ہونے کے بعد اسی دن ممتاز دولتانہ نے ضلعی مسلم لیگوں کے صدروں اور سیکریٹریوں کی ایک میٹنگ میں تقریر کی اور قومی دفاع، کشمیر، انسدادِ رشوت ستانی کی تحریک اور مہاجرین کی بحالی کے سلسلے میں اپنے چار نکاتی پروگرام کی وضاحت کی۔ انھوں نے اس بات پر خاص زور دیا کہ یہ وزارت مسلم لیگ کی وزارت ہے اور وہ اپنے تمام افعال و اقدامات کے لئے کونسل کے سامنے جوابدہ ہے۔ کونسل کو قومی پارلیمنٹ کی حیثیت حاصل ہے[2]۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس منطق کا اصل مقصد ممدوٹ کو نیچا دکھانا تھا۔

پنجاب مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد میاں ممتاز دولتانہ نے صوبے کا دورہ کیا۔ اور عام جلسوں میں عوام پر زور دیا کہ وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے انھوں نے ہر مقام پر شکایت کی کہ مسلم لیگ کے کارکن بدعنوانی کی راہ پر گامزن ہو گئے ہیں۔ اس لئے جماعت کا عوام سے رابطہ کمزور اور منقطع ہو گیا ہے[3]۔

پاکستان تمام مسلمانوں کی سعی و جہد سے معرضِ وجود میں آیا تھا اور مسلمانانِ ہند و پاکستان نے مسلم لیگ کی مکمل حمایت اور امداد کی تھی، لیکن قیامِ پاکستان کو ابھی ڈیڑھ سال بھی نہیں ہوا تھا کہ مسلم لیگ کے راہنما اپنی جماعت کے

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۳۰ نومبر ۱۹۴۸ء

[2] ایضاً

[3] ایضاً ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء (گویا خود ان کا دامن بے داغ تھا)

Marfat.com

کارکنوں کے کردار اور جماعت کی عوام میں مقبولیت کے بارے میں برملا شکایت اور اعتراض کرنے لگے تھے، لیکن اس زوال اور پستی کے ذمہ دار عوامل و اسباب پر کسی نے بھی روشنی نہ ڈالی، شاید وہ ایسا کرنے سے معذور تھے کیونکہ خرابی احوال کی سب سے زیادہ ذمہ داری خود ان "ناصحین مشفق" پر عاید ہوتی تھی۔

میاں ممتاز دولتانہ نے صوبائی مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد اپنے سیاسی حریف اور صوبائی وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے وسیع مہم شروع کر دی۔ مسلم لیگی کارکنوں میں یہ تاثر بھی عام تھا کہ دولتانہ کو وزیر اعظم لیاقت علی خان کی آشیرباد حاصل ہے۔ دولتانہ اور ممدوٹ میں رسہ کشی نے بالآخر یہ صورت اختیار کر لی کہ "ممدوٹ سے وزارت اعلیٰ سے دستبردار ہونے کا برملا اور متواتر مطالبہ کیا جانے لگا۔ یہ آواز بلند کرنے والے یہ شکایت کرتے تھے کہ ممدوٹ حقائق کا مردانہ وار سامنا کرنے سے قاصر ہیں۔"[۱]

پنجاب مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا ایک اجلاس دسمبر ۱۹۴۸ء میں ہوا جس میں ۸۱ میں سے ۷۶ ارکان شامل ہوئے۔ اجلاس میں دولتانہ گروپ نے مہاجرین کی غیر تسلی بخش آبادکاری کے سلسلے میں قرارداد پیش کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اجلاس کے صدر نے اس بنیاد پر انہیں زیر بحث آنے کی اجازت نہ دی کہ یہ قرارداد حکومت پر عدم اعتماد کے ووٹ کے مترادف ہیں۔ اس کے بعد دولتانہ گروپ کے اہم ارکان اسمبلی نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایوان کے لیڈر سے یہ درخواست کی کہ وہ پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے منصب سے دستبردار ہو جائیں۔[۲] جماعتی تنظیم کے قواعد و ضوابط کے مطابق ایوان کے لیڈر کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس قسم کا

۱؎ پاکستان ٹائمز لاہور ۲۷ دسمبر ۱۹۴۸ء

۲؎ ایضاً

Marfat.com

نوٹس موصول ہونے کے آٹھویں دن عدم اعتماد کی قرارداد پر بحث و غور کے لئے اسمبلی پارٹی کا اجلاس بلائے۔ لیکن اس نے نہ اکثریت کی طرف سے دستخط شدہ اس درخواست کو پذیرائی بخشی اور نہ اجلاس بلانے کے لئے کوئی تاریخ مقرر کی۔ اس سے دھڑے بندی کا دائرہ اور وسیع ہو گیا اور پارٹی کے اندر انتشار اور رسہ کشی الم نشرح ہو گئی۔

اسی دن پنجاب لیگ کونسل کا بھی اجلاس ہوا جس میں متحارب دھڑے باہم دست و گریباں ہوئے۔ اجلاس میں باہر سے آنے والے بلکہ منگوائے گئے غنڈوں نے اودھم مچا دیا۔ انہیں بعض کونسلروں کی پوری سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ اجلاس اچانک ملتوی کرنا پڑا۔ اجلاس کے دوران میں ایک آدمی نے جوش میں آ کر آستینیں چڑھا لیں اور گالیاں بھی دیں[۱] دراصل صوبے میں اقتدار کے لئے وزارتی سیاست گھٹیا جوڑ توڑ کے محور کے گرد گھومنے لگی تھی۔ اس گروہ بندی نے سرکاری ملازموں میں بھی دھڑے بندی کی فضا پیدا کر دی، اور اسی طرح سیاسی کارکن اور اخبارات بھی دونوں دھڑوں کے رہنماؤں کی حمایت یا مخالفت میں صف آرا ہو گئے۔

صوبے میں سیاسی صورت حال اس قدر ناگفتہ بہ ہو گئی کہ وزیرِ اعظم نے دونوں متحارب راہنماؤں کو کراچی طلب کیا تاکہ حقیقت حال معلوم کی جا سکے[۲]

وزیرِ اعظم نے ان کے اختلافات رفع کرانے کی کوشش کی، لیکن جب انہیں احساس ہو گیا کہ ان میں مفاہمت اور صورت حال بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں تو وزیرِ اعظم نے گورنر جنرل سے رسمی سفارش کر دی کہ پنجاب میں آئین معطل کر دیا جائے۔ گورنر جنرل نے پنجاب میں گورنر راج نافذ کرنے کا فرمان جاری کر دیا، چنانچہ وزارت ختم ہو گئی اور صوبائی اسمبلی بھی کالعدم ہو گئی۔ اس سلسلے میں

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۷ دسمبر ۱۹۴۸ء

[۲] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور ۳۱ دسمبر ۱۹۴۸ء

جو سرکاری فرمان جاری کیا گیا وہ یہ تھی "بدعنوانی سے معاملات عامہ پر بد دلی سایہ فگن ہوگئی ہے اور سازشوں کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں میں نظم وضبط ختم ہوگیا ہے اس صورت حال تک پہنچانے میں کئی عوامل واسباب نے حصہ لیا ہے لیکن گورنر جنرل کے خیال میں اس معاملے کی سب سے اہم وجہ ارکان اسمبلی کی اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکامی ہے۔ اسمبلی کو کالعدم قرار دینے کا فرمان اور نئے انتخابات کرانے کا فرمان اس وقت تک نافذ رہے گا، جب تک انتخابات کے بعد گورنر اپنے اطمینان کے مطابق اسمبلی کے اعتماد سے بہرہ مند وزیر مقرر نہیں کرتا"[1] پنجاب اسمبلی کو توڑنے کے اقدام کو سیاسی حلقوں میں سراہا گیا اور اخباری اطلاعات کے مطابق وزیر اعظم لیاقت علی خان کو پنجاب میں دفعہ ۹۲ (الف) کے نفاذ کی سفارش کرنے پر لاتعداد تہنیتی تار موصول ہوئے[2] لاہور کارپوریشن نے بھی ایک قرارداد منظور کی جس میں "بے اصول وزیروں اور متوقع وزیروں سے نجات ملنے پر خدا کا شکر ادا کیا گیا"[3] مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ولایت علی خان نے بھی مغربی پنجاب کے معاملات میں گورنر جنرل کی اس مداخلت کا خیر مقدم کیا[4] صرف پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے یہ مخالفانہ رائے ظاہر کی کہ پنجاب میں دفعہ ۹۲ (الف) کا نفاذ ایک غیر جمہوری اقدام ہے[5] تاہم ورکنگ کمیٹی نے کسی حجاب واضطراب کے بغیر اس بات کو تسلیم کیا کہ پنجاب کی وزارت اس لئے ناکام ہوئی ہے

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء

[2] ڈان کراچی ۲۶ جنوری ۱۹۴۹ء

[3] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۶ جنوری ۱۹۴۹ء

[4] ایضاً "

[5] ایضاً ۲ فروری ۱۹۴۹ء

Marfat.com

کہ صوبے میں مسلم لیگ کا وجود نابود ہو گیا ہے، اور یہ کہ وزارت نے عام لوگوں سے قریبی رابطہ قائم رکھنے کی ضرورت کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا[1] پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میاں ممتاز دولتانہ کی نامزد ادارہ تھی اور دولتانہ کو وزیر اعظم کی آشیرباد حاصل تھی۔ اس لئے ورکنگ کمیٹی نے "باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی" کے مصداق ایک ہی تیر سے دو شکار کئے۔ گورنر جنرل کے اقدام کو دبے الفاظ میں غیر جمہوری قرار دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اس کا لیڈر اس کارروائی میں شریک نہیں اور اقدام کا جواز پیش کر کے فریق مخالف کو بھی مورد الزام ٹھہرا دیا۔ اگر صوبائی مسلم لیگ اس غیر جمہوری اقدام کے خلاف ڈٹ جاتی اور اراکان اسمبلی کے اعتماد سے محروم وزارت کو سبکدوش کرنے کے ساتھ اکثریت کے اعتماد سے بہرہ مند گروپ کو متبادل وزارت بنانے کا موقع فراہم کرنے کا مطالبہ فراہم کرتی تو نہ صرف جمہوریت پسندی کا بھرم برقرار رہتا بلکہ اس غیر جمہوری اقدام سے پنجاب میں جمہوری قدروں اور مسلم لیگ کو جو نقصان پہنچا ملک و قوم اس سے بھی محفوظ رہتے، لیکن مسلم لیگی لیڈروں نے قیام پاکستان کے بعد صرف اقتدار کے حصول و تحفظ کو ہی مطمع نظر اور نصب العین بنا لیا تھا۔ اس لئے اصولی تقاضوں کو نہ ملحوظ رکھا گیا اور نہ ان کے پامال ہونے پر صدائے احتجاج بلند کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ افراد کی اس خود غرضی اور کوتاہ اندیشی کی صوبے اور بالآخر ملک کو بڑی گراں قیمت ادا کرنی پڑی۔

مرکزی حکومت نے پنجاب اسمبلی کو توڑنے کی یہ وجہ بیان کی تھی کہ سیاسی صورت حال نے یہ کارروائی ناگزیر بنا دی ہے، لیکن مسلم لیگ کے غیر جانبدار حلقوں کا یہ احساس و تاثر تھا کہ جب لیاقت علی خان اپنے معتمد میاں ممتاز دولتانہ کو بطور وزیر اعلیٰ

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۲ر فروری ۱۹۴۹ء

منتخب کرانے کی کوشش میں ناکام ہو گئے، تو اس کے بعد انھوں نے صوبے میں دفعہ ۹۲ (الف) کے نفاذ کی سفارش کی۔ ان حلقوں کے مطابق وزیر اعظم کی خواہش اور ہدایت پر نواب ممدوٹ نے از خود مستعفی ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے ان کے لیے صوبائی اسمبلی کو توڑ دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔

اس سے قطع نظر کہ لیاقت علی خان نے گورنر جنرل کو پنجاب میں گورنر راج نافذ کرنے کی سفارش کیوں کی، یہ امر قابل غور ہے کہ اس فیصلے سے بہر حال جمہوری اقدار مجروح ہوئیں۔ بلاشبہ دولتانہ کو مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے ۸۰ ارکان میں سے ۴۱ کی حمایت حاصل تھی اس لئے چاہیئے یہ تھا کہ انہیں حکومت بنانے کی دعوت دی جاتی نہ کہ آئین معطل کر کے گورنر راج نافذ کر دیا جاتا۔

گورنر راج ایک لحاظ سے پنجاب کے لئے سود مند بھی ثابت ہوا۔ جیسا کہ گورنر سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے اختیارات سیاسی تعصب سے بے نیاز ہو کر بروئے کار لائے گا اس نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ دھڑے بندی اور سیاسی دباؤ سے بے نیاز ہونے کے باعث انتظامی کارکردگی کا معیار بھی بہتر ہو گیا[1]۔ ورنہ اس سے قبل تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ ممبران اسمبلی صوبائی انتظامیہ کے معاملات میں بے پناہ دخل دینے لگے تھے۔ سفارشیں اور سیاسی دباؤ روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں سفارشوں کی تجارت کو بے حد فروغ ہوا اور پھر آہستہ آہستہ یہ بیماری وباء کی صورت اختیار کر گئی اور اب تو یہ حال ہے کہ سفارش افراد کی تقدیر کا حصّہ بن چکی ہے۔

نومبر ۱۹۴۹ء میں لیاقت باری فارمولا کے تحت گورنر کے مشیر مقرر کر دیئے گئے۔ اس اقدام کا مقصد گورنر راج کے دوران میں انتظامیہ اور لیگ میں رابطہ

---

[1] مارشل لاء سے مارشل لاء تک روزنامہ مشرق لاہور ۱۴ اپریل ۱۹۶۴ء

Marfat.com

قائم رکھنا تھا تاکہ عوام کو حکومت میں شرکت کا احساس رہے لیکن یہ انتظام صرف نو ماہ تک جاری رہ سکا۔ مشیرحن کا مرتبہ وزیروں کے برابر تھا، اگست ۱۹۵۰ء میں مستعفی ہو گئے کیونکہ وہ پنجاب مسلم لیگ کی پالیسوں سے پوری طرح متفق نہیں تھے۔ دراصل مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ایک سرکردہ مشیر کے بعض فیصلوں کی مذمت کی تھی اور مشیروں کے عہدے ختم کرنے کے لیے ایک قرارداد منظور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ یہ کوشش ناکام ہوگئی لیکن اس سے مشیر بہت برہم اور ناراض ہو گئے[1]۔

اس اثنا میں ممتاز دولتانہ نے مسلم لیگ کی صفوں میں اتحاد کی ضرورت کا شدت سے احساس کیا اور مصالحت کنندوں کی اپیلوں کے جواب میں صدارت سے رضاکارانہ طور پر مستعفی ہو جانے کی پیشکش کی تاکہ لیگی کارکنوں اور لیڈروں کو متحد کرکے مسلم لیگ کی تیزی سے گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کیا جاسکے[2]۔ بالآخر وہ ۱۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو مستعفی ہو گئے اور ورکنگ کمیٹی نے ان کا استعفا منظور کر لیا۔ اس دوران میں بعض مسلم لیگیوں کی مساعی سے میاں ممتاز دولتانہ اور نواب ممدوٹ میں وقتی طور پر مصالحت بھی ہو گئی۔

ممدوٹ اور دولتانہ نے شانہ بشانہ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں گروپوں نے اتفاق رائے سے میاں عبدالباری کو صدر پنجاب مسلم لیگ نامزد کیا اور وہ اتفاق رائے سے منتخب ہو گئے[3]۔ صدر منتخب ہونے کے بعد انھوں نے کونسل سے خطاب کرتے ہوئے تین باتوں پر زور دیا: یہ کہ مسلم لیگ اپنے انتخابی منشو

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور - ۲۸ اگست ۱۹۵۰ء

[2] ایضاً ۱۹ فروری ۱۹۴۹ء

[3] ایضاً ۱۹ اپریل ۱۹۴۹ء

Marfat.com

پر سرگرمی سے عمل درآمد کرے گی"۔ یہ کہ رشوت ستانی عام ہو گئی ہے اور اس کا انسداد صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ حکومت مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرے[1]۔ کونسل میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت پر زور دیا گیا کہ مغویہ خواتین کی بازیابی کا انتظام کیا جائے اور وہ تمام جاگیریں ضبط کر لی جائیں جو یونینسٹ حکومت نے غداروں کو دی تھیں[2]۔

میاں عبدالباری کے صدر منتخب ہونے کے بعد صوبے کے انگریز گورنر سر فرانسس موڈی کو ہٹانے اور کسی پاکستانی کو گورنر مقرر کرنے کی تحریک شروع کی گئی۔ اس تحریک کا پس منظر یہ تھا کہ جب میاں عبدالباری نے صدر پنجاب مسلم لیگ منتخب ہونے کے بعد صوبے کا دورہ شروع کیا تو ہر جگہ اضلاع کے مسلم لیگی لیڈروں نے ان سے شکایت کی کہ افسروں نے ہمارا اثر و رسوخ ختم کر دیا ہے۔ مسلم لیگ کے مقامی عہدیداروں کو اب کوئی نہیں پوچھتا۔ اور یہ سب کچھ گورنر موڈی کی ہدایت پر ہو رہا ہے۔ وہ اس صوبے میں لیگ کے وقار کو تباہ کر رہا ہے۔ میاں عبدالباری یہ سن کر موڈی کے خلاف جہاد پر تل گئے۔ علاوہ ازیں گورنر نواب ممدوٹ کے خلاف "پروڈا" کے تحت مقدمہ قائم کر رہا تھا اس لئے اس مہم میں وہ بھی میاں عبدالباری کے ہمنوا ہو گئے[3]۔ سب سے پہلے یہ مطالبہ پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد میں کیا، جس میں کہا گیا تھا کہ "آج ہم ایک نئی مملکت کی تعمیر کے دور سے گذر رہے ہیں۔ ہماری تمام تر تعمیری صلاحیتیں اسلامی سیاست، اخلاق، اقتصادیات، معاشرت اور ثقافت کے

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۹ر اپریل ۱۹۴۹ء

[2] ایضاً

[3] بحوالہ مارشل لاء سے مارشل لاء تک صفحہ نمبر ۳۸۱۔

Marfat.com

مرکوز ہونی چاہئیں۔ لیکن گورنر راج ان سب شعبوں میں کوئی مثبت قدم اٹھانے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ یہ بات بے حد افسوس ناک ہے کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سماج دشمن عناصر کو سیاسی گمنامی سے باہر نکال کر اہم عہدوں پر فائز کر دیا گیا ہے۔"[1] کمیٹی نے مرکزی حکومت پر پنجاب میں کسی پاکستانی کو گورنر مقرر کرنے پر زور دیا جو سرکاری مشینری کو عوام کی امنگوں کے مطابق اور عوام کے سامنے جوابدہ بنا سکے۔ گورنر کے خلاف ایک اور الزام جس کا قرارداد میں ذکر نہیں کیا گیا تھا یہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کے خلاف سرگرم عمل ہے اور اس وجہ سے نوکر شاہی بھی تنظیم کی مخالفت کر رہی ہے۔

وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کا اس قرارداد پر ردِ عمل پنجاب کے مسلم لیگیوں کے لئے بڑا حوصلہ شکن تھا۔ انھوں نے پنجاب لیگ کو مشورہ دیا کہ وہ "تعمیری رویہ اختیار کرے اور تخریبی نکتہ چینی سے احتراز کرے"[2]۔ ورکنگ کمیٹی کے انتہا پسند ارکان نے اسے وزیرِ اعظم کی طرف سے پنجاب کے عوام کو چیلنج قرار دیا اور اس بات پر زور دیا کہ مسلم لیگیوں کو یہ چیلنج قبول کر لینا چاہیے۔ انھوں نے صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کی دھمکی دی۔ اس سلسلے میں تند و تیز بحث شروع ہو گئی اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ میاں عبدالباری کراچی جائیں اور اس مسئلے پر چودھری خلیق الزماں سے بات چیت کریں[3]۔ لیاقت علی خان نے ابتدا میں اس تحریک کی سخت مزاحمت کی لیکن بالآخر میاں عبدالباری اور وزیرِ اعظم میں یہ طے پایا کہ چونکہ صوبے میں مسلم لیگ کو سیاسی غلبہ حاصل ہے

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۴ مئی ۱۹۴۹ء

[2] ایضاً ۲۸ مئی ۱۹۴۹ء

[3] ایضاً ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء

Marfat.com

اس لئے اسے صوبائی حکومت سے بالکل الگ رکھنا پڑتی ہو گی ۔چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے چند ارکان گورنر کے مشیر مقرر کر دیئے جائیں جن کا مرتبہ وزراء کے برابر ہو۔ گورنر اور مشیران کے درمیان اختلاف رائے کی صورت میں معاملہ وزیر اعظم کے سامنے پیش کیا جائے جس کا فیصلہ حتمی ہو گا ۔مسلم لیگ کے سیاسی دباؤ کے زیر اثر مشیران کو خاصے اختیارات دیئے گئے جسے گورنر نے پسند نہ کیا۔ علاوہ ازیں وہ میاں عبدالباری اور ان کے نامزد مشیروں کو اپنے ساتھ بٹھانا پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اس کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے تھے ۔ان حالات اور سیاسی دباؤ کے پیش نظر موڈی نے استعفیٰ دے دیا جسے وزیر اعظم نے فوراً قبول کر لیا۔ موڈی کی جگہ سردار عبدالرب نشتر کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا ۔وہ اپنے اخلاص اور تحریک پاکستان میں نمایاں خدمات کے لئے بہت مقبول تھے ۔وہ قائد اعظم کے ایک نہایت وفادار نائب تھے اس لئے ان کے تقرر کو تقریباً تمام حلقوں نے سراہا۔

پنجاب لیگ نے انگریز گورنر کے خلاف اپنی قرارداد میں جن الزامات کا ذکر کیا تھا ان کے علاوہ اس تحریک میں کچھ اور اسباب بھی کارفرما تھے جن کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔کہا جاتا ہے کہ پنجاب میں بعض سیاست دانوں کے خلاف سرکاری طور پر تحقیقات شروع ہو گئی تھیں اور انہیں یہ خوف تھا کہ اگر تحقیقات جاری رہیں تو عوام میں ان کی بدنامی اور رسوائی ہو گی، جو ان کے زوال پذیر سیاسی کردار کے لئے پروانہ موت ثابت ہو گی ۔اس لئے وہ کسی ایسی غیر معمولی بات کے لئے کوشاں تھے جس سے عوام کی توجہ ان سے ہٹ جائے ۔ان کی یہ ضرورت گورنر موڈی کے انگریز ہونے سے پوری ہو گئی ۔مسلم لیگ نے یہ تحریک شروع کر کے سیاست میں نئی زندگی اور توانائی پیدا کر دی۔

Marfat.com

ماضی کے مانند انگریزوں کے خلاف عوامی جذبات کو خوب اُبھارا گیا اور اہم عہدوں پر پاکستانیوں کے تقرر کو پاکستان کے وقار کا سوال بنا دیا گیا۔ چنانچہ موڈی کو رخصت ہونا پڑا[1]۔ اور اس طرح کئی سیاست دانوں کی عزت رہ گئی۔

اپنے زمانہ صدارت میں میاں عبدالباری نے مہاجرین کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ کی۔ شاید اس لئے کہ وہ خود بھی زخم خوردہ تھے۔ انھوں نے مرکزی وزیر بحالیات خواجہ شہاب الدین سے کئی بار ملاقات کی اور مہاجرین کی مستقل آبادکاری کے لئے زور دیا۔ انھوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ سرکاری وفود کی تشکیل میں مہاجرین کو بھی مناسب نمائندگی دی جائے[2]۔ لیکن ان کی یہ کوششیں مرکزی حکومت کے محدود ذرائع کے باعث پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔

اس دوران میں صوبے کی سیاست میں ایک اور تبدیلی آئی۔ گورنر موڈی کے خلاف قائم کردہ متحدہ محاذ اور ایجی ٹیشن کے سبب میاں عبدالباری اور ممدوٹ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے اور ان کے گروپ بھی یکجا ہو گئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دولتانہ کو یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ میاں صاحب غیر جانبدار نہیں رہے حالانکہ وہ اسی کے نامزد کردہ تھے۔ چنانچہ دولتانہ کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ مشیروں کے ذریعے عملاً ان کا مخالف گروہ برسر اقتدار آگیا ہے حالانکہ پنجاب مسلم لیگ میں ان کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ نتیجے کے طور پر دولتانہ نے میاں عبدالباری، مشیران گورنر اور ممدوٹ کے خلاف پھر سرگرمیاں شروع کر دیں اور بالآخر دولتانہ ممدوٹ اتحاد کا بھانڈا حقائق کے چوراہے میں پھوٹ گیا۔

---

[1] "پنجاب کی سیاست"۔ ایم اے کے لئے تنویر احمد کا تحقیقی مقالہ۔ شعبہ سیاسیات۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور جولائی ۱۹۶۳ء ص ۱۱۷

[2] پاکستان ٹائمز لاہور ۴ رجنوری ۱۹۵۰ء

Marfat.com

پنجاب میں عام انتخابات ۱۹۵۰ء کے دوران میں متوقع تھے۔ انتخابات کی تاریخ قریب آنے کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ یہ سرگرمیاں زیادہ تر بند کمروں میں میل ملاپ اور سیاسی معاہدوں تک محدود تھیں۔ مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں نے صوبے کے مختلف علاقوں میں اپنے امیدواروں کی خاطر حمایت و تائید حاصل کرنے کے لئے دورے بھی کئے۔ اور امیدواروں کی طرف سے عام جلسوں میں تقریریں ہوئیں ان میں شاید ہی کسی نے سیاسی اور اقتصادی پروگرام کا ذکر کیا ہوگا۔ اس معاملے میں غیر معمولی احتیاط کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کئی سال سے مسلم لیگی لیڈروں کے وعدوں اور ان کے اعمال و اقدامات میں وسیع خلیج حائل چلی آ رہی تھی۔ اس لئے اب وہ پروگرام کا اظہار ہی نہیں کرتے تھے۔ بہر حال سیاست والوں میں قول و فعل کا تضاد پاکستانی سیاست کا "سنہری اصول" بن چکا ہے، چنانچہ عوام جھوٹ، فریب اور دغا بازی کو سیاست کا دوسرا نام دینے لگے ہیں۔ سیاسی راہنما اور امیدوار اپنے ارادوں اور عزائم کو صیغہ راز میں رکھنے کو ترجیح دیتے تھے تاکہ ایک مرتبہ پھر ان پر وعدہ خلافی کا الزام نہ لگے۔ ظاہر ہے کہ جب عوام کے سامنے اظہار رائے کے لئے ٹھوس مسائل پیش نہ کئے جائیں تو یہ پیش گوئی مشکل نہیں رہتی کہ مستقبل میں عوام کے سامنے بے اصول جوڑ توڑ کا مظاہرہ کیا جائے گا۔

پاکستان میں عمل پیرا ... کے تجزیے سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہاں مختلف سیاسی جماعتیں پروگرام کے اختلاف سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ شخصیتوں کے اختلافات سے جنم لیتی ہیں۔ اسی لئے پاکستان میں ان گنت سیاسی جماعتیں ہیں جو قومی انتشار کی نشاندہی کرتی ہیں۔

پنجاب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۱۱ جون ۱۹۵۰ء کو ہونا طے پایا تھا جس

میں صوبائی لیگ کے لئے نئے آئین کے مسودے پر بحث کی جاتی تھی لیکن اچانک میاں عبدالباری نے یہ اجلاس ملتوی کر دیا جس پر مسلم لیگی حلقے حیرت زدہ رہ گئے۔ اس التوا پر یہ نکتہ چینی بھی کی گئی کہ اس میں صوبائی لیگ کے انتخابات کو معرض التوا میں ڈالنے کا ارادہ کارفرما ہے جس کے بعد عام انتخابات کو بھی ملتوی کرانے کا بہانہ مل جائے گا۔ رمضان المبارک قریب آنے کے باعث مسودہ آئین کو منظور کرنے کے لئے لیگ کونسل کا اجلاس جولائی میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس صورت میں صوبائی لیگ کے انتخابات دسمبر میں مکمل ہونے کی توقع تھی۔ چنانچہ صوبے میں عام انتخابات ۱۹۵۱ء سے پہلے منعقد کرنے کا امکان نہیں تھا۔[1] ان افواہوں کا سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب گورنر نے پنجاب اسمبلی ایکٹ کے نفاذ کا اعلان کیا۔ اس قانون کے تحت پنجاب کے ۱۵۳ حلقوں سے ۱۹۷ ارکان منتخب کئے جانے تھے۔ اس قانون کے تحت مہاجرین کو بھی خصوصی نمائندگی دینے کا اہتمام کیا گیا تھا۔[2]

ممدوٹ اور دولتانہ میں مصالحت معمول کے مطابق عارضی اور گریز پا ثابت ہوئی۔ وہ بہت جلد ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ لیگ کونسل کا اجلاس جولائی میں ہونے کی توقع تھی۔ اجلاس کے ایجنڈے میں دو قرار دادوں نے سیاسی انتقام کی آگ بھڑکا دی۔ دولتانہ گروپ کی طرف سے تجویز کردہ قرار داد میں مشیر اعلیٰ ملک محمد انور کے رویے کی مذمت کی گئی تھی۔ اس قرار داد کا پس منظر یہ تھا کہ میاں ممتاز دولتانہ ممدوٹ کے حامی مشیروں میاں عبدالباری اور ملک محمد انور وغیرہ پر سیاسی دباؤ ڈال کر استعفیٰ

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۹ جون ۱۹۵۰ء

[2] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۲ جون ۱۹۵۰ء

Marfat.com

لینا چاہتے تھے۔ چونکہ گورنر کے مشیر مسلم لیگ کے ممتاز عہدے تھے اس لیے انہیں ہٹانے کے لیے مسلم لیگ سے عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرانا ضروری تھا۔ میاں ممتاز دولتانہ کو کونسل میں اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ انھوں نے ایجنڈا میں ملک محمد انور کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک شامل کروادی انتقام کے طور پر ممدوٹ گروپ نے دوسری قرارداد تجویز کردی جو میاں ممتاز دولتانہ کی مذمت پر مبنی تھی[۱]۔ دونوں دھڑوں میں زیادہ سے زیادہ کونسلروں کی حمایت حاصل کرنے کی جنونی دوڑ شروع ہو گئی۔ میاں عبدالباری نے مشیروں کی مدد سے تیسرا گروپ بنا کر دونوں متحارب دھڑوں میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی لیکن مشیر کوئی حتمی موقف اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے چنانچہ آخری مرحلے میں ممدوٹ گروپ میاں عبدالباری کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو گیا[۲]۔

پنجاب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۲۴ جولائی ۱۹۵۰ء کو ہوا حسب توقع اجلاس میں تمام مسائل پر بحث و غور کے دوران میں دھڑے بندی سایہ فگن رہی۔ اجلاس میں گڑبڑ اور انتشار و خلفشار کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ صدر اجلاس نے حالات پر قابو پانے کی بڑی کوشش کی لیکن اس کی بے بسی دیدنی تھی۔ جو گروپ کوئی ترمیم پیش کرتا وہ اپنے حمائتیوں کے شوروغل سے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا کہ اس کی تجویز منظور ہو گئی ہے۔ کونسل نے آئین کے مسودے پر بھی بحث کی اور یہ ترمیم منظور کر لی کہ متناسب نمائندگی کے بجائے

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۸ جولائی ۱۹۵۰ء

[۲] پاکستان ٹائمز لاہور ۸ جولائی ۱۹۵۰ء (نوٹ: صوبائی کابینہ کی غیر موجودگی میں گورنر کے مشیر مقرر کیے گئے تھے جن کا مرتبہ وزراء کے برابر تھا۔)

Marfat.com

کونسلروں کا انتخاب بھی کثرت رائے سے ہونا چاہیئے۔ ایک اور ترمیم کے ذریعے یہ پابندی عاید کر دی گئی کہ صدر اپنی ورکنگ کمیٹی نامزد کرنے کے بعد اپنے عہدہ کی میعاد کے دوران میں اسے توڑنے کا مجاز نہیں ہوگا[1]۔

پنجاب مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس میں ہر معاملے پر بحث و غور کے دوران میں ملکی یا جماعتی جذبے کے بجائے دھڑے بندی کا رنگ کارفرما رہا۔ جونہی ملک محمد انور کے خلاف قرارداد پیش ہوئی اجلاس میں طوفان بپا ہو گیا۔ میاں عبدالباری نے فیصلہ صادر کیا کہ اس قرارداد پر رائے شماری خفیہ ووٹوں سے ہوگی۔ دولتانہ گروپ نے اس فیصلے کو چیلنج کیا۔ اس پر تو تکار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ قائداعظم کی تربیت کا ان لوگوں کے کردار پر کیا اثر پڑا اس بات کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ قائداعظم سالہا سال تک انہیں نظم و ضبط کی تربیت دیتے رہے لیکن اب یہ عالم تھا کہ جب بھی مسلم لیگ کا کوئی اجلاس ہوتا مچھلی بازار کا سا منظر دکھائی دیتا۔ اجلاسوں کی یہ بدنظمی ایک بڑی حد تک ہمارے سیاسی لیڈروں کے کردار کی عکاسی کرتی تھی۔ بہر حال صدر نے جب یہ دیکھا کہ وہ اجلاس میں ضبط و نظم برقرار نہیں رکھ سکتا تو اس نے اجلاس ملتوی کر دیا۔ دولتانہ گروپ نے اس پر احتجاج کیا اور ہال سے باہر جانے سے انکار کر دیا۔ جب مخالف گروپ کے کونسلر چلے گئے تو دولتانہ گروپ نے مولانا اختر علی کو اجلاس کا صدر منتخب کرنے کے بعد کارروائی جاری رکھی۔ اجلاس میں میاں ممتاز دولتانہ کی پیش کردہ دو قراردادیں منظور کی گئیں۔ ایک قرارداد میں میاں عبدالباری کے فیصلے کو منسوخ کیا گیا اور دوسرے کے ذریعے ملک محمد انور کے خلاف قرارداد مذمت کی توثیق کی گئی[2]۔ اس طرح حالات نے

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۵ جولائی ۱۹۵۰ء، [2] ایضاً

ایسا رخ اختیار کر لیا کہ میاں عبدالباری کے لیے مستعفی ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کیونکہ بالواسطہ یہ قرارداد بہرحال میاں صاحب ہی کے خلاف تھی۔

دولتانہ اور ممدوٹ گروپوں میں سیاسی بالادستی کے لئے طویل اور شدید رسہ کشی ۲۵ جولائی ۱۹۵۰ء کو نقطۂ عروج کو پہنچی جب میاں عبدالباری مستعفی ہو گئے۔ انھوں نے دولتانہ کی سرگرمیوں کے خلاف بطور احتجاج استعفا دیا۔ ان کے مطابق دولتانہ نے آل پاکستان مسلم لیگ کی ہائی کمان کو صوبائی لیگ کے خلاف صف آرا کرنے کی سازشی حیلہ بازی سے صوبائی جماعت کی عزت اور ساکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔[1] پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۱ اگست ۱۹۵۰ء کے اجلاس میں میاں عبدالباری کا استعفا منظور کر لیا۔ نواب ممدوٹ اور ان کے ساتھی اس اجلاس سے احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے۔ ورکنگ کمیٹی نے صوفی عبدالحمید (دولتانہ کے نامزد کردہ امیدوار) کو نیا صدر منتخب کر لیا جنہوں نے عہدہ صدارت سنبھالنے کے بعد یہ کہا کہ مسلم لیگ کو پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کے تحفظ کے لئے انقلابی کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ (اور یہ انقلابی کردار شاید مخالف دھڑے کو ٹھکانے لگائے بغیر ادا نہیں ہو سکتا تھا) اس کے ساتھ انھوں نے مہاجرین کی آبادکاری کو دوسرے تمام مسائل پر ترجیح دینے کا وعدہ کیا۔[2] صوفی صاحب نے نئی عاملہ میں نواب ممدوٹ کو بھی جگہ دی اور انھوں نے وقتی طور پر اس سے انکار نہ کیا۔

نواب ممدوٹ بالآخر سیاسی صورت حال سے مایوس اور بددل ہو کر مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے مل کر اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ایک

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۶ جولائی ۱۹۵۰ء

[2] ایضاً ۲۲ اگست ۱۹۵۰ء

Marfat.com

اور جماعت "جناح مسلم لیگ" قائم کر لی۔ اس کا نصب العین قائداعظم کے تصورات کے مطابق صحیح اسلامی جمہوریت کا قیام قرار دیا گیا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے لئے نواب ممدوٹ اور ان کے والد کی خدمات لائق تحسین تھیں اگرچہ وہ ذاتی طور پر اپنے سیاسی حریف میاں ممتاز دولتانہ کی طرح ذہین، شاطر اور سیاسی جوڑ توڑ کے ماہر نہیں تھے لیکن اکثر حلقے ان کی ذاتی شرافت کے بارے میں خوش گمان تھے۔ مسلم لیگ سے علیحدگی ان کے لئے کوئی خوشگوار فیصلہ نہیں، لیکن وہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہونے پر اس لئے مجبور رہوئے کہ دولتانہ نے ان کے لئے مسلم لیگ میں رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بنا دیا تھا۔ مزید برآں جماعت کی ہائی کمان میں بھی میاں ممتاز دولتانہ کو ان کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ اثر و نفوذ حاصل ہو گیا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا۔ ممدوٹ نے ایک طویل بیان میں ان عوامل و محرکات کی نشان دہی کی جن کی وجہ سے وہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہونے اور ایک نئی جماعت بنانے پر مجبور ہوئے تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں حسب ذیل وجوہ کا خاص طور پر ذکر کیا۔ پارٹی میں جوڑ توڑ اور سازشیں، حکومت کی غلط خارجہ پالیسی، شہری آزادیوں کا فقدان، مہاجرین کی بحالی میں ناکامی، آئین سازی میں تاخیر۔ پارٹی میں جمہوری اصولوں کی پامالی اور ملک کی وزارت عظمیٰ اور لیگ کی صدارت کی یکجائی، جس نے مسلم لیگ کو حکومت کی لونڈی بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان وجوہ کی بنیاد پر انھوں نے مسلم لیگ سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کیا[۱]۔ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور نے نواب ممدوٹ کے استعفیٰ کو "انجام کا آغاز" یعنی مسلم لیگ کے خاتمہ کی ابتدا قرار دیا[۲]۔ حالانکہ بنظر غائر دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ اس انجام کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا۔

۱؎ پاکستان ٹائمز ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۰ء ۲؎ نوائے وقت۔ لاہور ۲ نومبر ۱۹۵۰ء

Marfat.com

دریں اثنا پنجاب میں عام انتخابات کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ میاں ممتاز دولتانہ نے صوبہ گیر انتخابی مہم شروع کر دی اور کئی مقامات پر مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کیا۔ پنجاب مسلم لیگ نے اپنا انتخابی منشور ۲۱ نومبر ۱۹۵۰ء کو جاری کیا۔ یہ منشور کئی مسائل و معاملات کو محیط تھا۔ مثلاً دیہی اقتصادیات، دیہی ترقی، مہاجرین کی بحالی، صنعتی تعمیر و ترقی، مزدوروں کے مسائل اور بیروزگاری، شہری آزادیاں، تعلیم، صحت اور تعمیرات عامہ، شہری تنازعات اور اقلیتیں۔ منشور میں جاگیروں اور انعامات کو فوری طور پر منسوخ کرنے کا پروگرام بھی شامل تھا۔ صوبے بھر میں "ایک یوم منشور" بھی منایا گیا۔ اس موقع پر عام جلسوں کا انتظام بھی کیا گیا۔

مسلم لیگ کے ٹکٹ کے لئے ۸۰۰ سے زائد امیدواروں نے درخواستیں دیں اور مسلم لیگ اور اس کے پروگرام سے وفاداری کا عہد و پیمان کیا۔[1] مسلم لیگ نے تمام امیدواروں کے حلقوں کا دورہ کر کے ان کے دعاوی کی چھان بین کرنے اور اپنی سفارشات پیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی۔ یہ کمیٹی ان پانچ اصحاب پر مشتمل تھی۔ اے بی حلیم۔ غلام نبی پٹھان۔ ملک شریف الدین۔ سید حسن محمود اور خان ابراہیم خان۔ پارلیمانی بورڈ کا اجلاس فروری ۱۹۵۱ء میں ہوا اور ۱۹۷ امیدواروں کو مسلم لیگ کے ٹکٹ دیئے گئے۔[2]

دوسری طرف دسمبر ۱۹۵۰ء میں نواب ممدوٹ اور حسین شہید سہروردی نے اپنی جماعتوں کو "جناح عوامی مسلم لیگ" کے نام کے تحت مدغم کر دیا تھا۔ یہ نئی پارٹی ان امیدواروں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی جنہیں مسلم لیگ نے ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی وفاداری اس نئی جماعت سے قائم

---

[1] ڈان کراچی۔ ۲۲ جنوری ۱۹۵۱ء

[2] پاکستان ٹائمز۔ لاہور ۳ فروری ۱۹۵۱ء

Marfat.com

کر لی۔ ویسے بھی پاکستان کی سیاست میں ہمیشہ "وفاداری بشرط استواری" کا اصول کارفرما رہا ہے۔ جن امیدواروں کو مسلم لیگ سے ٹکٹ نہیں ملے تھے ان میں ایک تہائی کو جناح عوامی مسلم لیگ نے اپنا لیا۔ پاکستان میں ضمیر کی کسی خلش کے بغیر محض ذاتی مفاد کے لئے سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کا آغاز پنجاب کے ان انتخابات سے ہوا اور وہ بھی اس لئے کہ اس سے پہلے کبھی اس طرح کے انتخابات ہوئے ہی نہیں اور اس کے بعد اس غیر جمہوری اور قابل نفرت رسم نے رواج اور روایت کی حیثیت حاصل کر لی، حتیٰ کہ ایک مرحلے پر ایسے لوگوں کے لئے "سیاسی مسافروں" کی اصطلاح زبان زد خلائق ہو گئی۔ پنجاب میں دونوں پارٹیاں یعنی دولتانہ اور ممدوٹ گروپ ایک مرتبہ پھر طاقت آزمائی کے لئے صف آرا ہو گئے۔ یہ انتخابات اس لحاظ سے اہم اور فیصلہ کن تھے کہ ان میں ہر دو دھڑوں کے سیاسی مقدر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پنجاب میں مسلم لیگ کی حمایت و امداد میں سرگرم حصہ لیا۔ اُنھوں نے پنجاب کا مفصل دورہ کیا اور کئی مقامات پر عام جلسوں سے خطاب کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ مسلم لیگ عوام کی فلاح و بہبود کی علمبردار ہے ہر فرد کی روٹی، کپڑے، مکان اور تعلیم کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔ جہاں کہیں بھی وہ گئے اُنھوں نے مسلم لیگ کو قائد اعظم کی مقدس امانت قرار دیا۔ گجرات میں اُنھوں نے اعلان کیا "میں ان سیاست دانوں میں سے نہیں ہوں جو محض ووٹ لینے کے لئے جھوٹے وعدے کرتے ہیں"[۱]۔ اس زمانہ میں لیاقت کی ذاتی مقبولیت نقطۂ عروج پر تھی۔ مسلم لیگ کے خلاف جو دوسری پارٹیاں صف آرا تھیں ان کے قائدین عوام میں اتنے مقبول نہیں تھے جس قدر لیاقت علی خان۔

۱؎ ڈان کراچی ۳ر مارچ ۱۹۵۱ء

Marfat.com

علاوہ ازیں لیاقت علی خان کی اقتصادی پالیسوں کی کامیابی نے رحجان کوریا کے باعث پاکستان کی برآمدات میں غیر معمولی اضافہ نے ملکی معیشت پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی انتخابی کامیابی کے لئے راہ ہموار کر دی۔

لیاقت علی خان اور مس فاطمہ جناح کے اختلافات کی صدائے بازگشت مدت سے سنی جارہی تھی لیکن یہ حقیقت بھی انہی انتخابات کے دوران منکشف ہوئی جب نواب ممدوٹ نے یہ اعلان کر دیا کہ مادر ملت جناح عوامی لیگ کی حمایت کے لئے پنجاب کا دورہ کریں گی اور مادر ملت کی جانب سے اس بیان کی تردید نہیں کی گئی۔ بہرحال مادر ملت بدستور سیاست سے کنارہ کش رہیں اور انھوں نے ان انتخابات میں کوئی حصہ نہ لیا۔ مادر ملت اور قائد ملت کے اختلافات کی اصل نوعیت کیا تھی، اس بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے لیکن عام خیال یہی ہے کہ اس بدمزگی کی بنیاد بیگم رعنا لیاقت علی خان کی خاتون اوّل بننے کی خواہش نے رکھی قائد اعظم کی شدید علالت کے دوران میں لیاقت علی کے رویے نے بھی ان غلط فہمیوں کو مزید تقویت دی۔

انتخابات ہوئے اور نتائج نے پنجاب میں مسلم لیگ کی مقبولیت پر مہر توثیق ثبت کر دی۔ ۱۹۴ حلقوں میں سے مسلم لیگ نے ۱۵۲ میں[1] کامیابی حاصل کی۔ جبکہ جناح عوامی لیگ کے صرف ۲۹ امیدوار کامیاب ہوئے۔ بعد میں کئی آزاد ارکان نے بھی مسلم لیگ میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا چنانچہ جولائی میں ۱۷ آزاد ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

انتخابات کے زمانے میں پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر تھے۔ ان کی ذاتی شرافت کے باعث اور قائد اعظم کا معتمد نائب ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کے

لہ پاکستان ٹائمز لاہور ۳ر اپریل ۱۹۵۱ء

Marfat.com

سیاسی مخالفین بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ لیکن جب ان کی گورنری کے زمانے میں کئی حلقوں کے انتخابات میں دھاندلیاں ہوئیں اور ان حلقوں میں سرکاری مشینری نے کھلم کھلا مسلم لیگی امیدواروں کی ناجائز امداد کی تو اس پر سردار نشتر کے مداحوں کو سخت تعجب اور صدمہ ہوا۔

اگرچہ اس الزام کے حق میں کوئی دستاویزی ثبوت نہیں مل سکا کہ یہ دھاندلیاں وزیرِ اعظم یا گورنر کے ایماء پر کی گئی تھیں پھر بھی ان کا علم ہو جانے کے باوجود حکومت کی طرف سے اس ضمن میں خاموشی اور پردہ پوشی کی کوششیں، شک و شبہ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ حالانکہ غالب خیال یہی ہے کہ جن چند حلقوں میں دھاندلیاں ہوئیں یا عرفِ عام میں "جھرلو" استعمال ہوا وہ بڑی حد تک دولتانہ صاحب کے منہ بولے ابا جان قربان علی خاں آئی جی پولیس کی کارستانی تھی۔ پنجاب میں اس انتخاب کو قربان علی خاں کا انتخاب کہہ کے یاد کیا جاتا رہا۔ اور اس میں گورنر یا وزیرِ اعظم کا کوئی عمل دخل نہیں تھا

اس زمانے میں مسلم لیگ دوسری جماعتوں کے مقابلے میں اتنی مضبوط اور مقبول جماعت تھی کہ اگر اس کے امیدوار دھاندلی سے کام نہ بھی لیتے اور

لہ ایک مثال سعید احمد کرمانی کے حلقہ انتخاب کی تھی جو مسلم لیگی امیدوار تھے۔ ان کے مقابلے پر مزدور لیڈر مرزا ابراہیم امیدوار تھے۔ اتفاق سے لاہور کے اس حلقے میں ریلوے ملازمین کثرت سے تھے اس لئے مرزا ابراہیم کے جیتنے کے امکان روشن تھے۔ بہر حال مرزا ابراہیم کو انتخابات سے قبل گرفتار کر لیا گیا اور انتخاب کے روز ان کے بہت سے بیلٹ پیپرز اس لئے Disqualify کر دیے گئے کہ ان پر داغ دھبے تھے۔ چنانچہ کرمانی صاحب جیت گئے۔ تفصیل کے لئے دیکھیے طارق علی خان کی کتاب Pakistan : Miltary Rule or People's Power لندن ۱۹۷۰ء صفحہ نمبر ۴۲-۴۱

سرکاری مشینری غیر جانبدار بھی رہتی تو بھی مسلم لیگ کو بھاری کامیابی نصیب ہو جاتی۔ مخالف راہنماؤں کا خیال تھا کہ لیاقت علی خان اپوزیشن کے معاملے میں بڑے سریع الحسّ تھے اور وہ پاکستان کے واحد اپوزیشن لیڈر سہروردی سے بھی بڑے خائف تھے۔ اس لئے ان کی خواہش و کوشش تھی کہ سہروردی کی پارٹی کو پنجاب میں کسی قیمت پر بھی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو۔ بہر حال پنجاب میں مسلم لیگ نے شاندار کامیابی حاصل کر لی، لیکن ساتھ ہی انتخابات کی آزادی اور سرکاری مشینری کی غیر جانبداری کی روایت بھی، جسے ابھی پروان چڑھنا تھا پامال ہو گئی۔ اس روایت کی پامالی نے نہ صرف پاکستان میں جمہوریت کے فروغ و استحکام پر بُرا اثر ڈالا بلکہ پنجاب کے بعد اس روایت کی تقلید میں بہاولپور سندھ اور سرحد کے صوبائی انتخابات میں بھی دھاندلیاں اور بدعنوانیاں بڑے وسیع پیمانہ پر روا رکھی گئیں۔ بہاولپور میں تو اتنی بڑی تعداد میں مسلم لیگ کے امیدوار بلا مقابلہ منتخب کرا لئے گئے کہ مرکزی حکومت نے (اس زمانہ میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم تھے) ساری انتخابی کارروائی کالعدم قرار دے کر از سرِ نو انتخابات کا اہتمام کیا۔

انتخابات کے بعد میاں ممتاز دولتانہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر منتخب کر لئے گئے۔ گورنر نے انہیں وزارت بنانے کی دعوت دی۔ پنجاب کی کابینہ میں وزیر اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ کے علاوہ صوفی عبد الحمید، سردار عبد الحمید دستی، چودھری محمد حسین چٹھہ۔ شیخ فضل الٰہی پراچہ اور سید علی حسین گردیزی شامل ہوئے۔ وزارت بنانے کے بعد دولتانہ نے مسلم لیگ کے منشور پر مکمل عمل درآمد کا وعدہ کیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے زرعی اصلاحات، مہاجرین کی بہ عجلت

Marfat.com

تمام بحالی، فلاح و بہبود عامہ میں توسیع اور صنعتی ترقی کا خاص طور پر ذکر کیا۔[1]
لیکن وزیر اعلیٰ کے طور پر میاں ممتاز دولتانہ نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ
اپوزیشن کے حامی اخبار "نوائے وقت" کی بندش تھا۔ مسلم لیگ نے اپنے منشور
میں بنیادی حقوق اور شہری آزادی کے تحفظ و فروغ کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن
"نوائے وقت" سے دولتانہ اور ان کے سرپرست لیاقت علی خان دونوں سخت
ناخوش اور برہم تھے۔ اس برہمی کا برملا اظہار دولتانہ نے لاہور کے ایک عام جلسے
میں کیا، جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ انھوں نے "نوائے وقت" کو کیوں بند کیا
ہے تو انھوں نے جواب دیا "ہمیں تو یہ افسوس ہے کہ یہ کام ہم نے اقتدار سنبھالنے
کے پہلے دن کیوں نہ کیا اور تین دن کی تاخیر کیوں ہوئی؟" قیام پاکستان کے بعد
اپنے سیاسی مخالفین کے بارے میں یہ تنگ نظری اور عدم رواداری صرف
ممتاز دولتانہ تک محدود نہ تھی بلکہ اکثر و بیشتر دوسرے سرکردہ مسلم لیگی اپنی ذات
اور پاکستان کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے اور اختلاف رائے کو ذاتی دشمنی بلکہ وطن دشمنی قرار دیتے
تھے۔ مسلم لیگ کے تدریجی زوال میں اس تنگ نظری نے بھی جو دراصل
سیاسی ناپختگی کی علامت تھی، بہت اہم اور دوررس رول ادا کیا۔

انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل کر لینے کے بعد مسلم لیگ کسی خوف اور خدشے
کے بغیر ان لوگوں کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کی پوزیشن میں تھی، جنھوں نے
انتخابات میں جماعتی نظم و ضبط کو ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے
انتخابات کے بعد پہلے اجلاس میں ۴۷ ارکان کی "تطہیر" کی اور انہیں پانچ
سال کے لئے جماعت سے خارج کر دیا۔ یہ کارروائی مسلم لیگ کے سرکاری
امیدواروں کی طرف سے موصول ہونے والی شکایت کی بنیاد پر کی گئی کہ

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۷، اپریل ۱۹۵۱ء

Marfat.com

ان لوگوں نے انتخابات میں مسلم لیگ کے باضابطہ امیدواروں کی حمایت نہیں کی تھی۔[1]

میاں ممتاز دولتانہ نے مسلم لیگ کے انتخابی منشور پر عمل درآمد کرنے اور عام لوگوں کی حالت بہتر بنانے کے ارادے سے آغاز کار کیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے ہر ضلع میں مشاورتی کمیٹی قائم کرائی۔ ان کمیٹیوں کا مقصد مفاد عامہ کے معاملات میں ضلعی انتظامیہ کو مشورہ دینا تھا۔[2] اس سلسلے میں یہ بھی بیان کیا گیا کہ یہ مشاورتی کمیٹیاں ضلعی انتظامیہ اور عوام میں قریبی رابطہ قائم کریں گی۔ یہ ایک مفید تجویز تھی جس کا ایک فائدہ یہ ہو سکتا تھا کہ اس طرح ضلعی انتظامیہ کو لوگوں کی عام مشکلات سمجھنے میں مدد مل سکتی تھی، دوسرا فائدہ یہ ہو سکتا تھا کہ اس طرح نوکر شاہی کے ان رجحانات، خاص طور پر احساس حاکمیت اور غرور کے انسداد میں مدد ملتی جو حکام کو عوام سے دُور رکھتے ہیں۔

دولتانہ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ پنجاب میں زرعی اصلاحات کے نفاذ میں پہل تھا۔ اس معاملے میں دولتانہ کو بہت سخت سیاسی دباؤ کا بھی مقابلہ کرنا پڑا، کیونکہ پنجاب اسمبلی کے اکثر و بیشتر ارکان بڑے زمیندار تھے اور وہ کسی ایسے قانون کو بہ طیب خاطر قبول نہیں کر سکتے تھے جس سے ان کے اپنے مفادات پر زد پڑتی ہو لیکن دولتانہ مسلم لیگ کے منشور پر قائم رہے جس میں زرعی اصلاحات کا بھی وعدہ کیا گیا تھا۔ مجوزہ زرعی اصلاحات کی توثیق کرنے کے لئے پنجاب مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس اکتوبر ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ ان اصلاحات

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۴ر جولائی ۱۹۵۱ء

[2] ایضاً ۲۸ر جون ۱۹۵۱ء

Marfat.com

کے تحت زمینداروں اور مزارعین کا پیداوار میں حصہ علی الترتیب ۴۰ اور ۶۰ فیصد مقرر کر دیا گیا۔ مالیہ، آبیانہ اور دوسرے سرکاری واجبات بھی اس تناسب سے ادا کیے جانے تھے۔ ان اصلاحات کے تحت "خود کاشت رقبہ" کی بھی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی گئی جو ۵۰ ایکڑ بیراب اور ۱۰۰ ایکڑ بارانی تھی۔ اصل تجویز کے برعکس باغات، جنگلات، مویشی فارم، بیج فارم ان پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دے دیئے گئے۔[۱]

یہ زرعی اصلاحات بلاشبہ پنجاب بلکہ مغربی پاکستان میں اپنی نوعیت کا انوکھا قدم تھیں، لیکن ہر اعتبار سے محدود اور ناکافی تھیں۔ اس سے قبل مسلم لیگ نے زرعی اصلاحات کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے ملکیت اراضی کی زیادہ سے زیادہ حد ۲۵۰ ایکڑ تجویز کی تھی۔ دولتانہ زرعی اصلاحات میں ملکیت اراضی کی حد مقرر کرنے کے بجائے "خود کاشت" رقبہ کی حد مقرر کی گئی۔ اس طرح زمینداروں کے مفاد پر کوئی خاص اثر نہ پڑا۔[۲] مزید برآں باغات، جنگلات وغیرہ کی صورت میں جو رعایت دی گئی اس سے بڑا ناجائز فائدہ اُٹھایا گیا اور زمینداروں نے مزروعہ زمین کو باغات وغیرہ ظاہر کر کے مزارعین کو بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ دولتانہ حکومت نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے بے دخل مزارعین کو سرکاری اراضی پر آباد کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا پنجاب بلکہ پاکستان میں پہلا اقدام تھا۔ اگرچہ یہ زرعی اصلاحات بہت محدود اور برائے نام تھیں لیکن بڑے زمینداروں نے ان کی مخالفت کرنے اور انہیں ناکام بنانے کی پوری کوشش کی اور اس سلسلے میں اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے مذہب کو بھی استعمال کیا اور بعض بڑے زمیندار ارکان اسمبلی نے انجمن تحفظ حقوق زمینداران

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء

[۲] دولتانہ صاحب نے بقول میاں امیرالدین صاحب لیگی عمران اسمبلی سے کہہ دیا تھا کہ منشور کی رُو سے عوام کو قدرے خوش کرنا مقصود ہے کسی سے بھی زمین لینا مقصود نہیں۔ بل پاس کرائیے۔ آپ کا کوئی زیاں نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

تحت الشریعہ بنائی۔ زمینداروں کی اس مخالفت کے باوجود روشن خیال اور ترقی پسند حلقوں نے زرعی اصلاحات کو سخت ناکافی اور محض نمائشی قرار دیا اور ایک حلقے کا یہ بھی تاثر تھا کہ دولتانہ نے ان اصلاحات سے زمینداروں کو انقلاب سے محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس دوران میں مسلم لیگ کے دستور میں تبدیلی کر کے وزراء پر جماعتی عہدوں کی پابندی ختم کی جا چکی تھی۔ چنانچہ مرکز میں وزارت عظمی اور مسلم لیگ کی صدارت کو یکجا کرنے کی روایت کے پیش نظر پنجاب میں بھی میاں ممتاز دولتانہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے[۲] اور ان کے پیشرو صدر صوفی عبدالحمید نائب صدر بن گئے۔ گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر لیاقت علیخان کے قتل کے بعد ایک مرتبہ پھر مرکز میں وزیر بن گئے اور ان کی جگہ آئی آئی چندریگر پنجاب کے گورنر مقرر ہوئے[۱]

پاکستان مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس جنوری ۱۹۵۲ء میں ہوا، اس میں پنجاب مسلم لیگ کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات کی توثیق کی گئی اور ان پر جلد از جلد عمل درآمد کی ہدایت کی گئی۔ علاوہ ازیں ورکنگ کمیٹی نے کسانوں کے مسئلہ کو دوسرے سب معاملات پر فوقیت دینے کا عزم ظاہر کیا[۳]۔ اس اجلاس کے صرف ایک ہفتہ بعد پنجاب اسمبلی نے زرعی اصلاحات کا قانون منظور کر کے مسلم لیگ کا ایک وعدہ پورا کر دیا۔ اس کے ساتھ صوبے بھر میں تمام جاگیریں کسی معاوضہ کے بغیر منسوخ کر دی گئیں۔ اس سلسلہ میں قانون میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ آئندہ کوئی جاگیر قائم نہیں کی جائے گی[۴]۔ البتہ فوجی خدمات کے صلے میں ملنے والی اور مذہبی اداروں سے منسلک جاگیروں کو اس قانون کے اطلاق

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۸ اکتوبر ۱۹۵۱ء [۲] پاکستان ٹائمز لاہور ۵ جنوری ۱۹۵۲ء

۸ اکتوبر کے بعد کا کوئی اخبار ہو گا کیونکہ لیاقت علی خاں ۱۶ اکتوبر کو قتل ہوئے تھے۔

۶ نومبر ۱۹۵۱ء [۳] ایضاً ۱۸ جنوری ۱۹۵۲ء

Marfat.com

سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے دولتانہ زرعی اصلاحات اپنی جگہ اس نوعیت کا اولین اور جرات مندانہ اقدام ہونے کے باوجود ناکافی اور محدود الاثر تھیں۔ اس لئے نچلے زرعی طبقے کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچا اور روشن خیال اور ترقی پسند عناصر بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ اس طرح زرعی اصلاحات کا بنیادی مقصد تو پورا نہ ہوا۔ بہرحال یہ توقع پیدا ہو گئی کہ ان سے مستقبل میں مزید اور وسیع اصلاحات کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ دوسری طرف جن بڑے زمینداروں کا تعلق مسلم لیگ سے تھا، انھوں نے بھی اصلاحات کی زبردست مخالفت کی۔ انھوں نے جو "انجمن تحفظ حقوق زمینداران تحت الشریعۃ" بنائی اس میں مسلم لیگ کے بھی کئی ارکان اسمبلی شامل تھے۔ اس انجمن کے سربراہ پیر نوبہار شاہ تھے۔ جماعت نے ان کی سرگرمیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ان پر جماعتی نظم و ضبط کی خلاف ورزی کا الزام عاید کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ پیر صاحب زرعی اصلاحات کے خلاف اپنے بیانات اور سرگرمیوں پر ایک اخباری بیان کے ذریعہ معذرت کریں۔[1]

دولتانہ وزارت نے "بڑھاؤ اناج کی پیداوار" مہم بھی شروع کی اور مسلم لیگ کے کارکنوں سے کہا گیا کہ وہ خوراک کی ذخیرہ اندوزی اور چوربازاری کے انسداد کے سلسلے میں حکومت سے تعاون کریں۔ مسلم لیگ کی ایک خاص کمیٹی بھی قائم کی گئی جس کے ارکان کو یہ ذمہ داری تفویض کی گئی کہ وہ ہر ضلع کا دورہ کریں اور عوام کو زرعی اصلاحات اور "بڑھاؤ اناج کی پیداوار" مہم کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کریں۔[2] علاوہ ازیں تمام ضلعی مسلم لیگیوں کے صدروں پر

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۴؍جولائی ۱۹۵۱ء

[2] ایضاً ۲۸؍جون ۱۹۵۱ء

مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی جسے انتظامیہ میں اصلاح احوال اور صوبائی انتظامیہ میں رشوت ستانی، نا اہلیت اور اقربا نوازی کے انسداد کے لئے سفارشات پیش کرنے کی ہدایت کی گئی لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ ساری کارروائی محض نمائشی کھیل تھا اور نہ ہی مسلم لیگ کے ضلعی صدروں میں ایسی سفارشات پیش کرنے کی اہلیت تھی اور نہ رشوت ستانی اور اقربا نوازی کا انسداد دولتانہ صاحب کے بس کا روگ تھا۔ جس نوعیت کا سیاسی ڈرامہ یہاں کھیلا جا رہا تھا اس میں رشوت ستانی، اقربا نوازی اور نا اہلیت کے فروغ میں سب سے زیادہ حصہ خود مسلم لیگ کے راہنماؤں کا تھا جو دنیا دی فائدے حاصل کرنے کے لئے اصولوں سے بے نیاز ہو چکے تھے اور جن کا اپنا کردار شرمناک تھا۔

دسمبر ۱۹۵۲ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ منظرِ عام پر آگئی اور اس پر ایک نہ ختم ہونے والی بحث شروع ہو گئی۔ یہ رپورٹ پنجاب کے لئے قابلِ قبول نہیں تھی۔ میاں ممتاز دولتانہ جنوری ۱۹۵۳ء میں کراچی گئے اور انھوں نے مسلم لیگ کے لیڈروں اور مرکزی کابینہ کے ارکان کو اس رپورٹ کے بارے میں پنجاب کے عوام کے احساسات سے آگاہ کیا۔[۱] اس دوران میں لاہور میں کئی مذاکرے بھی ہوئے جن میں رپورٹ پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور بڑی بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا۔ سردار عبدالرب نشتر جو اس کمیٹی کے ایک اہم رکن تھے خود لاہور آئے اور انھوں نے پنجاب لیگ کی کونسل سے خطاب کیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے رپورٹ کے اسلامی پہلوؤں کی وضاحت کی، لیکن اس کے باوجود لیگ کونسل نے اس بات پر زور دیا کہ دستور ساز اسمبلی کو رپورٹ پر غور و خوض ملتوی کر دینا چاہیے۔ کونسل نے اس سلسلہ میں صوبائی لیگ کی ورکنگ کمیٹی

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۸ جنوری ۱۹۵۳ء

Marfat.com

کو لیگ ہائی کمان سے بات چیت کرنے کا اختیار دیا۔ انہی دنوں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین خود لاہور آئیں گے اور بہ سر موقع پنجاب کے عوام کا ردّ عمل معلوم کریں گے [۱]۔ لیکن ان مساعی اور اقدامات سے پنجاب کے لیگی مطمئن نہ ہوئے۔ بالآخر بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر غور و خوض ملتوی کر دیا گیا اور دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بھی غیر معیّنہ عرصے کے لئے ملتوی ہو گیا [۲]۔

۲۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو میاں ممتاز دولتانہ اور ان کی کابینہ مستعفی ہو گئی جس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک وجہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ تھی جس نے خواجہ ناظم الدین اور میاں ممتاز دولتانہ کے مابین اختلافات کی خلیج کو وسیع تر کر دیا تھا۔ اس بات کا بعد میں انکشاف ہوا تھا کہ میاں ممتاز دولتانہ اگرچہ اس کمیٹی کے رکن تھے لیکن انھوں نے اس کی رپورٹ پر اختلافی نوٹ کے ساتھ دستخط کئے تھے۔ دوسری وجہ قادیانیوں کے خلاف تحریک تھی جسے عام طور پر "ختم نبوت تحریک" کہا جاتا ہے [۳]۔ اس تحریک نے پنجاب میں امن و امان کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ اس کا اعصابی مرکز لاہور تھا اور صوبائی دارالحکومت میں حالات پر قابو پانے کے لئے ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا گیا جو مئی تک جاری رہا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ میاں ممتاز دولتانہ نے اس تحریک کا رخ مرکزی حکومت کی طرف موڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی پاداش میں انہیں نہ صرف اپنے منصب کی قیمت ادا کرنی پڑی بلکہ اس سے خواجہ ناظم الدین کی برطرفی

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۶ جنوری ۱۹۵۳ء

[۲] ایضاً ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء

[۳] زیڈ اے سلیری۔ صفحہ ۶۷ (اس تحریک کا ذکر اس سے قبل تفصیل سے ہو چکا ہے)

Marfat.com

کی راہ بھی ہموار ہوگئی۔ وزارتِ اعلیٰ سے علیحدہ ہونے کے بعد دولتانہ نے پنجاب مسلم لیگ کی صدارت سے بھی استعفا دے دیا۔[۱]

میاں ممتاز دولتانہ کی جگہ ملک فیروز خان نون کو جو اس وقت مشرقی پاکستان میں گورنر تھے، پنجاب کا وزیرِ اعلیٰ بنایا گیا۔[۲] نئے وزیرِ اعلیٰ نے اپنی پالیسی کی وضاحت کے موقع پر "بڑھاؤ اناج کی پیداوار" مہم کے ساتھ رشوت ستانی کے خاتمہ اور بلا تاخیر انصاف پر بڑا زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ "بڑھاؤ اناج کی پیداوار" مہم کے سلسلے میں صوبے بھر میں تمام غیر ضروری رقبہ سرکاری تحویل میں لے کر ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا، جو اسے زیرِ کاشت لائیں گے۔ انھوں نے رشوت ستانی کے مقدمات کی سماعت اور بلا تاخیر انصاف کے لئے ایک اعلیٰ سطح کا ٹریبونل قائم کرنے کا بھی اعلان کیا۔[۳]

مسلم لیگ میں کلیدی مناصب کو یکجا کرنے کی روایت کے مطابق وزیرِ اعلیٰ بننے کے بعد ملک فیروز خان نون کو پنجاب مسلم لیگ کا صدر بھی بننا تھا۔ چنانچہ صوبائی لیگ کونسل نے وزیرِ اعظم کی ہدایت پر انہیں اپنا صدر منتخب کر لیا۔ لیکن انگلستان میں خود اختیاری جلاوطنی کی مختصر سی مدت کے بعد واپس آ کر میاں ممتاز دولتانہ نے نون کے خلاف بھی اپنا گروپ بنا لیا جس طرح اس سے پہلے انھوں نے ممدوٹ کے خلاف بنایا تھا۔ دولتانہ کو پنجاب میں بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل تھا، اس لئے انھوں نے نون کے لئے بڑی مشکلات پیدا کر دیں حتیٰ کہ انھوں نے نون وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ منظور کرانے کی بھی تدبیر کی۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں دولتانہ نے اپنی رہائش گاہ

۱۔ ڈان کراچی ۱ اپریل ۱۹۵۳ء

۲۔ ایضاً ۴۔اپریل ۱۹۵۳ء

۳۔ ایضاً

Marfat.com

پر ایک اجلاس میں ۸۶ ارکان اسمبلی کی حمایت بھی حاصل کر لی جنہوں نے تحریک عدم اعتماد کے حق میں ووٹ ڈالنے کا پختہ عہد کیا۔ ارکان اسمبلی کا ایسا ہی اجلاس وزیر اعلیٰ ملک فیروز خان نون کی رہائش گاہ پر ہوا جس میں ۸۷ ارکان اسمبلی شامل ہوئے[1]۔ اس طرح یہ دلچسپ مظاہرہ ہوا کہ بعض ارکان اسمبلی دونوں گروہوں کو بیک وقت اپنی حمایت کا یقین دلا رہے تھے۔ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی، لیکن مسلم لیگ میں شریک موقع پرست ارکان ایسی حرکتوں پر ضمیر کی کوئی خلش محسوس نہ کرتے تھے اور لیگ کی قیادت اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ایسی صریح بے ضابطگیوں سے چشم پوشی کرنے کی عادی ہو گئی تھی۔ دولتانہ کی سرتوڑ مساعی کے باوجود تحریک عدم اعتماد کامیاب نہ ہوئی۔ البتہ اقتدار کے لئے اس رسہ کشی سے پنجاب مسلم لیگ کے اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کی عوامی مقبولیت میں اور بھی کمی واقع ہو گئی۔ لیگ سے ممدوٹ گروپ کے علیحدہ ہونے کے بعد اب اس میں پھر دو گروپ ابھر آئے تھے اور ان کے جوڑ توڑ نے مسلم لیگ کو سازشوں کا اکھاڑہ بنا دیا۔

حکمران گروپ کو مسلم لیگ کونسل میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، تو کونسل کو توڑ دینے کی تحریک کی گئی۔ اس پر دولتانہ کے دست راست چودھری محمد حسین چٹھہ کراچی گئے اور مسلم لیگ کی قیادت پر واضح کیا کہ اگر پنجاب لیگ کی کونسل کو توڑ دیا گیا تو پھر پنجاب کے کونسلر مشرقی پاکستان، سرحد اور بلوچستان کے کونسلروں کی حمایت و امداد حاصل کر کے اس فیصلہ کو مرکزی لیگ کونسل میں چیلنج کریں گے[2]۔ اس انتباہ کے باوجود پنجاب لیگ کونسل کو توڑ دیا گیا۔

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۹ر نومبر ۱۹۵۳ء

[2] ڈان کراچی ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۳ء

Marfat.com

ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلہ کو چیلنج کرنے کے لئے تقریباً ایک سو کونسلروں نے باضابطہ طور پر پاکستان مسلم لیگ کا اجلاس طلب کرنے کا نوٹس دیا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد یہ اپنی نوعیت کا پہلا اقدام تھا۔

پاکستان مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس سے پہلے محمد علی بوگرہ نے بطور صدر مسلم لیگ یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ نامکمل ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ پر عمل درآمد اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک مکمل کمیٹی اس فیصلہ کی توثیق نہیں کرے گی۔[۱] ان کا یہ فیصلہ عملاً پنجاب مسلم لیگ کی کونسل کو توڑ دینے کے فیصلہ پر عمل درآمد روک دینے کے مترادف تھا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ملک فیروز خان نون کے سوا تمام عہدیداروں نے اپنے فرائض سنبھال لئے۔ ملک صاحب کے خلاف لاہور کی ایک دیوانی عدالت نے حکم امتناعی جاری کر رکھا تھا کہ جب تک مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو جائے وہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت میں کام نہ کریں۔[۲]

ملک فیروز خان نون ۱۹۵۵ء تک پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ بالآخر ان کی وزارت "مفاد عامہ" کی خاطر برطرف کر دی گئی۔ "مفاد عامہ" کے تحت وزارتوں کی برطرفی اس قدر عام ہو چکی تھی کہ ملک نون کی وزارت کی برطرفی پر ملک میں کوئی تعجب و اضطراب ظاہر نہ کیا گیا۔ ان کی وزارت کے زمانہ میں پنجاب مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹی رہی۔ ایک دھڑے کے رہنما خود ملک صاحب تھے اور دوسرا دھڑا میاں ممتاز دولتانہ کا تھا۔ چنانچہ گروہی حسد اور سازشیں سیاسی منظر پر سایہ فگن رہیں۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں لاہور میں مسلم لیگ کی کنونشن بلائی گئی۔ لیکن ایک کے بجائے دو متوازی کنونشنیں منعقد ہوئیں۔ ایک

---

[۱] ڈان کراچی ۶ر جنوری ۱۹۵۴ء

[۲] پاکستان ٹائمز لاہور ۶ر جنوری ۱۹۵۴ء

Marfat.com

میاں ممتاز دولتانہ کی رہائش گاہ پر اور دوسری ملک فیروز خان نون کی رہائش گاہ پر۔ کنونشن بلانے کا مقصد مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم اور حیات نو بیان کیا گیا تھا۔[1] لیکن ایک کے بجائے دو کنونشنوں کے انعقاد سے از سر نو تنظیم کا جس انداز میں آغاز کیا گیا وہ دنیا بھر کی سیاسی پارٹیوں کے اصولوں کے صریحاً خلاف تھا لیکن پنجاب کے سربرآوردہ مسلم لیگیوں کو ملک کے دوسرے ہم جماعتوں کی طرح مطلق احساس نہیں تھا کہ وہ اپنی ان حرکتوں سے پاکستان قائم کرنے والی جماعت کو تیزی سے تباہ و برباد کر رہے ہیں۔

سندھ سندھ مسلم لیگ کی کونسل نے دوسری صوبائی لیگوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ جرأت کے مظاہرے سے آغاز کار کیا۔ تقسیم کے صرف چند ماہ بعد سندھ مسلم لیگ پہلا سیاسی ادارہ تھا جس نے پاکستان میں نظام حکومت کے لیے سوشلسٹ آئین بنانے کی سفارشی قرارداد منظور کر لی۔ اس قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ "پاکستان کے آئین میں ہر صوبے کو اندرونی معاملات میں مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے اور وحدت پاکستان کی تشکیل اس طرح عمل میں لائی جائے کہ پاکستان میں شامل تمام اکائیوں کو چھوٹی بڑی کے امتیاز کے بغیر انتظامیہ اور مقننہ میں مساوی نمائندگی مل سکے۔[2] سندھ لیگ کونسل نے ایک قرارداد میں سرکاری محکموں میں رشوت ستانی اور بدعنوانی کی بھی برملا مذمت کی۔[3]

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۵ راپریل ۱۹۵۴ء [2] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء

[3] آغاز میں مسلم لیگ کی تمام صوبائی شاخیں رشوت ستانی کی مذمت کرتی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ احساس ختم ہو گیا یا لیگی لیڈروں نے صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا۔

Marfat.com

کونسل کی یہ قرارداد سندھ مسلم لیگ میں صوبائی خود مختاری کے مضبوط رجحان کی آئینہ دار تھی۔ اس قرارداد کے مطابق اندرونی طور پر صوبے کے لئے مکمل آزادی اور انتظامیہ اور مقننہ میں مساوی نمائندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جہاں یہ بات جرأت مندانہ تھی کہ کونسل نے سرکاری محکموں میں رشوت ستانی کی پرزور مذمت کی تھی وہاں یہ بات حیرت انگیز بھی تھی کہ اس نے قیامِ پاکستان کے صرف دو ماہ بعد پاکستان کے لئے سوشلسٹ آئین بنانے کی سفارش کی اور صوبائی خود مختاری کی تحریک کی حمایت و تائید کی۔ پاکستان اس وقت ہمہ گیر بحران اور افراتفری سے دوچار تھا۔ نوزائیدہ ملک کی سرفہرست ضرورت یکجہتی تھی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر پاکستان کے آئین پر بحث و نزاع، سوشلسٹ نظام کا قیام، انتظامیہ اور مقننہ میں مساوی نمائندگی کے ساتھ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ اس نازک مرحلہ میں انتشار کے بیج بونے کے مترادف تھا۔ چنانچہ ان رجحانات و مطالبات کو قومی مفاد کے منافی قرار دے کر ان پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔

سندھ مسلم لیگ کی سیاسیات کا آغاز کار سے ہی نمایاں پہلو جوڑ توڑ اور سیاسی وفاداریوں میں تغیّر و تبدل تھا۔ سندھ مسلم لیگ کے پاس عوام کی حالت بہتر بنانے کے لئے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ البتہ اس کے لیڈر عہدوں کے حصول کے لئے گھٹیا سیاست میں بہت سرگرم تھے۔ محمد ایوب کھوڑو وزیر اعلیٰ کے ساتھ سندھ مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ اکثر لیڈروں کی طرح وہ بہت بڑے زمیندار تھے اور بے پناہ اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ لیکن باقی صوبائی لیڈروں کے مانند وہ بھی قیادت کے اوصاف سے محروم تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں سندھ کی کابینہ کے اندرونی اختلافات نے سکینڈل کی صورت اختیار کر لی اور وزراء نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا۔ قائدِ اعظم نے اس صورتِ حال کو ناپسند کیا

Marfat.com

اور گورنر سے رپورٹ مانگ لی۔ رپورٹ دیکھنے کے بعد قائدِ اعظم نے گورنر کو ہدایت کی کہ وہ کھوڑو کو عہدے سے برطرف کر دیں۔ چنانچہ وہ پہلے اور واحد وزیر اعلیٰ تھے جنہیں قائدِ اعظم نے بطور گورنر جنرل برطرف کیا۔ ان کے خلاف مقدمہ چلانے کے لئے ٹربیونل مقرر کیا گیا۔ کھوڑو صاحب پر بدانتظامی، اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بجالانے میں سنگین بے ضابطگیوں کے الزامات عائد کئے گئے جن کی باقاعدہ تحقیقات کرائی گئی[1]۔ اور سزا کے طور پر انہیں تین سال تک کسی سیاسی عہدے پر فائز ہونے سے محروم کر دیا گیا[2]۔ اس طرح وہ اسمبلی کے رکن بھی نہ رہے۔ دوسری طرف ایک اور فوجداری کے مقدمے میں انہیں دو سال کی سزا ہوئی جس کے خلاف انھوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی اور خود سیاست کا کھیل کھیلتے رہے۔

کھوڑو صاحب کی برطرفی کے بعد سندھ کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے پیر الٰہی بخش کو نیا لیڈر منتخب کر لیا جنہوں نے اپنے عہدے کا حلف ۳ مئی ۱۹۴۸ء کو اٹھایا۔

دریں اثنا ایک واقعہ سے محمد ایوب کھوڑو کو حکومت کے خلاف تحریک چلانے اور اپنی قیادت کا سکہ از سرِ نو رواں کرنے کا موقع مل گیا۔ مئی ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے کراچی شہر کو مرکزی دارالحکومت کا علاقہ قرار دے دیا اور اس کا انتظام براہِ راست مرکزی حکومت کو تفویض کر دیا[3]۔ کھوڑو نے جنہیں وزارتِ اعلیٰ سے معزول کیا جا چکا تھا اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۷ اپریل ۱۹۴۸ء

[2] ایضاً ۲۵ فروری ۱۹۴۹ء

[3] مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ روزنامہ مشرق لاہور ۱۹ مارچ ۱۹۶۷ء

Marfat.com

حکومت کے اس فیصلہ کی اس بنیاد پر مخالفت شروع کر دی کہ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی کارروائی صوبے کے مفاد کے منافی ہے۔ سندھ مسلم لیگ کی کونسل پر ان کا قبضہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے کونسل سے ایک قرارداد منظور کرا دی جس میں پاکستان دستور ساز اسمبلی کے اس فیصلہ کی مذمت کی گئی تھی۔ کونسل نے سندھ کے وزیروں کو بھی ہدایت کی کہ وہ "کراچی کے سلسلہ میں مرکزی حکومت کے حق میں اپنے کسی اختیار و حق سے دستبردار نہ ہوں"۔[۱] کونسل نے سندھ کے گورنر اور وزیروں سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ مستعفی ہو کر کراچی کی علیحدگی کے مسئلہ پر دوبارہ انتخاب لڑیں۔ کونسل نے اپنی مجلس عمل کو "قومی ماتم کا ایک دن منانے" کے لیے موزوں تاریخ مقرر کرنے اور کراچی کی مجوزہ علیحدگی کے خلاف احتجاج کرنے کی بھی ہدایت کی۔ اس قرارداد کی سندھ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے بھی توثیق کر دی اور کھوڑو کے زیر اثر کراچی کی علیحدگی کے خلاف احتجاجی تحریک شروع ہو گئی۔ قیام پاکستان کے بعد محمد ایوب کھوڑو پہلے سیاسی لیڈر تھے جنھوں نے محض ذاتی مقبولیت کے لئے صوبائیت کے جذبات کو ابھارا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔[۲]

جب صوبائی مسلم لیگ کونسل کی مقرر کردہ مجلس عمل کا اجلاس "یوم احتجاج" کے پروگرام کی تشکیل کے ضمن میں ہوا تو مسٹر ہاشم گزدر نے یہ تجویز پیش کر دی کہ کوئی اور قدم اٹھانے سے پہلے قائداعظم سے ملاقات کی جائے۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی اور پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد زیارت کے لئے روانہ ہو گیا۔[۳]

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۱۲ر جون ۴۸ ۱۹ء

[۲] مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ روزنامہ "مشرق" لاہور ۱۹ر مارچ ۱۹۶۴ء

[۳] بحوالہ مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ صفحہ ۳۶۴

Marfat.com

صورت حال اس قدر کشیدہ اور سنگین ہوگئی کہ قائدِ اعظم کو بنفسِ نفیس مداخلت
کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ انھوں نے سندھ لیگ کے لیڈروں کو مشورہ دیا کہ
دستور ساز اسمبلی کے فیصلہ کو قبول کریں اور احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ بند
کردیں، بصورت دیگر پاکستان کی بنیادیں کمزور ہوجائیں گی، کیونکہ ملک پہلے ہی
ایک بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت
آہستہ آہستہ دفاتر بنائے گی اور تمام املاک کا معاوضہ ادا کرے گی۔ کراچی میں جو
بھی تعمیر کا کام ہوگا اور سہولتیں میسر ہوں گی ان سے بہر حال سندھ کو فائدہ پہنچے
گا۔ قائدِ اعظم نے وفد کے ساتھ اپنی ملاقات کی روداد کو بیان کی صورت میں شائع
کردیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کھوڑو کی پوری مخالفت اور بھاگ وڑ کے باوجود سندھ
کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے ۵ جولائی کو ۵ کے مقابلے میں ۲۶ ووٹوں سے
قائدِ اعظم کے مشورے کی حمایت کردی اور یوں یہ طوفان تھم گیا۔ سندھ مسلم
لیگ اسمبلی پارٹی نے اتنی دانشمندی سے تو ضرور کام لیا کہ قائدِ اعظم کے مشورہ کے
سامنے سرِ تسلیم خم کردیا لیکن اسمبلی پارٹی نے اس سلسلہ میں جو قرارداد منظور کی
اس میں یہ کہنا ضروری سمجھا کہ "ہماری نوزائیدہ مملکت کو جو بیرونی مشکلات
اور اندرونی مسائل درپیش ہیں، کچھ ان کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ
حکومت پاکستان کراچی کو مرکزی انتظام میں لے کر دستور ساز اسمبلی کی قرارداد کو عملی
جامہ پہنانے پر تلی ہوئی ہے، حالانکہ یہ بات سندھ کے عوام کی مرضی کے خلاف
ہے، سندھ لیگ اسمبلی پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ کشمکش کو مزید جاری رکھنا چونکہ
پاکستان اور سندھ دونوں کے لئے نقصان دہ ہوگا، اس لئے اس کے سوا
کوئی چارہ نہیں کہ قائدِ اعظم کے مشورہ کو خوش دلی سے قبول کرلیا جائے۔"
قرارداد کے تیور ملاحظہ فرمایئے۔ اس کا نمایاں اور قابلِ ذکر پہلو یہ تھا کہ سندھ

Marfat.com

لیگ اسمبلی پارٹی نے قائدِ اعظم کا مشورہ بھی آخری چارۂ کار کے طور پر قبول کیا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ حکومتِ پاکستان اس سلسلہ میں دستور ساز اسمبلی کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے پر تلی ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اس فیصلہ کو پالیسی کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

محمد ایوب کھوڑو کی برطرفی کے بعد پیر الٰہی بخش ۳ رمئی ۱۹۴۸ء کو سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے۔ انہیں سندھ لیگ اسمبلی پارٹی کا لیڈر اور میر غلام علی تالپور کو ڈپٹی لیڈر منتخب کیا گیا۔[1]

کھوڑو نے سندھ مسلم لیگ کونسل میں پھر چکر چلایا اور وہ سندھ صوبائی مسلم لیگ کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے۔ اس انتخاب میں کھوڑو کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ رکن سازی کی مہم کے دوران میں وہ صرف اپنے وفادار سیاسی کارکنوں کو مسلم لیگ کا رکن بناتے رہے تھے اس لیے سندھ مسلم لیگ کونسل پر ان کا مکمل قبضہ تھا جب ان کا انتخاب ہو گیا تو انھوں نے اس بنیاد پر استعفا دے دیا کہ جب تک ان کے خلاف الزامات کی تحقیقات کرنے والی عدالت کی رپورٹ منظرِ عام پر نہیں آئے گی وہ اس وقت تک صدارتی منصب پر فائز نہیں ہوں گے انھوں نے ایک فرمانبردار ساتھی کو صدر منتخب کروا دیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ ان کا استعفیٰ زیرِ غور پڑا رہنے دیا جائے۔[2] وہ غالباً یہ ظاہر اور ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اب تک انہیں پارٹی کا مکمل اعتماد حاصل ہے۔ کھوڑو نے اس کے بعد ورکنگ کمیٹی میں اپنا چکر چلایا اور پیر الٰہی بخش وزارت کو توڑنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انھوں نے ورکنگ کمیٹی سے نئی وزارت پر عدم اعتماد کی قرارداد منظور کرا دی اور پارلیمانی پارٹی کے ارکان سے مطالبہ کرا دیا

---

[1] پاکستان ٹائمز ۴ رمئی ۱۹۴۸ء [2] پاکستان ٹائمز ۹ ردسمبر ۱۹۴۸ء

Marfat.com

کہ وہ سندھ وزارت کی حمایت و تائید سے دستبردار ہو جائیں۔ ستم ظریفی کی حد یہ ہے کہ اس قرارداد میں صوبائی حکومت پر رشوت، بدعنوانی، اقربا نوازی اور بدانتظامی میں اضافہ کا الزام عائد کیا گیا تھا علاوہ ازیں حکومت پر مہاجرین کی آبادکاری میں گھپلا کرنے کا بھی الزام لگایا گیا تھا، حالانکہ ان تمام الزامات سے خود کھوڑو صاحب کا دامن داغدار تھا۔ اس قرارداد میں وزیر اعلیٰ کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر انہوں نے پارٹی کے فیصلوں کی خلاف ورزی کی تو نہ صرف ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی بلکہ انہیں لیگ کی رکنیت سے بھی محروم قرار دے دیا جائے گا۔[1] یہ تھیں وہ جمہوری روایات جن کی داغ بیل مسلم لیگ کے لیڈران کرام ڈال رہے تھے۔

بالآخر پیر الٰہی بخش کو مستعفی ہونا پڑا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ الیکشن ٹربیونل نے انتخابی عذرداری میں ان کے خلاف فیصلہ صادر کیا۔ اس فیصلے کے تحت وہ سندھ اسمبلی کے رکن نہیں رہے تھے۔[2] الیکشن ٹربیونل کے اس فیصلے کا پس منظر یہ تھا کہ قیام پاکستان سے قبل سندھ اسمبلی کے ایک رکن قاضی محمد اکبر کی انتخابی عذرداری کی درخواست زیر سماعت تھی۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں اس کا فیصلہ ہوا جس کے تحت قاضی محمد اکبر اور ان کے انتخابی ایجنٹ پیر الٰہی بخش کو اسمبلی کی ممبری سے محروم کر دیا گیا۔ کھوڑو صاحب مقدمات کی وجہ سے خود امیدوار نہ بن سکتے تھے اس لئے وہ اپنے فرمانبردار امیدوار یوسف ہارون کو میدان میں لے آئے۔ چنانچہ یوسف ہارون سندھ لیگ پارلیمانی پارٹی کے لیڈر منتخب ہو گئے وہ آزادی کے بعد ڈیڑھ سال کے اندر سندھ کے تیسرے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔[3]

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲ر فروری ۱۹۴۹ء [2] پاکستان ٹائمز لاہور ۵ر فروری ۱۹۴۹ء
[3] ایضاً ۱۷ فروری ۱۹۴۹ء

سندھ میں صوبائی خود مختاری کی خواہش شدید اور مقبول رہی ہے۔ چنانچہ ظہورِ پاکستان کے بعد سندھ مسلم لیگ نے جو قراردادیں منظور کیں ان میں سے بیشتر میں صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس لیے جب ۱۹۴۹ء میں حکومت نے مغربی پاکستان کے صوبوں کو مدغم کرنے کی تجویز پیش کی تو سندھ میں اس کی پُرزور مخالفت کی گئی۔ اس تجویز پر بعد میں اکتوبر ۱۹۵۵ء میں عمل درآمد کیا گیا جب چودھری محمد علی وزیر اعظم تھے۔ اس قانون کے مطابق مغربی پاکستان میں سارے صوبوں اور ریاستوں کے جداگانہ وجود کو ختم کرکے ایک یونٹ بنا دیا گیا۔ اس وقت یہ اقدام ایک آئینی ضرورت بن گیا تھا اور مشرقی و مغربی پاکستان میں مساوی نیابت کے اہتمام کے لیے اسے ناگزیر سمجھا گیا تھا۔ مساوی نیابت نے ہی ۱۹۵۶ء کے جمہوری آئین کی منظوری کی راہ ہموار کی تھی۔ بہرحال مغربی پاکستان کے صوبوں کا ادغام کوئی نیا خیال نہیں تھا اور اس کی ضرورت قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی محسوس ہونے لگی تھی لیکن سندھ کے لیڈر اس کے حامی نہیں تھے۔ اس مخالفت کی وجوہ بعض انتظامی مشکلات بیان کی جاتی تھیں لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ سیاسی لیڈروں کو اس بات میں اپنے لیے محرومی کا خطرہ نظر آتا تھا۔ چنانچہ جب اوائل ۱۹۴۹ء میں صوبوں کو متحد کرنے کی تجویز منظرِ عام پر آئی تو سندھ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کرکے مغربی پاکستان کے صوبوں کو متحد کرنے کی تحریک پر گہری تشویش کا اظہار کیا۔[1]

اس دوران میں سندھ کی سیاسی بساط پر کچھ اور تبدیلیاں رونما ہوئیں جن سے یوسف ہارون کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ مقدمات سے بری ہونے کے بعد کھوڑو نے اپنا زیرِ غور استعفیٰ واپس لے لیا اور صوبائی مسلم لیگ کے

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۷ مارچ ۱۹۴۹ء

Marfat.com

صدر بن بیٹھے چنانچہ اب وہ وزیر اعلیٰ پر زیادہ مضبوطی سے حکم چلانے لگے۔ وزیر اعلیٰ کو یہ صورتِ احوال ناگوار گزری۔ اس نے کھوڑو کے خلاف بغاوت کر دی اور اپنی وزارت سے کھوڑو کے نامزد وزراء نکال دیئے۔ کھوڑو نے یوسف ہارون کے خلاف عدم اعتماد کی تیاریاں مکمل کر لیں لیکن پیرزادہ عبدالستار نے یوسف ہارون اور کھوڑو کے درمیان صلح کرادی۔

یوسف ہارون نے کھوڑو کی حمایت حاصل کرنے کے لیے جو سمجھوتہ کیا اس کے تحت یوسف ہارون نے اپنی وزارت میں تبدیلیاں کیں اور پیرزادہ اور کھوڑو کے نامزد دو دو وزراء کو کابینہ میں شامل کر لیا۔[۱]

یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوگیا بلکہ پھر کھوڑو نے ہارون سے علیحدہ بات کی اور اسے سمجھایا کہ میں صدر مسلم لیگ اور تم وزیر اعلیٰ۔ پھر پیرزادہ کون ہوتا ہے؟ اس لیے کیوں نہ اس کے نامزد وزراء نکال دیئے جائیں۔ وعدے کے مطابق یوسف ہارون دوبارہ مستعفی ہوئے اور انھوں نے کھوڑو کے تین نامزد وزیر اور اپنے تین وزراء پر مشتمل نئی کابینہ تشکیل دی۔ سندھ اسمبلی پارٹی نے یوسف ہارون پر اعتماد کا اظہار کر دیا۔

اس دوران میں مسلم لیگ کی حکومت کے زیر سرپرستی سندھ میں بدعنوانی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ اور رشوت ستانی اور بدانتظامی معمول کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ وزارت کے کمزور اور متزلزل ہونے کے باعث حکومت ان خرابیوں کی روک تھام کرنے سے معذور تھی۔ سندھ مسلم لیگ کی طرف سے اس سلسلے میں گاہے گاہے جو قرار دادیں منظور کی جاتی تھیں وہ ہمہ جہتی بدعنوانی کے خلاف کھلے احتجاج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ حد یہ ہے کہ سندھ اسمبلی کے ایک رکن اور پارلیمانی سیکرٹری

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۵۰ء

قاضی مجتبیٰ نے ان خواہیوں کے خلاف سندھ اسمبلی میں صدائے احتجاج بلند کی۔ انھوں نے وزارتِ داخلہ، جس کے سربراہ قاضی فضل اللہ تھے، کے خلاف بدانتظامی اور رشوت ستانی کے سنگین الزامات لگائے۔ وزیرِ اعلیٰ نے جب ان سے اپنے الزامات ثابت کرنے کا مطالبہ کیا تو قاضی مجتبیٰ نے بعض ضلعی افسروں کو تبدیل کرنے کی درخواست کی تاکہ قاضی فضل اللہ کے خلاف سنگین الزامات کا ثبوت مرتب کیا جا سکے۔ وزیرِ اعلیٰ نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا چنانچہ قاضی مجتبیٰ مطلوبہ ثبوت پیش نہ کر سکے۔ سچ بولنے کے جرم کی پاداش میں سندھ لیگ اسمبلی پارٹی میں قاضی صاحب کی رکنیت معطل کر دی گئی اور وزیرِ اعلیٰ کے مجبور کرنے پر وہ پارلیمانی سیکرٹری کے عہدہ سے مستعفی ہو گئے[۱]۔ "پاکستان ٹائمز" لاہور نے اسے "سچ بولنے کی قیمت" قرار دیا[۲]۔ سیاسی دباؤ کی تاب نہ لا کر قاضی مجتبیٰ نے اپنے الزامات واپس لے لیے۔ بہرحال جان کی امان بھی اسی میں تھی۔ ساتھ ہی انھوں نے حکومت سے مکمل تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ اس پر سندھ لیگ اسمبلی پارٹی میں ان کی رکنیت بحال کر دی گئی[۳]۔

نئی کابینہ کو حلف اٹھائے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سندھ کی چیف کورٹ نے یہ فیصلہ دے دیا کہ جس سپیشل ٹربیونل نے "پیروڈا" کے تحت کھوڑو کے خلاف الزامات کی سماعت کی تھی، اس کی قانونی حیثیت درست نہ تھی۔ چنانچہ کھوڑو صاحب کے خلاف تمام کارروائی کالعدم ہو گئی اور نااہلی کا داغ بھی دھل گیا۔ وہ ایک نئی شان اور طمطراق سے اس طرح اسمبلی میں داخل ہوئے

۱۔ پاکستان ٹائمز لاہور ۱۷ اپریل ۱۹۵۰ء

۲۔ ایضاً ۱۸ اپریل ۱۹۵۰ء

۳۔ ایضاً ۸ مئی ۱۹۵۰ء

Marfat.com

کہ یوسف ہارون کی کرسی وزارت ڈگمگانے لگی۔ اس نے اپنے لئے یہی بہتر سمجھا اور بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مصداق وزارت چھوڑ سفارت پر قناعت کر لی۔

مئی ۱۹۵۰ء میں یوسف ہارون کو آسٹریلیا میں پاکستان کا ہائی کمشنر مقرر کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ قاضی فضل اللہ، جو کھوڑو کے نامزد تھے، سندھ کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ پارٹی نے نئی وزارت کو جاگیرداری کا خاتمہ کرنے کا قانون بنانے کی ہدایت کی تاکہ ایک جماعتی وعدہ پورا ہو سکے[۵۱] لیکن اصل میں یہ بھی عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا ایک طریقہ تھا ورنہ خود جاگیردار جاگیرداری کو ختم کرنے کا قانون کیونکر بنا سکتے تھے۔

جاگیرداری کے خلاف مہم قیام پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔ سندھ مسلم لیگ کی کونسل اور ورکنگ کمیٹی نے کئی بار جاگیرداری نظام ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ علاوہ ازیں ہاری کانفرنس نے بھی زمینداری کے خاتمہ کے لئے ایجی ٹیشن کی[۵۲] لیکن حکومت سندھ نے حکومت پاکستان کی ہدایات کے باوجود اس مسئلے کو کماحقہٗ حل نہ کیا کیونکہ پارٹی پر بڑے زمیندار مسلط تھے۔ مختصر یہ کہ لیگ کے نامزد وزیر اس سلسلے میں ذمہ داری دوسروں پر عائد کرتے رہے اور اس طرح مختلف حیلوں بہانوں سے جاگیرداری کو ختم کرنے کے لیے قانون سازی کا کام مسلسل ملتوی کرتے رہے۔

کھوڑو کی سندھ مسلم لیگ پر گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ ایک مرتبہ پھر اتفاق رائے سے سندھ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے اور کونسل نے انہیں دوسرے عہدیدار چننے کا اختیار بھی دے دیا۔ انھوں نے سید خیر اور نعمت اللہ قریشی کو نائب صدر

---

[۵۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۹ر مئی ۱۹۵۰ء

[۵۲] ایضاً ۱۷ر ستمبر ۱۹۵۰ء

Marfat.com

عبد الفتح کو جنرل سیکرٹری اور غلام علی اور تاج محمد کو جوائینٹ سیکرٹری نامزد کر دیا۔

قاضی فضل اللہ کے دورِ حکومت میں بھی عملی طور پر وزیر اعلیٰ کھوڑو ہی تھا۔ حکومت اس کے اشاروں پر چلتی تھی اور اسے عرفِ عام میں سندھ کا بادشاہ گر کہا جاتا تھا۔ اس دوران میں مسلم لیگ کے دستور میں تبدیلی کر کے وزراء پر پارٹی میں عہدے سنبھالنے کی پابندی ختم کر دی گئی اور وزیر اعظم لیاقت علی خان صدر مسلم لیگ بن گئے۔ اس مثال کو صوبوں نے بڑے خلوص سے اپنایا[1] چنانچہ کھوڑو نے قاضی فضل اللہ کو مستعفی ہونے کا حکم دے دیا۔ اس کی کیا مجال تھی۔ اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ قاضی فضل اللہ کی جگہ کھوڑو وزیر اعلیٰ بنے اور قاضی صاحب اُس کابینہ میں وزیر مال کی حیثیت سے نمودار ہوئے[2]۔

سندھ مسلم لیگ کی عنان اقتدار فردِ واحد کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ عوامی نمائندگی و منصب سے نااہلی کے قانون (پروڈا) کے تحت بد انتظامی رشوت ستانی اور اقتدار کے ناجائز استعمال کی بنیاد پر کھوڑو کو اس سے قبل نااہل قرار دیا جا چکا تھا لیکن اس سے ان کے سیاسی کردار پر رتی بھر بھی اثر نہ پڑا۔ دراصل سندھ لیگ ان کی مٹھی میں تھی اور انہیں لیگ ہائی کمان اور مرکزی حکومت میں بعض مقتدر لوگوں کی حمایت و امداد حاصل تھی۔ چنانچہ وہ خوف اور دہشت کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ جو شخص بھی ان پر نکتہ چینی کرتا تھا اسے خوف و ہراس بلکہ قید و بند کا شکار بھی بنایا جاتا تھا اور یہی وہ خوبیاں تھیں جو سندھی حاکم کے لئے ضروری تھیں۔ اگرچہ پروڈا کے تحت انہیں دو سال تک نااہل قرار دے کر تمام عہدوں سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا تھا لیکن وہ جنہیں نامزد کر دیتے وہ

---

[1] چونکہ یہ ایک ایسی روایت تھی جسے مسلم لیگی لیڈر خلوص کے ساتھ اپنا سکتے تھے۔

[2] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۶ ، مارچ ۱۹۵۱ء

اعلیٰ مناصب کے لیے منتخب ہو جاتے تھے۔ جب ان کی نااہلی کی میعاد ختم ہوئی تو وہ دوبارہ سندھ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے اور پھر وزیر اعلیٰ بن گئے۔

سیاسی مصلحت پر مبنیاں کبھی دیرپا نہیں ہوتیں۔ جس سیاسی فارمولا کے تحت کھوڑو وزیر اعلیٰ اور قاضی فضل اللہ میر غلام علی تالپور، آغا غلام نبی پٹھان اور ان کے دوسرے ساتھی وزارتی گدیوں پر براجمان ہوئے، وہ محض وقتی اور عارضی تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد کھوڑو اور ان کے ساتھیوں کے مابین اختلافات اُبھر آئے۔ صوبائی کابینہ ایک مرتبہ پھر دو مضبوط دھڑوں میں بٹ گئی اور دونوں دھڑے ذاتی نوعیت کی بہت معمولی باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہو گئے۔[ا] ایسی صورت میں پارلیمانی پارٹی ہی کسی ایک دھڑے کی حمایت سے دستکش ہو کر الجھن دور کر سکتی تھی۔ لیکن جب پارلیمانی پارٹی کا اجلاس ہوا تو اس میں کھوڑو اور ان کے ساتھیوں پر مکمل اعتماد کا اظہار کر دیا گیا۔ حالانکہ وہ ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ پارٹی اس معاملہ میں بلاشبہ کامیابی سے ہمکنار ہوئی کہ اس نے کسی بھی دھڑے کا ساتھ نہ دیا[۲] اور نہ اس میں اس قدر حوصلہ تھا۔ لیکن اس طرح دھڑے بندی نے اور شدت اختیار کر لی اور پارٹی کی ساکھ خاک میں مل گئی۔

کھوڑو کے خلاف دوسری مرتبہ پروڈا کے تحت درخواست دائر کی گئی۔ اس میں ان کے خلاف بدعنوانی، رشوت ستانی، اقربا پروری اور انتظامیہ میں بے جا مداخلت پر مبنی الزامات لگائے گئے تھے۔ گورنر سندھ شیخ دین محمد نے کھوڑو سے مستعفی ہو جانے کے لیے کہا تا کہ ان الزامات کی تحقیقات ٹریبونل کے

ا۔ ڈان کراچی ۵ر دسمبر ۱۹۵۱ء

۲۔ ایضاً ۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

سپرد کی جا سکے۔ اس پر کھوڑو نے احتجاج کیا کہ انہیں صفائی کا موقع دیئے بغیر گورنر ٹربیونل قائم کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ گورنر نے ان کا یہ اعتراض قبول کر لیا اور انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کہا۔[1] جونہی کھوڑو کو خطرے کا احساس ہوا اُنھوں نے اپنے حریفوں پر واضح کر دیا کہ اگر وہ وزیر اعلیٰ نہ رہے تو وہ گورنر کو صوبہ میں دفعہ ۹۲ (الف) نافذ کرنے اور وزارت توڑ دینے کا مشورہ دے کر انہیں بھی "الوداعی ٹھوکر" Parting Kick لگا جائیں گے۔[2]

اس کے برعکس سندھ مسلم لیگ کے سیکریٹری محمد ہاشم گزدر نے یہ تجویز پیش کی کہ لیگ پارلیمانی پارٹی چونکہ اس سے پہلے وزارت پر اعتماد ظاہر کر چکی ہے اس لئے کھوڑو کے مستعفی ہونے کے بعد قاضی فضل اللہ کو وزیر اعلیٰ بنا دیا جائے۔ انھوں نے دفعہ ۹۲ (الف) کو نافذ کرنے کی مخالفت کی اور اسے جمہوری اصولوں کے منافی اقدام قرار دیا۔[3] ستم ظریفی دیکھیئے کہ صرف چند دن بعد سندھ اسمبلی کے بارہ ارکان نے ایک مشترکہ بیان میں صوبہ میں دفعہ ۹۲ (الف) نافذ کرنے کا مطالبہ کر دیا۔[4] ان حالات میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کونسا اقدام جمہوری ہو گا اور کون سا غیر جمہوری ؟

اس کشمکش کا ڈراپ سین اس طرح ہوا کہ آخر کار گورنر نے کھوڑو اور قاضی فضل اللہ کو اپنے استعفے پیش کرنے کے لئے کہہ دیا کیونکہ ان دونوں کے خلاف پروڈا کے تحت مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد گورنر نے تین اصحاب میراں محمد شاہ، میر غلام علی تالپور اور آغا غلام نبی پٹھان سے قائم مقام حکومت کے ارکان کے طور پر حلف لینے تھے۔ لیکن میراں محمد شاہ نے اس قائم مقام حکومت

---

[1] ڈان کراچی۔ ۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء [2] ڈان کراچی۔ ۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء

[3] ایضاً ۱۲ر دسمبر ۱۹۵۱ء [4] ایضاً ۱۲ر دسمبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

میں وزیر بننے سے انکار کر دیا[۱]۔

ابتدائی تحقیقات میں کھوڑو کے خلاف پروڈا کے تحت دوسری درخواست میں شامل الزامات کو بظاہر درست قرار دیا گیا۔ قاضی فضل اللہ کے خلاف پانچ الزامات عائد کیے گئے تھے۔ ان میں سے چار بظاہر درست قرار دیے گئے[۲]۔ بعض حلقوں کا یہ تاثر تھا کہ کھوڑو اپنے اثر و رسوخ کو بروئے کار لا کر پروڈا کے تحت کارروائی رکوانے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے یہ اعلان کیا کہ کھوڑو کے خلاف مقدمہ چلانے کے فیصلہ کو منسوخ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا[۳]۔ وزارتی بحران پر قابو پانے کے لئے سندھ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا ایک اور اجلاس منعقد ہوا لیکن اس اجلاس کا آغاز ہی اس پر اختلاف سے ہوا کہ اجلاس کی صدارت کون کرے؟ دونوں دھڑوں نے اسے وقار کا سوال بنا لیا۔ بالآخر بھاری اکثریت سے قاضی فضل اللہ کو اجلاس کا صدر بنانے کی تحریک کامیاب ہو گئی۔ اس وقت کھوڑو اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ جونہی یہ فیصلہ ہوا، اُنھوں نے اجلاس کے التوا کا اعلان کر دیا اور اپنے گیارہ ساتھیوں سمیت اجلاس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اسمبلی پارٹی کے باقی ارکان اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے اور انھوں نے اتفاق رائے سے میر غلام علی تالپور کو پارٹی کا لیڈر منتخب کر لیا[۴]۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ اس اسمبلی پارٹی نے صرف چند دن پہلے ایک قرارداد منظور کر کے کھوڑو پر مکمل اعتماد ظاہر کیا تھا۔ اس سے اسمبلی پارٹی کے ارکان کے کردار کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ سندھ کی سیاست کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہاں کے سیاست دان دریائے

۱۔ ڈان کراچی ۱۹ر دسمبر ۱۹۵۱ء ۲۔ ڈان کراچی ۱۹ر دسمبر ۱۹۵۱ء

۳۔ ایضاً ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۔ ایضاً ۲۷ر دسمبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

سندھ کی گذرگاہ کی طرح اپنا رُخ بدلتے رہتے ہیں لیکن جس عاجلانہ انداز اور تیز رفتاری سے سندھ کے ارکان اسمبلی اپنی وفاداریاں بدل رہے تھے اسے حیرت انگیز ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی اس اصول کا اطلاق صرف سندھ پر ہی نہیں ہوتا۔ پنجاب میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ یہاں بھی وفاداریاں دھوپ چھاؤں کے مانند بدلتی تھیں۔ یہی جمہوری روایات مسلم لیگ نے آئندہ نسلوں کے لیے ورثے میں چھوڑیں اور ان ہی کے سبب پاکستان میں جمہوریت کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ مسلم لیگ نے جس قدر جدوجہد اور انتھک محنت سے پاکستان حاصل کیا تھا، اس کے لیڈر اسے تباہ کرنے کے لیے بھی اسی قدر جدوجہد کر رہے تھے۔ مسلم لیگی لیڈروں میں سیاسی کردار کا قحط تھا جس کے نتیجے میں پوری قوم کا کردار انحطاط کا شکار ہو گیا۔

کھوڑو تخریبی صلاحیتوں میں یکتائے روزگار تھا۔ اس نے سندھ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کا بندوبست کیا اور اپنے اثر و نفوذ کو بروئے کار لا کر تخریبی سرگرمیوں کے الزام میں میر غلام علی تالپور کو دو سال کے لیے جماعت سے خارج کر دیا[1]۔ اس سے صورتِ حال اور زیادہ پیچیدہ ہو گئی کیونکہ میر غلام علی تالپور سندھ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے لیڈر منتخب ہو چکے تھے۔ ان ناقابلِ رشک بلکہ قابلِ مذمت سرگرمیوں سے مسلم لیگ کے عناصر ترکیبی میں ربط و تعلق کا مکمل فقدان بے نقاب ہو گیا۔

صدر پاکستان مسلم لیگ خواجہ ناظم الدین نے بلا تاخیر کارروائی کی اور سندھ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی اس قرارداد پر عمل درآمد روک کر صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنے کا حکم جاری کر دیا[2]۔ اور یہ کہا کہ اس سلسلے میں حتمی فیصلہ مرکزی

---

[1] ڈان کراچی ۲۸ دسمبر ۱۹۵۱ء

جماعت کی ورکنگ کمیٹی کرے گی اور اصل بحران کا بھی جائزہ لے گی۔ بہرحال سندھ مسلم لیگ میں اس رسہ کشی اور اختلاف و نزاع سے جماعت کی ساکھ اور شہرت کو بڑا نقصان پہنچا۔ مسلم لیگ میں دھڑے بندی کے تحت سرکاری ملازم بھی گروپوں میں بٹ گئے جس سے رشوت ستانی کے لیے دروازے کھل گئے امن عامہ کی حالت ابتر ہو گئی اور جرائم میں بھی بے تحاشہ اضافے کی اطلاعات موصول ہونے لگیں[۱]۔ المختصر سندھ میں صورت حال از حد تشویش ناک ہو گئی۔

سندھ میں کوئی آئینی اور سیاسی فارمولا قابل عمل نہیں رہا تھا۔ سیاسی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے تمام تدابیر ناکام رہیں اس لئے دفعہ ۹۲ (الف) کے نفاذ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مرکزی کابینہ اس صورت حال پر غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ سندھ میں گورنر راج نافذ کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۹ دسمبر ۱۹۵۱ء کو سندھ میں دفعہ ۹۲ (الف) نافذ کر دی گئی[۲] اور وزارت توڑنے کے ساتھ سندھ اسمبلی کو بھی کالعدم قرار دے دیا گیا۔ اس سلسلہ میں جو سرکاری اعلان جاری کیا گیا اس میں "جونہی حالات نے اجازت دی" نئے انتخابات کرانے کی یقین دہانی بھی شامل تھی[۳]۔

صحیح جمہوریت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے زیادہ سے زیادہ مفاد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور جمہوری حکومت میں ایک وزارت کے مستعفی ہو جانے یا برطرف کئے جانے کے بعد دوسری وزارت کی تشکیل کو معمول کی حیثیت حاصل

۱۔ ڈان کراچی ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۱ء

۲۔ ایضاً ۱۲ر دسمبر ۱۹۵۱ء

۳۔ ایضاً ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۱ء

۴۔ ایضاً

Marfat.com

ہوتی ہے۔ لیکن سندھ میں سیاسی قیادت کے علمبرداروں کے رویہ اور کردار سے یہ احساس ذرا تازہ ہوتا تھا کہ وہ مسلم الثبوت معمول کے بجائے کسی اور نظریہ جمہوریت کے قائل ہیں اور وہ ہے چند افراد کا زیادہ سے زیادہ مفاد۔ کھوڑو کا خیال اور نقطۂ نظریہ تھا کہ عنانِ اقتدار صرف ان کے ہاتھ میں رہنی چاہیے ورنہ کوئی بھی اس کا مستحق و مجاز نہیں۔ اگر انہیں وزارت اعلیٰ کی گدی خالی کرنی پڑے تو پھر کسی کو بھی یہ منصب نہیں ملنا چاہیے۔ سندھ میں ابتر صورت حال کا بنیادی سبب کھوڑو کی یہی ذہنیت تھی۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز تھی کہ خود کھوڑو کے خلاف رشوت ستانی، بدعنوانی، بدانتظامی، بدنظمی اور اختیارات کے استعمال ناجائز کے الزامات کی پاداش میں دوسری مرتبہ عدالتی تحقیقات شروع ہونے والی تھی لیکن وہ اپنے ساتھیوں اور سیاسی حریفوں کے "خلاف نظم و ضبط کا ڈنڈا چلا رہے تھے"[1]۔

سندھ میں گورنر راج کے نفاذ کے بعد یہ مطالبہ کیا گیا کہ سندھ مسلم لیگ کو بھی توڑ کر جماعت کے نئے انتخابات کرائے جائیں۔ اس مطالبے کی تائید و حمایت مسلم لیگ کے کارکنوں اور مہاجرین کے علاوہ مقامی اخبارات نے بھی کی۔ اس مطالبے کی بنیاد یہ حقیقت تھی کہ سندھ مسلم لیگ عوام کی نمائندہ و ترجمان جماعت نہیں رہی۔

فروری ۱۹۵۲ء میں سندھ مسلم لیگ کے کارکنوں کی ایک کنونشن منعقد ہوئی جس میں صوبے کے تمام حصوں سے دو ہزار مندوبین شریک ہوئے۔ اس کنونشن میں پاکستان مسلم لیگ کے صدر سے بہ زور مطالبہ کیا گیا کہ وہ جرأت سے کام لے کر مسلم لیگ کی سیاسیات کو ساری خرابیوں سے نجات دلائیں

---

[1] ڈان کراچی ۲۰ دسمبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

جو اُن خود غرض اور بد دیانت عناصر کی پیدا کردہ ہیں جو قومی مفادات کو سنگدلی سے پامال کر کے محض ذاتی مفادات کے لیے اس قومی تنظیم کا استحصال کرتے رہے ہیں۔ کنونشن میں سندھ صوبائی مسلم لیگ کو توڑ دینے اور نئے انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا گیا[1]۔ کنونشن کے اس مطالبے کی تائید میں سابق سندھ اسمبلی کے کئی ارکان اور مسلم لیگ کے ممتاز کارکنوں نے بھی اخباری بیانات جاری کیے۔ علاوہ ازیں مقامی اخبارات نے اپنے ادارتی مقالوں میں بھی اتفاق رائے سے سندھ صوبائی مسلم لیگ کو توڑ دینے کا مطالبہ کیا[2]۔ سندھ مہاجر کانفرنس نے بھی اپنی قراردادوں میں صوبائی مسلم لیگ کو توڑ دینے اور زیادہ نمائندہ خطوط پر اس کی از سر نو تنظیم کا مطالبہ کیا[3]۔

جنوری ۱۹۵۳ء کے شروع میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث و نزاع کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ کھوڑو کا مرکزی حکومت کے بعض بارسوخ لیڈروں سے سیاسی اتحاد تھا۔ موقع پرستی میں بدرجہ اتم ماہر ہونے کے باعث انھوں نے اسے خداداد موقع سمجھا اور سندھ مسلم لیگ کی جانب سے رضاکارانہ طور پر رپورٹ کی حمایت کی پیشکش کر دی اور اس طرح بحث و نزاع سے پریشان وزیر اعظم کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے اپنے اس منصوبے کے تحت ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلایا اور اپنے مفاد کے مطابق قرارداد منظور کرلی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اجلاس میں اصل ورکنگ کمیٹی کے نصف سے بھی کم ارکان شامل ہوئے تھے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ

---

[1] ڈان کراچی ۱۲ر فروری ۱۹۵۲ء

[2] ایضاً ۲۴ر اپریل ۱۹۵۲ء

[3] ایضاً ۲۱ر مئی ۱۹۵۲ء

وہ ان سب ارکان کو باری باری ورکنگ کمیٹی سے خارج کرتے رہے تھے جو ان سے اختلاف رائے کی جرأت کرتے تھے۔[۱] ان مساعی کے باوجود وہ مرکزی حکومت کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

پروڈا کے تحت تحقیقات مکمل ہونے پر کھوڑو اور قاضی فضل اللہ کے خلاف بدعنوانی کے الزامات ثابت ہو گئے اور گورنر جنرل نے انہیں علی الترتیب چھ اور چار سال کے لئے کسی عوامی عہدہ پر فائز ہونے کے نااہل قرار دے دیا۔[۲] لیکن کھوڑو کو راہِ راست پر لانا کم و بیش ناممکن تھا۔ اور ایسی نااہلی کو وہ اپنی قیادت مسلط کرنے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے۔ عام لوگ انہیں سخت ناپسند کرتے تھے اور ویسے بھی انہیں عوام سے کیا غرض وہ تو صرف مسلم لیگ کو اپنی مٹھی میں رکھتے تھے۔ نااہلی کی میعاد شروع ہونے کے فوراً بعد اُنھوں نے سندھ مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا اور جماعت کے صدر منتخب ہو گئے۔ ان سیاسی چالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے صوبائی لیڈر اپنی جماعت ملک یا قوم سے کس قدر مخلص تھے اور ان کے عزائم میں اصولوں کو کس قدر دخل تھا۔ یہ بات مرکزی حکومت کے لئے بہت بڑا اور کھلا چیلنج تھی چنانچہ صدر پاکستان مسلم لیگ خواجہ ناظم الدین نے کھوڑو کے غیر آئینی طور طریقوں کو انتہائی قابل اعتراض قرار دے کر سندھ لیگ کونسل کی ساری کارروائی کو بے ضابطہ اور خلافِ قانون قرار دے کر کالعدم کر دیا۔[۳]

صوبائی لیڈروں کی خودسری نے مرکز اور صوبوں میں بداعتمادی کا بیج بو دیا۔ مرکز اور صوبے ایک دوسرے سے یوں سلوک کرنے لگے جیسے ایک

---

[۱] ڈان کراچی ۸ جنوری ۱۹۵۳ء [۲] ڈان کراچی ۲۷ جنوری ۱۹۵۳ء
[۳] ایضاً ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء

Marfat.com

دوسرے کے سیاسی حریف ہیں حالانکہ وہ ایک ہی سیاسی جماعت کے تحت تھے۔ اس سے نہ صرف انتظامیہ بلکہ پورے ملک کی فضا بُری طرح متاثر ہوئی اور صوبائی تعصب کے احساسات کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔

اس دوران میں سندھ میں عام انتخابات قریب آ گئے اور مسلم لیگ ان کے سلسلے میں وسیع تیاریاں کر رہی تھی۔ مرکزی مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ نے ایک انتخابی کمیٹی نامزد کی، جس کا سربراہ مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار کو بنایا گیا۔ اس کمیٹی کو مسلم لیگ کی طرف سے سندھ میں انتخابی مہم کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ اس کمیٹی کے دوسرے ارکان پیر محفوظ الٰہی، سردار امیر اعظم خان، پیر پگارڈو اور سید احمد نواز تھے۔[1]

حیرت تو اس بات پر تھی کہ سندھ مسلم لیگ نے بھی دیکھا دیکھی فیشن کے طور پر انتخابی منشور جاری کر دیا حالانکہ اس کے لیڈر انتخابی منشور کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا ذاتی منشور تھا اور وہ تھا کرسی اقتدار۔ اس کے حصول میں جمہوریت بھینٹ چڑھتی تھی یا قوم، یہ ان کا دردِ سر نہ تھا۔

سندھ مسلم لیگ کا یہ انتخابی منشور ۷ نکات پر مشتمل تھا اور اس میں دفاع، شہری آزادیاں، زرعی و انتظامی اصلاحات، مہاجرین کے مسائل، تعلیم و صحت، محنت کش اور بیروزگاری، تعمیراتِ عامہ اور اقلیتوں کے بارے میں پروگرام واضح کیا گیا تھا۔ منشور میں آزاد اور منصفانہ انتخابات کی یقین دہانی کرانے کے ساتھ ساتھ بدعنوانی اور رشوت ستانی کی مذمت کی گئی تھی۔[2] ظاہر ہے کہ یہ مذمت اُسی رشوت ستانی اور بدعنوانی کی تھی جسے خود لیگی لیڈروں نے بڑی محنت سے

---

[1] ڈان کراچی۔ ۹ر اپریل ۱۹۵۳ء

[2] ڈان کراچی ۱۴ر اپریل ۱۹۵۳ء

Marfat.com

پروان چڑھایا تھا۔ یہ توقع بھی ظاہر کی گئی تھی کہ وزیرِ اعظم اور صدرِ پاکستان مسلم لیگ خواجہ ناظم الدین خود بھی سندھ کا انتخابی دورہ کریں گے اور منشور کی وضاحت کے ساتھ ساتھ عام لوگوں میں اسے مقبول بنانے کی مہم میں حصہ لیں گے، لیکن قبل ازیں کہ وہ کچھ کرتے، گورنر جنرل نے انہیں وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا اور مسلم لیگ نے ان سے عہدہ صدارت بھی واپس لے لیا۔

مسلم لیگ کو سندھ کے انتخابات میں توقع کے مطابق کامیابی ہوئی اور اس نے صوبائی اسمبلی کی نشستوں میں اکثریت پر قبضہ کر لیا۔ پیرزادہ عبدالستار مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے سربراہ چنے گئے اور اس طرح وہ صوبائی وزیرِ اعلیٰ بن گئے[۳۸]۔ لیکن بہت جلد قاضی فضل اللہ ان کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے۔ اس مرتبہ انہیں کھوڑو کی حمایت حاصل تھی۔ بہرحال پارلیمانی پارٹی نے دوسرے ہی اجلاس میں وزیرِ اعلیٰ کی قیادت پر مکمل اعتماد کی قرارداد منظور کر دی۔ اس قرارداد کی حمایت ۸۰ ارکان نے کی[۳۹]۔ یہ سب کچھ دھڑوں کے لیڈروں کی رہنمائی کے تحت ہو رہا تھا۔ انھوں نے پھر بنانے اور بگاڑنے کا پرانا اور رسواکن کھیل شروع کر دیا تھا چنانچہ سندھ میں نئے انتخابات کے بعد بھی سندھ اسمبلی مخلص اور سچی لیڈرشپ سے محروم رہی۔

سندھ میں سیاسی حالات ایک مرتبہ پھر کشیدہ اور ابتر ہو گئے۔ قاضی فضل اللہ اگرچہ کسی عوامی عہدہ پر فائز ہونے کے اہل نہیں رہے تھے لیکن اس کے باوجود سیاست میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا اور وہ نئے انتخابات میں اپنے کئی ساتھیوں اور دوستوں کو منتخب کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پیرزادہ عبدالستار کو صوبائی

---

[۳۸] ایضاً ۲۳ رمئی ۱۹۵۴ء

[۳۹] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۷-۲۸ رمئی ۱۹۵۴ء

Marfat.com

اسمبلی کے ارکان کی مکمل حمایت حاصل نہیں تھی اس لئے انہیں سندھ کے پرانے سیاسی ستونوں سے مصالحت کرنے پر مجبور ہونا پڑا تاکہ ان کے حامی وزارت کا ساتھ دیتے رہیں۔ جون ۱۹۵۴ء میں پیرزادہ نے قاضی فضل اللہ سے سیاسی سمجھوتہ کیا اور موخر الذکر نے انہیں اپنے گروپ کی حمایت کا یقین دلایا۔ اس سودے بازی میں پیرزادہ کو اپنی کابینہ میں قاضی فضل اللہ کے گروپ سے بھی دو وزیر لینے پڑے[1]۔ اس طرح پیرزادہ کی وزارت اعلیٰ تو بچ گئی لیکن سندھ میں وزیروں کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی۔ یہ صوبائی معیشت پر ناقابل جواز بارِ گراں تھا اور چھ اضلاع کے صوبے میں بارہ وزیر جمہوری اصول کے بھی منافی تھے[2]۔ یہ قیمت ادا کرنے کے بعد جو مصالحت ہوئی وہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی کیونکہ پیرزادہ کو ۸ نومبر ۱۹۵۴ء کو وزارت اعلیٰ سے معطل کر دیا گیا اور ان کا جرم یہ تھا کہ وہ ون یونٹ کے مخالف تھے۔ ان کی جگہ ایک بار پھر کھوڑو کو وزارت اعلیٰ سونپی گئی تاکہ وہ ارکان اسمبلی کو ڈرا دھمکا کر ون یونٹ کے حق میں ووٹ حاصل کر سکیں چنانچہ معاہدے کے مطابق اس خدمت کے صلے کے طور پر کھوڑو کو ون یونٹ کے بعد بھی مغربی پاکستان کی کابینہ میں وزیر لے لیا گیا۔

بہرحال دوسرے صوبوں کے مانند سندھ میں بھی لیڈروں کی دھڑے بندی اور سیاسی کردار کا فقدان مسلم لیگ کے زوال اور بدنامی کا باعث بنا۔

شمالی مغربی سرحدی صوبہ

سرحد میں سیاست دوسرے صوبوں کی طرح شخصیتوں کے گرد گھوم رہی تھی۔

---

[1] ڈان کراچی ۔ ۲۳ جون ۱۹۵۴ء

[2] نوائے وقت لاہور ۲۶ جون ۱۹۵۴ء

Marfat.com

اس صوبہ میں بھی سیاسی اقتدار کے لئے رسہ کشی کا آغاز قیام پاکستان کیساتھ ہی ہو گیا تھا۔ سرحد میں بھی اصولوں سے مطلق سروکار نہ رکھا گیا اور خود غرضی ہی سیاست کا محرک تھی۔

تقسیم کے بعد سرحد میں چار نمایاں اور ممتاز مسلم لیگی لیڈر تھے اور وہ اپنے صوبے کی حدود سے باہر ملکی سطح پر بھی شہرت و مقبولیت کے مالک تھے۔ انھوں نے قیام پاکستان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ یہ لیڈر سردار عبدالرب نشتر خان عبدالقیوم خان، پیر مانکی شریف اور یوسف خٹک تھے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد قائداعظم کی ہدایت پر سرحد کی کانگرس وزارت کو جس کے سربراہ سرخپوش لیڈر ڈاکٹر خان صاحب تھے برطرف کر دیا گیا اور خان عبدالقیوم خان کو سرحد کا نیا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ سرحد میں سیاسی صورت حال نازک اور سنگین تھی۔ یہ صورت حال سرخپوشوں کی پاکستان دشمن سرگرمیوں سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کے لیڈر خان عبدالغفار خان تھے جو گاندھی کے چیلے تھے اور "سرحدی گاندھی" کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب ان کے بڑے بھائی تھے۔ خان عبدالقیوم خان بہت مضبوط آدمی بلکہ مرد آہن مشہور تھے اور یہ خیال تھا کہ وہ سرحد میں صورت حال سے نپٹنے کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوں گے لیکن وزیر اعلیٰ بننے کے بعد خان عبدالقیوم سرحد کے مقبول ترین مسلم لیگی لیڈر پیر مانکی شریف کو اپنا سیاسی حریف سمجھنے لگے۔ پیر صاحب ایک شریف النفس انسان تھے اور انھوں نے تحریک پاکستان میں ناقابل فراموش خدمات سرانجام دی تھیں۔ خان عبدالقیوم پہلے کانگرس میں تھے اور کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر بھی تھے۔ ۱۹۴۵ء میں اُنھوں نے ایک کتاب "سونا اور بندوق" لکھی تھی جس میں انھوں نے قائداعظم اور مسلم لیگ پر بڑی ناروا تنقید

Marfat.com

کی تھی لیکن جب یہ کتاب تالیف کے مراحل سے گزر کر زیور طبع سے آراستہ ہوئی، خان عبدالقیوم مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے۔ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد خان عبدالقیوم نے بعض سرخپوشوں کو ہم نوا بنا لیا اور باقی کو دبا دیا۔ یہی روش انھوں نے مسلم لیگی لیڈروں کے بارے میں بھی اختیار کی۔ جو سرکردہ مسلم لیگی ان کی ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہ ہوئے، ان سے نہایت نامناسب اور غیر شریفانہ سلوک کرنے سے بھی احتراز نہ کیا۔ "قیوم طبعاً آمر ہیں جبکہ پیر مانکی شریف تحریک پاکستان میں اپنی بھرپور خدمات کے باعث صوبائی معاملات میں زیادہ عمل دخل کے خواہاں تھے۔ اس لئے ان میں شخصی بنیادوں پر تصادم ناگزیر ہو گیا"[1]

وزیر اعلیٰ کی حیثیت میں خان عبدالقیوم خان ہمہ مقتدر تھے اور صوبائی وزراء اور ارکان اسمبلی ان کے اشارۂ ابرو پر رقص کرتے تھے۔ پیر مانکی شریف سرحد مسلم لیگ کی صدارت کے خواہاں تھے لیکن وزیر اعلیٰ اس کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ وہ مساوی طور پر مقبول لیڈر کو شریک اقتدار نہیں بنانا چاہتے تھے۔ خان عبدالقیوم یہ سمجھتے تھے کہ صوبائی لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد پیر صاحب ان کی راہ میں مشکلات حائل کر دیں گے اور وہ من مانی نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ خان عبدالقیوم نے چوہدری خلیق الزمان سے ساز باز کر کے اپنے ایک وفادار پیروکار بادشاہ گل کو صوبائی مسلم لیگ کا آرگنائزر نامزد کرا لیا۔ بادشاہ گل ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے تھے اور تحریک پاکستان کے سلسلہ میں ان کا نام تک سننے میں

---

[1] یوسف خٹک سے ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو لاہور میں ذاتی انٹرویو۔ موصوف اس وقت مسلم لیگ کے قیوم گروپ کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان مسلم لیگ کے پہلے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے تھے۔

Marfat.com

نہیں آیا تھا[۱]۔ ان کی تعلیم بھی واجبی تھی۔ انہیں نہ کوئی سیاسی اثر و رسوخ حاصل تھا اور نہ سیاسی پارٹی میں کام کرنے کا کوئی تجربہ تھا۔ وہ قیادت کے بنیادی اوصاف سے بھی بالکل معریٰ تھے۔ جو سرحد میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے ناگزیر تھے۔ اس منصب جلیلہ پر ان کا تقرر خان عبدالقیوم کے ایما پر ہوا تھا کیونکہ تمام دوسرے آمروں کی طرح انہیں فعال آرگنائزر یا مقبول لیڈر کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ انہیں ایک وفادار آدمی درکار تھا[۲]۔ چودھری خلیق الزمان خود بھی تنظیم نو کے بعد پاکستان مسلم لیگ کا صدر بننے کے خواہاں تھے اور ان کی یہ خواہش صرف صوبائی وزراء اعلیٰ کی حمایت و امداد سے پوری ہو سکتی تھی اس لئے کسی صوبائی وزیر اعلیٰ کے مجوزہ اور نامزد شخص کو آرگنائزر بنانے کے معاملہ میں اختلاف ان کے بس کا روگ نہ تھا[۳]۔ بادشاہ گل کے آرگنائزر مقرر ہونے سے صوبائی مسلم لیگ مکمل طور پر خان عبدالقیوم کی باندی بن گئی۔ بادشاہ گل تنظیم نو کے بعد صوبائی لیگ کے صدر منتخب ہو گئے اور ۱۹۵۱ء تک اس عہدے پر فائز رہے، جب ان کی جگہ وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خود صوبائی مسلم لیگ کے بھی صدر بن گئے۔

سرحد مسلم لیگ نے ۱۹۴۸ء میں رکنیت سازی کی مہم میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ خان عبدالقیوم اور پیر مانکی شریف دونوں اپنے گروہوں کے زیادہ سے زیادہ افراد کو رکن بنانا چاہتے تھے کیونکہ انہی ارکان کو درجہ بدرجہ مسلم لیگ کے عہدیداروں کا انتخاب کرنا تھا۔ تاہم دوسرے مقتدر صوبائی لیڈروں کی

---

[۱] ایضاً [۲] ایضاً

[۳] عبدالوحید خان سے ذاتی انٹرویو۔ موصوف ایک پرانے مسلم لیگی کارکن ہیں۔ وہ پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ ایوب خان کے زمانہ میں وہ مرکزی وزیر اطلاعات اور کنونشن مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل رہے۔ اب وہ مسلم لیگ (قیوم گروپ) سے وابستہ ہیں۔

Marfat.com

طرح خان عبدالقیوم بھی سرحد میں مسلم لیگ کو صرف اپنے پیروکاروں تک محدود رکھنا چاہتے تھے اور پیر صاحب اس معاملے میں ان کے زبردست حریف تھے۔

سرحد میں مسلم لیگ کی رکنیت سازی کی مہم کے سلسلے میں جو تنظیمی کمیٹی مقرر کی گئی اس کے لیے چودھری خلیق الزمان نے خان عبدالقیوم سے پیشگی منظوری حاصل کر لی تھی۔ وزیراعلیٰ کے زیراثر تنظیمی کمیٹی نے اس بات کا پورا اہتمام کیا کہ رکنیت سازی صرف صوبائی ارباب اختیار کے پیروکاروں تک محدود رہے۔ پیر مانکی شریف کے حامیوں کو یہ عذر پیش کر کے رکنیت کے فارم تک نہ دیئے گئے کہ ایک آدمی کو صرف ایک ہی فارم مل سکتا ہے[1]۔ پیر صاحب نے پندرہ دن تک صوبے کے مختلف حصوں کا دورہ کیا اور لوگوں پر اس صورت حال کے مضمرات واضح کرنے کی کوشش کی لیکن حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کے تحت تمام پبلک جلسوں اور اجتماعات پر پابندی عائد کر دی[2]۔ یہ پابندی مخالف گروپ کی سرگرمیوں میں رکاوٹ ڈالنے کی بھونڈی کوشش تھی۔ پیر صاحب نے اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کا مطالبہ کر دیا لیکن چودھری خلیق الزمان نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے خان عبدالقیوم خان پر عائد کردہ تمام الزامات سے چشم پوشی کی۔ دونوں گروپوں کے درمیان اختلافات اس قدر شدید ہو گئے کہ صوبائی سربراہ کی پالیسیوں کے خلاف بطور احتجاج پیر صاحب لیگ الیکشن کمیٹی کے اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے[3]۔ قائداعظم کی

---

[1] یوسف خٹک سے انٹرویو۔

[2] پاکستان ٹائمز ۲۹ر نومبر ۱۹۴۷ء

[3] پاکستان ٹائمز ۹ دسمبر ۱۹۴۸ء

Marfat.com

وفات کے بعد لیاقت علی خان نے مانکی شریف اور قیوم کے اختلافات دور کرانے کی کوشش کی یہ کوشش وقتی طور پر کامیاب ہوگئی اور شریف النفس پیر صاحب نے حکومت سے پورا تعاون کرنے کا وعدہ بھی کر لیا لیکن جلد ہی وہ قیوم خان پر شک و شبہ کا اظہار کرنے لگے۔ پیر صاحب نے الزام لگایا کہ قیوم خان نے اپنے سرکاری منصب سے ناجائز فائدہ اٹھا کر شہری اور ضلعی لیگوں میں اپنے پیروکاروں کو منتخب کرا لیا ہے اور پارٹی پر ان کی گرفت بہت مضبوط اور مکمل ہوگئی ہے۔ اور پیر صاحب اسی مسلم لیگ میں اجنبی سے بن کر رہ گئے ہیں[1] جس کی خدمت میں انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کیا تھا۔ چودھری خلیق الزمان نے ایک مرتبہ پھر دونوں متحارب دھڑوں سے بات چیت کی لیکن اختلافات برقرار رہے[2] اس طرح سرحد مسلم لیگ میں گروہ بندی، جوڑ توڑ اور سازشوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

خان قیوم کی آمرانہ پالیسیوں کی وجہ سے سرحد مسلم لیگ کے مختلف گروہوں میں اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ ان کی پالیسی اور طرز عمل سے مایوس اور دل گرفتہ ہو کر ۱۹۴۹ء میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی سے سات ارکان اسمبلی بھی علیحدہ ہو گئے اور انھوں نے وزیر اعلیٰ پر کمیونسٹ ہونے اور تخریبی اور غیر اسلامی پروگرام پر عمل کرنے کا الزام لگایا۔[3]

خان عبدالقیوم کے غتاب و انتقام کا دوسرا خاص نشانہ غلام محمد خان لوند خوڑ تھے۔ وہ ایک پرانے سیاسی کارکن اور سرحد مسلم لیگ کے نمایاں لیڈر تھے۔ انہیں

---

[1] مارشل لا سے مارشل لا تک (بحوالہ سابقہ) ص ۳۸۲

[2] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۸ء

[3] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۲ر مارچ ۱۹۴۹ء

Marfat.com

حکومت نے نظر بند کر رکھا تھا لیکن سندھ ہائی کورٹ نے حکومت سرحد کے اس اقدام کو خلافِ قانون اور ناجائز قرار دے دیا چنانچہ وہ جیل سے رہا ہو گئے۔[1] انہوں نے قیوم خان کے خلاف ایک گروپ بنایا اور ان کی وزارت کو برطرف کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے وزیرِ اعلیٰ پر جاگیریں منسوخ نہ کرنے اور شہری آزادیوں پر جابرانہ پابندیوں کا الزام لگایا۔ اس دوران میں مسلم لیگ کی مرکزی تنظیم کے انتخابات اپریل ۱۹۴۹ء میں کراچی میں ہوئے۔ چودھری خلیق الزمان کے صدر اور یوسف خٹک کے جنرل سیکرٹری منتخب ہونے پر پیر مانکی شریف بالکل مایوس اور نا امید ہو گئے۔ یوسف خٹک کے قیوم خان سے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے اور چودھری خلیق الزمان کو پیر مانکی شریف سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ان انتخابات سے وہ اس حتمی نتیجہ پر پہنچے کہ اب مرکزی مسلم لیگ بھی خان قیوم کی آمرانہ پالیسیوں کی حمایت کرے گی۔[2] اس کے بعد پیر مانکی شریف اور ان کے حامیوں نے ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔ سرحد کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے پشاور میں سیاسی کارکنوں کی ایک کنونشن طلب کی گئی۔ کنونشن کے لئے جو دعوت نامے جاری کئے گئے ان پر پیر مانکی شریف، پیر زکوڑی شریف، سابق صوبائی وزیریال اور ایک ممتاز مسلم لیگی کارکن ملک تاج الدین خان نے دستخط کئے تھے۔[3] دونوں متخاصم دھڑوں میں مصالحت کرانے کے لئے سردار عبد الرب نشتر پشاور پہنچے، ان کی کوششوں سے سرحد کے وزیرِ تعلیم میاں جعفر شاہ نے پیر مانکی شریف سے نجی سطح پر بات چیت بھی کی، لیکن اختلافات جوں کے توں رہے۔

قیوم کے مخالف گروپ کی کنونشن جس کا بڑا شہرہ تھا جون ۱۹۴۹ء میں

---

[1] ایضاً ۲۰ اپریل ۱۹۴۹ء

[2] مارشل لاء سے مارشل لاء تک (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۳۸۳

[3] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۲ مئی ۱۹۴۹ء

Marfat.com

طلب کی گئی لیکن اجلاس سے پہلے حکومت سرحد نے اس پر پابندی لگا دی اور سیاسی کارکنوں کی بڑی تعداد کو گرفتار کر لیا۔ پیر زکوڑی شریف کو گرفتار کرنے کے بعد تین سال کے لئے قید کر دیا گیا۔ ان کے خلاف یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے حکومت کی طرف سے پابندی کے باوجود کوہاٹ میں عام جلسہ کیا ہے[1]۔

اس پر پیر مانکی شریف نے یہ تبصرہ کیا کہ "شمال مغربی سرحدی صوبہ قید خانہ بن کر رہ گیا ہے"[2]۔ باری باری یہ سب لوگ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے اور پھر انھوں نے اس جماعت سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ اس طرح سرحد مسلم لیگ بہت سے مخلص اور بے لوث کارکنوں کی خدمات سے محروم ہو گئی۔ ستمبر ۱۹۴۹ء میں پیر مانکی شریف نے "عوامی مسلم لیگ" کے نام سے اپنی جماعت بنا لی جو بعد ازاں سہروردی اور ممدوٹ کے الحاق سے جناح عوامی لیگ بن گئی۔ اس طرح وزیر اعلیٰ کے غیر جمہوری رویہ کے باعث سرحد میں ایک اپوزیشن پارٹی ظہور میں آئی اور سیاسی صورت حال جو سرخپوشوں کی وجہ سے پہلے ہی ناخوشگوار تھی اور زیادہ پیچیدہ ہو گئی۔

مارچ ۱۹۵۱ء میں دستور ساز اسمبلی نے بالغ رائے دہی کی اساس پر صوبہ سرحد میں عام انتخابات کرانے کا بل منظور کیا[3]۔ اس قانون کے تحت سرحد اسمبلی کو توڑ دیا گیا لیکن قیوم خان کو نگران وزارت کے سربراہ کے طور پر برقرار رہنے دیا گیا۔

عام انتخابات سے قبل سرحد مسلم لیگ کے عہدیداروں کے انتخابات ہونے

---

[1] ایضاً ۱۶ جون ۱۹۴۹ء

[2] مارشل لاء سے مارشل لاء تک (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۲۸۳

[3] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۸ مارچ ۱۹۵۱ء

Marfat.com

تھے ۔ اس وقت تک صوبائی لیگ قیوم خان کے بالواسطہ کنٹرول میں تھی ۔ اب وہ خود صوبائی لیگ کی صدارت کے امیدوار تھے ۔ ان کا مقابلہ خان ابراہیم خان جھگڑا کر رہے تھے اور وہ اس لحاظ سے ایک مضبوط حریف تھے کہ خٹک گروپ ان کی حمایت میں سرگرم تھا ۔ قیوم خان اور یوسف خٹک ۴۸-۱۹۴۷ء میں گہرے دوست اور ایک دوسرے کے سیاسی حلیف تھے لیکن اس کے بعد ان میں بھی اختلافات پیدا ہو گئے جو ذاتی نوعیت کے تھے ۔

دونوں لیڈروں میں وجہ اختلاف یہ بات بنی کہ مسلم لیگ کے جو پرانے کارکن قیوم خان کے آمرانہ طور طریقوں کا نشانہ بنے تھے ، انھوں نے مرکزی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف خٹک سے قیوم خان کے رویے کے خلاف شکایت کی تھی ۔ جب اُنھوں نے اس شکایت کو پذیرائی بخشی تو قیوم خان اُن سے سخت برہم ہو گئے ۔ اس طرح ۱۹۴۹ء تک قیوم خان اور یوسف خٹک کے تعلقات بھی کشیدہ ہو چکے تھے[1] ۔

قیوم خان کے مقابل ابراہیم جھگڑا کے صدارتی امیدوار بننے سے سرحد لیگ میں ذاتی وقار کو دوسری سب باتوں پر فوقیت حاصل ہو گئی جس سے دھڑے بندی کو مزید تقویت پہنچی ۔ ابراہیم جھگڑا نہ صرف ایک اہم لیڈر تھے بلکہ پاکستان مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کے رکن بھی تھے ۔ اس باہمی رسہ کشی سے واضح ہو گیا کہ سرحد لیگ میں ہوس اقتدار نے انتشار و افتراق کے جو بیج بوئے تھے ، انھوں

---

[1] یوسف خٹک سے انٹرویو (بحوالہ سابقہ)

Marfat.com

نے مسلم لیگ کو کس قدر بدنامی اور رسوائی سے دوچار کیا ہے۔

لیاقت علی خان کو اس صورت حال سے تشویش ہوئی۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ مسلم لیگ کو کمزور کرنے میں کون سے عوامل کار فرما ہیں[1]۔ وہ سرحد مسلم لیگ میں دوبارہ اتحاد پیدا کرنے کے لئے خود پشاور پہنچے، لیکن حکومت و سیاست میں ان کے اقتدار اور اونچی حیثیت و مرتبہ کے باوجود ابراہیم جھگڑا نے مقابلے سے دستبردار ہونے سے معذوری ظاہر کر دی۔ نگران حکومت میں وزیر اعلیٰ ہونے کی وجہ سے قیوم خان کو صوبائی انتظامیہ پر مکمل اختیار و اقتدار حاصل تھا اور اُنھوں نے صدارتی انتخاب جیتنے کے لئے اس اختیار و اقتدار کو پوری طرح استعمال کیا[2]۔

لیاقت علی خان نے کھلم کھلا قیوم خان کی حمایت و امداد کی۔ اور ان کی کامیابی کے لئے اپنے سارے ذرائع استعمال کئے[3]۔ چنانچہ صوبائی لیگ کونسل کے جو ارکان جھگڑا خٹک گروپ کے حامی تھے ان کی کافی تعداد کو اس مال

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۷ر اپریل ۱۹۵۱ء

[2] مارشل لاء سے مارشل لاء تک، روزنامہ "مشرق" لاہور ۳ر مئی ۱۹۶۴ء

[3] روزنامہ "ڈان" کراچی نے جو لیاقت علی خان کا نفس ناطقہ تھا، اس سلسلے میں یہ لکھا۔ "سرحد کے اس دورے پر جانے کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ لیاقت علی خان ذاتی طور پر سرحد لیگ کے تنظیمی مسائل کا جائزہ لینا چاہتے ہیں اور بر سر موقع اصلاح احوال کے لئے قدم اُٹھانے کے خواہاں ہیں۔ چونکہ وہ بر سر موقع تمام شکایات کی پڑتال کر رہے ہیں اس لئے ان پر اظہار رائے مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن سرحد لیگ کے بعض بنیادی مسائل ایسے بھی ہیں جن پر برملا اور صاف گوئی سے اظہار خیال ہونا چاہیئے۔ ان میں

Marfat.com

میں داخل نہ ہونے دیا گیا جہاں انتخابی کارروائی ہو رہی تھی[1] اس کے باوجود قیوم خان

حاشیہ بقیہ صٖ ۲۱۷

سرِ فہرست یہ ہے کہ کیا صوبوں میں حکومت اور مسلم لیگ کا سربراہ ایک ہی شخص ہونا چاہیئے۔ اس سوال کو سرحد اور سندھ میں بڑی اور فوری اہمیت حاصل ہو گئی ہے کیونکہ وہاں عنقریب بالغ رائے دہی کی اساس پر پہلے کی نسبت زیادہ ارکان والی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہونے والے ہیں۔ سرحد میں یہ عہدے اب تک علیحدہ رہے ہیں۔ اگرچہ یہ افواہیں سننے میں آ رہی ہیں کہ قیوم خان یہ دونوں عہدے اب اپنی ذات میں یکجا کرنے کے حق میں ہیں۔ لیاقت علی خان پشاور میں اس مسئلے سے بھی نپٹنے کی کوشش کریں گے لیکن یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا قیوم خان کے لئے یہ بات مناسب نہ ہو گی کہ وہ اسمبلی میں اپنی طاقت کی بنیاد پر صوبائی لیگ کی سربراہی بھی حاصل کر لیں۔ اسمبلی میں ان کے اپنے پیروکاروں کی بھرمار ہو گی۔ معقول اور صحیح یہی ہو گا کہ ان دونوں عہدوں کو الگ رکھا جائے"۔ ڈان ۲۹ر اپریل ۱۹۵۱ء "ڈان" کے اس اداریے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پشاور جانے سے پہلے لیاقت علی خان بھی نہیں چاہتے تھے کہ قیوم خان صوبائی لیگ کے صدر بن جائیں لیکن پشاور پہنچنے کے بعد قیوم خان نے انہیں اپنا ہم نوا بنا لیا۔ اس بات کی تائید یوسف خٹک نے بھی مولف کے ساتھ اپنے انٹرویو (بحوالہ سابقہ) میں کی۔

[1] یوسف خٹک سے ذاتی انٹرویو (بحوالہ سابقہ) کہا جاتا ہے کہ قیوم خان نے لیاقت علی خان کو ذاتی وفاداری کا یقین دلایا اور وزیر اعظم کو اس خطرے کا احساس دلایا کہ اگر ابراہیم جھگڑا صدارتی انتخاب میں کامیاب ہو گئے تو وہ پنجاب میں دولتانہ اور سندھ میں کھوڑو کے ساتھ مل کر ایک بہت مضبوط گروپ بنا لیں گے۔ سندھ میں کھوڑو کے بطور صدر صوبائی مسلم لیگ منتخب ہونے کا قوی امکان تھا۔ لیاقت علی خان کو اس بات میں اپنے لئے خطرہ نظر آیا کیونکہ وہ وزیر اعظم ہونے کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ اس لئے انھوں نے جماعت سے زیادہ اپنے ذاتی مفاد میں قیوم خان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

Marfat.com

صرف ۱۸ ووٹوں کی اکثریت سے صدر منتخب ہوئے اور ان کی فتح پر "شیر سرحد زندہ باد" کے نعرے لگائے گئے[1]۔ قیوم خان وزیر اعظم کی کھلی تائید، اپنے حکومتی اختیار اور صریح بے ضابطگیوں سے انتخاب جیتنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن یہ ان کی صرف ذاتی فتح تھی کیونکہ جس تنظیم کے وہ صدر منتخب ہوئے تھے اس میں انتشار و اختراق میں اور اضافہ ہو گیا۔

صوبائی مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد قیوم خان نے سارے صوبے کا دورہ کیا اور عام جلسوں میں تقریروں کے دوران میں اپنے سیاسی مخالفوں اور حریفوں کو "برطانوی سامراج" کی یادگار ہونے کا طعنہ دے کر انہیں عوام کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی۔ قیوم خان نے ان پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ ذاتی مفادات کے لئے دوسری اپوزیشن پارٹیوں سے بھی ساز باز کر رہے ہیں۔ انہوں نے مسلم لیگ سے ایسے عناصر کی تطہیر کا بھی عزم ظاہر کیا۔ اس کے علاوہ قیوم خان نے اپنے مخالفوں کے خلاف اس الزام کی تحقیقات بھی کرائی کہ انھوں نے رکنیت سازی کے چندے میں ساٹھ ہزار روپے کی رقم کا کوئی حساب پیش نہیں کیا۔ لیکن اس تحقیقات کا کوئی نتیجہ نہ نکلا[2]۔ نتیجہ بھی کیا نکلتا؟ یہ سارے ہتھکنڈے محض سیاسی حریفوں کو دبانے کے لئے تھے اس لئے ان الزامات کا فی الحقیقت درست ہونا ضروری نہ تھا۔

صوبائی مسلم لیگ کونسل نے اپنے ایک اجلاس میں پاکستان مسلم لیگ کی کونسل کیلئے ۴۰ ارکان کا بطور مرکزی کونسلر انتخاب کیا۔ فہرست کا سب سے نمایاں اور قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ اس میں دو ممتاز مسلم لیگی لیڈروں یعنی یوسف خٹک اور ابراہیم

---

[1] ڈان کراچی ۳۰ ر اپریل ۱۹۵۱ء

[2] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۳ ر مئی ۱۹۵۱ء

جھگڑا کے نام غائب تھے۔ اس کا بالواسطہ مطلب یہ تھا کہ وہ پاکستان مسلم لیگ کی ہائی کمان میں عہدیدار رہنے کے مجاز نہیں رہے تھے۔ یوسف خٹک اس وقت پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے اور ابراہیم جھگڑا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے رکن تھے۔ مسلم لیگ کے ان دو بڑے لیڈروں کو محض اس لئے صوبائی مسلم لیگ نے کونسلہ نہیں بنایا تھا کہ وہ قیوم خان کے مخالف اور حریف تھے۔ یوسف خٹک کا ردِّعمل بڑا فوری اور شدید تھا۔ اُنھوں نے پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے طور پر اس قرارداد کو منسوخ کر دیا۔ لیکن سرحد مسلم لیگ نے دوبارہ اجلاس کیا جس میں نہ صرف ان کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ منظور کیا گیا بلکہ ان کی مذمت بھی کی گئی تھی[۱]۔ اگرچہ ایک صوبائی لیگ کی طرف سے کل پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے بارے میں قرارداد مذمت معروف جمہوری معمولات کے صریحاً خلاف تھی، لیکن مسلم لیگ کے لیڈروں نے ایسی نامناسب باتوں کو معمول بنا لیا تھا۔

صوبائی لیگ کونسل نے دوسری مرتبہ قرارداد منظور کرنے کے بعد قیوم خان نے ابراہیم جھگڑا اور یوسف خٹک سے اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا کیونکہ وہ صوبائی لیگ کے اعتماد سے محروم ہو چکے تھے۔ صوبائی کونسل نے پاکستان مسلم لیگ کے صدر سے بھی یہ مطالبہ کیا کہ ان دونوں کو مسلم لیگ کے آئین کی دفعہ ۳۳ کے تحت موجودہ عہدوں سے ہٹا دے کیونکہ وہ سرحد کی طرف سے پاکستان مسلم لیگ کی کونسل کے رکن ہی نہیں رہے[۲]۔

اس دوران میں سرحد میں عام انتخابات کے لئے تیاریاں جاری تھیں۔

---

[۱] مارشل لاء سے مارشل لاء تک (بحوالہ سابقہ) روزنامہ "مشرق" لاہور ۳ر مئی ۱۹۶۴ء

[۲] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۸ر جولائی ۱۹۵۱ء

Marfat.com

جولائی میں انتخابی حلقوں کی حد بندی کا کام پایہ تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔ ووٹروں کی تعداد ۶۱ لاکھ سے بڑھ کر ۷۱ لاکھ ہو گئی تھی۔ نئی اسمبلی کے لیے ۸۵ ارکان کا انتخاب درپیش تھا۔

عام انتخابات میں سرگرمی سے کام کرنے کا اعلان قیوم خان نے ۱۲ جولائی ۱۹۵۱ء کو کیا۔ انھوں نے مسلم لیگ کے کارکنوں کو ہدایت کی کہ "وہ صوبے کے ہر کونے اور ہر گوشے میں پھیل جائیں اور عوام کو مسلم لیگ کے منشور سے آگاہ کریں"[1]۔ انھوں نے "مسلم لیگ کو ایک اوّل درجے کی متحد اور مربوط جنگی مشین بنا دینے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔ قیوم خان نے یہ بھی کہا کہ مسلم لیگ میں اب نہ پانچویں کالم کے لیے کوئی جگہ ہوگی اور نہ ان لوگوں کے لیے جو زبان سے تو اس قومی تنظیم کے اغراض و مقاصد اور پروگرام کو سراہتے ہیں لیکن قومی ترقی و تعمیر کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔

انتخابی سرگرمیوں کے سلسلے میں قیوم خان اور نگران حکومت کے دوسرے وزیروں نے صوبے کے ہر حصے کا دورہ کیا اور مسلم لیگی کارکنوں نے بھی سخت دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اس انتخابی مہم میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے سرکاری مشینری کو پوری طرح استعمال کیا گیا۔ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ لیاقت علی خان خود پشاور آ کر مسلم لیگی امیدواروں میں ٹکٹ تقسیم کریں گے لیکن اس اعلان کے صرف چند دن بعد راولپنڈی میں لیاقت علی خان قتل ہو گئے۔

خان ابراہیم خان جھگڑا نے مسلم لیگ سے اپنے اخراج کے خلاف اپیل کی اور پاکستان مسلم لیگ کے صدر نے اس بارے میں حکم امتناعی جاری کر دیا[2]۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد مرکزی مسلم لیگ میں یوسف خٹک

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۳ جولائی ۱۹۵۱ء [2] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

سب سے سرکردہ شخص تھے۔ سرحد مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو طلب کیا گیا لیکن قیوم خان نے اپنی آمرانہ روایات کے مطابق ان کونسلروں کو سرے سے دعوت نامے ہی نہ بھیجے جو جھگڑا خٹک گروپ کے حامی تھے۔ اس پر انھوں نے پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کو عرضداشت پیش کی۔ یوسف خٹک نے قیوم خان کو تار دے کر ہدایت کی کہ وہ بہ حیثیت صدر سرحد مسلم لیگ تمام ارکان کونسل کو کونسل کے اجلاس میں مدعو کریں۔ یوسف خٹک کے اس بارے میں صدر پاکستان مسلم لیگ کے اس سابقہ فیصلہ کا بھی حوالہ دیا گیا تھا جس میں سرحد مسلم لیگ کی اس قرارداد کو معطل کر دیا گیا تھا جو ان ارکان کے اخراج کے سلسلہ میں منظور کی گئی تھی۔[۱]

ان سب باتوں کے باوجود جب سرحد لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا تو ابراہیم جھگڑا اپنے گروپ کے ۹ حامیوں کے ساتھ سرحد مسلم لیگ کے آئین کے خلاف اظہار احتجاج کے لئے اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔ انھیں بنیادی اعتراض یہ تھا کہ یہ آئین کونسل کے بعض ارکان کی غیر موجودگی میں مرتب کیا گیا ہے۔ دوسری طرف قیوم خان کا یہ دعویٰ تھا کہ اس اجلاس میں تمام مجاز ارکان کو شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس مسئلے پر کوئی مصالحت نہ ہوسکی اور جھگڑا گروپ کے لئے اجلاس سے واک آؤٹ کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔[۲]

ان دونوں دھڑوں کے درمیان مستقل کشمکش کا نتیجہ نہ ختم ہونے والی سازشوں کی صورت میں نکلا۔ اس جھگڑے میں کوئی اصول یا پالیسی کارفرما نہیں تھی۔ دونوں گروہ عہدیدار بننے کے لئے سیاست برائے طاقت کے مکروہ کھیل میں مصروف تھے سرحد میں عام انتخابات دسمبر ۱۹۵۱ء میں ہونے والے

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء

[۲] ایضاً ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

تھے۔ قیوم خان نے چکر چلا کر ابراہیم جھگڑا، یوسف خٹک اور ان کے حامیوں کی طرف سے ٹکٹ حاصل کرنے کی درخواستیں اس بنیاد پر مسترد کرادیں کہ ان کے کامیاب ہونے کا رتی بھر امکان نہیں۔ انھوں نے مرکزی پارلیمانی بورڈ سے اپیل کی جس نے یوسف خٹک، ابراہیم جھگڑا اور ان کے چھ حامیوں کو مسلم لیگ کے ٹکٹ دے دیئے[1] مرکزی بورڈ کے اس فیصلہ پر "شیر سرحد" بڑے آتش زیرپا ہوئے۔ چنانچہ قیوم خان نے مرکز کو بھی سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے مرکزی لیگ کے ان سب نامزد امیدواروں کے خلاف اپنے آزاد امیدوار کھڑے کر دیے۔ قیوم خان کے ان امیدواروں کی کامیابی یقینی تھی اور ہوا بھی یہی کہ نہ صرف یوسف خٹک جو پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری تھے، ہار گئے بلکہ وہ تمام دوسرے امیدوار بھی شکست سے دوچار ہوئے جنھیں قیوم کی مرضی کے خلاف مرکزی پارلیمانی بورڈ نے ٹکٹ دیے تھے۔ قیوم خان کے نام نہاد "آزاد" امیدوار بعد میں لیگ اسمبلی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ یہ ایک اظہر من الشمس مثال تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پارٹی سے وفاداری کا نظریہ نابود ہو چکا تھا۔ سیاست کا محور ذاتی اور شخصی مفاد تھا۔ کسی نہ کسی طرح جب کسی کو بزمِ اقتدار میں باریابی نصیب ہو جاتی تھی تو اس کی ذات ہی جماعتی نظم وضبط کا پیکر بن جاتی تھی چنانچہ کوئی بھی دوسرا شخص اس کا محاسبہ نہیں کر سکتا تھا اور اس وقت تک وہ منصب پر فائز رہتا تھا جب تک کوئی مضبوط تر شخص اسے مات نہ دے دیتا۔ یوسف خٹک ۱۹۵۱ء تک پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے منصب

---

[1] ڈان کراچی ۸ نومبر ۱۹۵۱ء

جلیبہ پر فائز رہے اور ۱۹۵۱ء میں ہی ان کی حیثیت یہ ہو گئی کہ وہ مسلم لیگ کے فقط ایک پرائمری رکن رہ گئے۔ اس طرح کی خیرہ کن عروج و زوال کی کئی مثالیں مسلم لیگ کی تاریخ میں ملتی ہیں۔

قیوم خان خود دو حلقوں سے بلا مقابلہ منتخب ہو گئے تھے[۱] مسلم لیگ نے ۸۵ میں سے ۶۸ نشستیں جیت گئی جناح عوامی لیگ نے ۴ حلقوں میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۳ آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔ ان میں قیوم خان کے نامزد آزاد امیدوار بھی شامل تھے جو توقع کے عین مطابق کامیاب ہونے کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔[۲]

قیوم خان نے مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب ہونے کے بعد یہ اختیار بھی حاصل کر لیا کہ وہی کابینہ کے ارکان چننے کے مجاز ہوں گے۔ قیوم خان نے ۱۶ دسمبر ۱۹۵۱ء کو وزیر اعلیٰ کے طور پر حلف اٹھایا۔ اس وقت سرحد کے گورنر خواجہ شہاب الدین تھے۔ دوسرے وزراء میاں جعفر شاہ، جلال الدین، ملک الرحمن کیانی اور محمد ایوب خان چنے گئے تھے۔[۳]

قیوم خان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ مخالفت اور نکتہ چینی برداشت نہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس جمہوریت میں اختلاف رائے اور سیاسی بنیادوں پر مخالفت ایک فطری امر بلکہ بنیادی تقاضا ہے۔ چنانچہ قیوم خان کے دوست اور مداح بھی یہ اعتراف کرتے تھے کہ وہ جمہوریت پسند نہیں بلکہ مرد آہن ہیں۔ ویسے وہ اپنے مخالفین کو دبانے اور کچلنے کے ساتھ عوام کی فلاح

---

[۱] یوسف خٹک سے انٹرویو (بحوالہ سابقہ) "ان کے مخالف امیدواروں کو اغوا کر لیا گیا تھا۔"

[۲] ڈان کراچی۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۵۱ء [۳] ڈان کراچی ۱۷ دسمبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

و بہبود میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ اپنے زمانۂ اقتدار میں اُنھوں نے صُوبے میں تعلیم کی اشاعت سڑکوں اور ہسپتالوں کی تعمیر اور پشاور یونیورسٹی کے قیام کے لئے تمام وسائل استعمال کئے حتیٰ کہ مرکزی حکومت سے بھی بھرپور امداد حاصل کی۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں سرحد اسمبلی نے مڈل کے درجہ تک مفت تعلیم کا قانون منظور کیا "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" کے مصداق اس اصلاحی و فلاحی کام کا اعزاز قیوم خان کو ملنا چاہیئے۔ اُنھوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں سرحد میں فلاح وبہبود اور تعمیر و ترقی کے لئے کئی اور اصلاحات بھی کیں۔

خان عبدالقیوم خان ۱۹۵۳ء تک سرحد کے وزیر اعلیٰ اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر رہے۔ جب خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد گورنر جنرل غلام محمد نے امریکہ میں سفیر پاکستان محمد علی بوگرہ کو وزیر اعظم بنایا، تو قیوم خان کو مرکزی کابینہ کا رکن بنا دیا گیا۔ قیوم خان نے اس تقرر کو بڑی مجبوری کے عالم میں منظور کیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ سرحد میں انہیں جو حیثیت حاصل رہی ہے، مرکزی وزارت میں اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔[1]

---

[1] قیوم خان کو ترقی دے کر مرکزی وزارت میں شامل کر لینا دراصل گورنر جنرل غلام محمد کی صوبائی بڑے حکومتوں کے خلاف سازش تھی۔ قیوم خان بتدریج بڑے طاقتور اور مقتدر بن گئے تھے اُنھوں نے کامیابی کے ساتھ اپنے تمام مخالفوں کو سیاسی میدان سے ہٹا دیا تھا۔ اُنھوں نے "شیر سرحد" کا خطاب اختیار کر لیا تھا۔ صوبے میں ہمہ مقتدر ہونے کے بعد وہ مرکزی حکومت کے اختیار کو بھی کوئی وقعت نہ دیتے تھے۔ گورنر جنرل غلام محمد کو یہ بات پسند نہ تھی۔ علاوہ ازیں وہ خواجہ ناظم الدین کے بھی دوست سمجھے جاتے تھے جو وزارت عظمیٰ سے ہٹائے جانے کے بعد بھی پاکستان مسلم لیگ کے صدر تھے۔ گورنر جنرل کو خوف تھا کہ وہ ان کے لئے مشکلات کا باعث بنیں گے۔ اس لئے انہوں نے اس خطرے کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "سانپ بھی

بقیہ اگلے صفحہ پر

Marfat.com

قیوم خان کے مرکز میں وزیر بننے کے بعد سردار عبدالرشید سرحد کے وزیر اعلیٰ ہوئے۔ ان کا کوئی سیاسی پس منظر نہ تھا اور وہ انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے سے ایک ہی جست میں وزیرِ اعلیٰ بن گئے تھے۔ یہ انتخاب قیوم خان کا اپنا تھا۔ انھوں نے تقریباً چھ سال تک سرحد کو "پولیس سٹیٹ" بنائے رکھا تھا۔ اور سردار صاحب پولیس کے سربراہ کی حیثیت سے بڑے وفادار تھے اور ان کا ہر حکم بجا لاتے تھے، اس لئے قیوم خاں کا خیال تھا کہ وہ وزیرِ اعلیٰ کے طور پر بھی ان کے وفادار رہیں گے۔ لیکن تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ۔ قیوم خان کو اپنے یکسر غیر جمہوری اقدامات اور سیاست و آئین سے سنگدلانہ مذاق کی جو قیمت ادا کرنی پڑی، اس کا ہر پہلو عبرت کا مرقع ہے۔

سردار عبدالرشید نے اپنی کابینہ میں سابق وزارت کے چار وزیر برقرار رکھے۔ نئے وزیر مرزا شمس الحق بنے، جو قیوم خان کے خاص الخاص نائب و معتمد تھے۔

حاشیہ بقیہ صفحہ ۲۲۵

مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" کے مصداق اس کا یہ حل سوچا گیا کہ قیوم خان کو ترقی دے کر مرکزی کابینہ میں شامل کر لیا جائے۔ قیوم خان اس عیارانہ تدبیر کو بھانپ گئے چنانچہ انہوں نے یہ پیشکش مسترد کر دی لیکن جب انہیں بھی برطرف کرنے کی دھمکی دی گئی تو انھوں نے بڑی مجبوری کے عالم میں مرکز میں وزارت قبول کر لی کیونکہ خواجہ ناظم الدین کا حشر ان کے سامنے تھا۔ اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ برطرفی کی صورت میں مرکز انہیں بے ضابطگیوں کے الزام میں محاسبے کے کٹہرے میں کھڑا کر سکتا ہے چنانچہ "شیر سرحد" بھیگی بلی بننے پر مجبور ہو گیا۔ بہرحال ان کے خدشات درست ثابت ہوئے اور ۱۹۵۴ء جب دستور ساز اسمبلی توڑی گئی تو قیوم خان بھی ایوانِ وزارت سے باہر نکل آئے۔ اگر وہ مرکز میں وزیر نہ بنتے تو وہ جب تک چاہتے سرحد کے وزیرِ اعلیٰ رہ سکتے تھے مرکزی وزارت سے علیحدگی کے بعد وہ لاہور میں وکالت کرنے لگے کیونکہ اب وہ پشاور واپس جانے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ (مولف کا خان عبدالقیوم سے انٹرویو)

Marfat.com

مرزا صاحب کے وزیر بننے پر ملک بھر میں حیرت کا اظہار کیا گیا۔ لیکن جہاں اقتدار کو عوام کی طرف سے امانت سمجھنے کے بجائے ذاتی و شخصی استحقاق بنا لیا جائے، وہاں ناقابلِ برداشت تو درکنار ناقابلِ تصور باتیں بھی ممکن ہو جاتی ہیں اور کسی خوف و اضطراب کے بغیر روا رکھی جاتی ہیں۔

پاکستان میں اس دوران میں یہ روایت قائم ہو چکی تھی کہ وزیر اعلیٰ ہی صوبائی مسلم لیگ کا صدر بھی ہوگا، خواہ وہ مسلم لیگیوں کو پسند اور قبول ہو یا نہ ہو۔ قیوم خان کے مرکز میں وزیر بنتے ہی سرحد مسلم لیگ کی صدارت کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ جب تک قیوم خان سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے، ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا تھا اور وہ "شیرِ سرحد" تھے لیکن جونہی وہ سرحد کی وزارتِ اعلیٰ سے رخصت ہوئے، یہ خیال باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر گیا کہ اب انہیں سرحد مسلم لیگ کا بھی صدر نہیں رہنا چاہیئے۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں سرحد مسلم لیگ نے ایک قرارداد منظور کر کے قیوم خان سے مطالبہ کیا کہ وہ سردار عبدالرشید کے حق میں صوبائی مسلم لیگ کی صدارت سے دستکش ہو جائیں۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ قیوم خان اب "باہر والے" ہیں۔ اس لئے وہ صوبائی صدر کے فرائض بہ احسن طریق سرانجام نہیں دے سکتے۔[۱] قیوم خان مستعفی ہو گئے اور وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید صوبائی مسلم لیگ کے صدر ہو گئے یہ لاجواب انتخاب "پسلی پھڑک اٹھی نگہ انتخاب کی" جس جماعت نے قائد اعظم کے تحت جمہوری اور آئینی ذرائع سے انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف سیاسی جنگ میں فقید المثال کامیابی حاصل کی تھی صرف چھ سال بعد سرحد میں اس نے صوبائی سربراہ کے طور پر ایک انسپکٹر جنرل پولیس کو قبول کر لیا۔ ویسے تو مسلم لیگ کے اکثر لیڈروں کا اندازِ فکر اور ذہنی سطح کسی لحاظ سے بھی پولیس افسروں سے مختلف نہ تھی

---

[۱] ڈان کراچی ۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۳ء

Marfat.com

مشرقی پاکستان

تقسیم کے بعد مولانا محمد اکرم خان کو مشرقی پاکستان مسلم لیگ کا صوبائی آرگنائزر مقرر کیا گیا۔ ان کے تحت ہر ضلع میں آرگنائزر مقرر کیے گئے۔ پروگرام یہ تھا کہ جب رکنیت سازی کی مہم شروع ہو گی تو ہر ضلعی آرگنائزر اور دوسرے سرکردہ مسلم لیگی لیڈروں کو رکنیت کے فارم دیئے جائیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد کو پرائمری ارکان بنایا جا سکے۔ لیکن تمام دوسرے صوبوں کے آرگنائزروں کی طرح انہوں نے بھی اپنی اس حیثیت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور رکنیت سازی کی مہم اپنے پیروکاروں تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔ مقصد یہ تھا کہ واحد حکمران جماعت پر قبضہ کر کے سیاست پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھا جائے۔ مخالف گروہوں کو اگرچہ وہ بھی پُرانے مسلم لیگی تھے اور ان میں بہت سے ممتاز سیاسی ورکر بھی تھے۔ رکنیت کے فارم دینے میں لیت و لعل سے کام لیا گیا اور بہانہ یہ بنایا گیا کہ کاغذ کی کمیابی کے باعث زیادہ تعداد میں رکنیت کے فارم طبع نہیں کرائے جا سکے اور جو فارم دستیاب تھے وہ پہلے ہی تقسیم کیے جا چکے ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ وہ تمام فارم حکمران ٹولے کے ساتھیوں میں تقسیم کیے گئے تھے اور جب مخالف گروپ کی باری آئی تو فارم اچانک ختم ہو گئے۔ مخالف گروپ[2] کا خیال یہ تھا کہ اس طرح مسلم لیگ کی رکنیت کو صرف اربابِ حکومت کے پیروکاروں تک محدود رکھنے کی سازش کی گئی ہے۔ اس مخالف گروپ کے رہنما مولانا بھاشانی

---

[1] مصنف کا نورالامین سے ۱۳ نومبر ۱۹۷۱ء کو ذاتی انٹرویو۔ موصوف ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۴ء مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ اور ۱۹۵۰ء - ۵۴ء مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے صدر رہے۔ ۱۹۷۲ء میں پاکستان کے نائب صدر بنے۔

[2] یہ گروپ ترقی پسند گروپ کہلاتا تھا۔ یہ گروپ تقسیم سے پہلے بھی موجود تھا بنگال میں اس کے لیڈر سہروردی، و بھاشانی اور پنجاب میں میاں افتخار الدین تھے۔ وہ ترقی پسندانہ نظریات اور

باقی اگلے صفحہ پر

Marfat.com

اور عطاء الرحمٰن تھے۔[1] جہاں تک کاغذ کی کمیابی کے عذر کا تعلق ہے یہ صریحاً بہانہ تھا۔ اگر ارادہ نیک ہوتا تو کاغذ کی کمیابی کے باوجود آسانی کے ساتھ متبادل انتظام کیا جا سکتا تھا۔ اس مسئلے کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ کاغذ کی کمی کی شکایت مشرقی پاکستان کے سوا کسی بھی دوسرے صوبے میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وجہ خواہ کچھ ہو، مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کے اتحاد اور سالمیت پر یہی پہلی ضرب تھی۔ اس سے مسلم لیگ کے ترقی پسند گروپ کو جماعت سے علیحدہ ہونے اور اپنی علیحدہ پارٹی بنانے کا موقع مل گیا۔

ترقی پسند گروپ کو جب رکنیت کے فارم نہ دیئے گئے تو مسلم لیگ کی پالیسیوں سے مایوس ہو کر اس کے لیڈروں نے اپریل ۱۹۴۸ء میں اپنے ہم خیال لیگی کارکنوں کا اجلاس طلب کیا۔ یہ اجلاس تانگیال میں مولانا بھاشانی کی صدارت میں منعقد ہوا اور اس میں کثیر تعداد میں لیگی کارکن شریک ہوئے اجلاس میں رکنیت کے فارم فراہم نہ کرنے پر زبردست احتجاج کیا گیا اور ایک اور اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اجلاس میں صوبائی حکومت پر عدم اعتماد کی قرارداد بھی منظور کی گئی۔[2] اگلا اجلاس جون ۱۹۴۸ء میں نرائن گنج میں ہونے والا تھا لیکن حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کے تحت پابندی عائد کر دی۔ اس کے بعد ایک نجی اجلاس ہوا جس میں عطاء الرحمٰن اور خیرات حسین پر مشتمل

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۳۰ اپریل ۱۹۴۸ء

[2] ایضاً

حاشیہ بقیہ صفحہ ۲۲۸

سوشلسٹ نظام کے علمبردار تھے۔ دوسرا گروپ خالص اسلامی نظام کا مدعی تھا۔ اس کے لیڈر خواجہ ناظم الدین تھے جو مشرقی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔

Marfat.com

ایک وفد کراچی بھیجنے کا فیصلہ ہوا تاکہ وہ چودھری خلیق الزمان سے مل کر انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرے۔ اجلاس پر پابندی عائد ہونے کے خلاف زبردست غم و غصہ ظاہر کیا گیا کیونکہ اس سے حکمران ٹولے کے عزائم بے نقاب ہو گئے تھے۔

وفد کی چودھری خلیق الزمان سے ملاقات تو ہو گئی لیکن اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ چودھری خلیق الزمان مصلحت پسند اور کمزور آدمی تھے۔ پھر وہ صوبائی آرگنائزروں کی پوری سرپرستی کر رہے تھے تاکہ وہ اس کے صلے میں پاکستان مسلم لیگ کا صدر بننے کے معاملے میں ان کی حمایت امداد حاصل کر سکیں۔ اس امر میں رتی بھر بھی شک و شبہ نہیں کہ چودھری خلیق الزمان کو صوبائی آرگنائزروں کے غیر جمہوری ہتھکنڈوں کا پورا علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے مقرر کردہ صوبائی آرگنائزر متعلقہ صوبائی حکومتوں کی آشیرباد کے ساتھ کیا گل کھلا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ نہ صرف ان کی حرکات کی پردہ پوشی کرتے تھے بلکہ حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔

چودھری خلیق الزمان سے ملاقات کے بعد مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے ترقی پسند گروپ نے اپنے آپ کو اس پارٹی سے باہر پایا جس کے لئے انہوں نے اتنی قربانیاں دی تھیں اور جس کے پرچم تلے انہوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف جد و جہد کر کے قیامِ پاکستان کے سلسلے میں گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس لئے ان کے لئے اپنی نئی پارٹی بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ چنانچہ سب مایوس عناصر گل باغ ڈھاکہ میں جمع ہوئے اور انھوں نے ۱۹۴۹ء میں عوامی مسلم لیگ کے نام سے اپنی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ مولانا بھاشانی

ٹھ شمس الدین سے ذاتی انٹرویو۔ ۵-۷-۴۷۔ ۱۹۴۴ء تک ڈھاکہ مسلم لیگ کے سیکریٹری اور آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن تھے۔ انہیں ۱۹۴۸ء میں گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ وہ پاکستان جمہوری پارٹی کے ایک سرگرم رکن اور نورالامین کے پرائیوٹ سیکریٹری ہیں۔

Marfat.com

کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ عوامی مسلم لیگ نے دراصل مسلم لیگی قیادت کی زیادتیوں اور بے ضابطگیوں کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اس نئی پارٹی کے لیڈروں کا دعویٰ یہ تھا کہ ان کی جماعت ہی اصلی مسلم لیگ ہے کیونکہ یہ عوام کی نمائندگی کرتی ہے۔ پارٹی کا نام "عوامی مسلم لیگ" بھی اسی دعوے کی عکاسی کرتا تھا۔ مزید برآں نئی پارٹی کے نام میں "مسلم لیگ" کے الفاظ تاریخی اہمیت برقرار رکھنے کے لئے اور عوام کے لئے جذباتی کشش پیدا کرنے کے لئے رکھے گئے تھے۔

۱۹۴۸ء میں لسانی تنازعہ شروع ہو گیا جس نے بتدریج ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ مسلم لیگ کے ترقی پسند گروپ نے اس کی حمایت کی۔ حکمران گروہ اس کی مخالفت پر ڈٹ گیا۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے صورت حال کا پورا فائدہ اُٹھایا اور حکومت کے خلاف مظاہرے بھی کرائے۔ صوبائی مسلم لیگ نے اس تحریک کے بارے میں نیم دلانہ رویہ اختیار کیا جس سے اس کی مقبولیت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ مسلم لیگی حکومت نے امن وامان برقرار رکھنے کے لئے اس تحریک کو سختی سے دبانے کی کوشش کی۔ حکومت کی بے تدبیری اور نا اہلی کے سبب لسانی تحریک عوامی تحریک بن گئی اور تحریک کے لیڈروں نے بنگالی زبان کو مشرقی پاکستان کا قومی مسئلہ بنا دیا۔ قائدِ اعظم بنفسِ نفیس ڈھاکہ تشریف لے گئے اور ڈھاکہ میں ایک عام جلسے سے خطاب کیا۔ اُنھوں نے اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان کے عوام اپنے نمائندوں کے ذریعہ صوبائی ضروریات کے لئے جس زبان کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں لیکن قومی زبان ایک ہو گی اور وہ صرف اُردو ہو گی۔[۱] قیام پاکستان کے

۱؎ Speeches and Writings of Quaid-e-Azam

جمیل الدین احمد، شیخ محمد اشرف لاہور، (۱۹۶۴ء) جلد دوم۔ صفحہ ۴۹۰

Marfat.com

بعد یہ قائدِ اعظم کا مشرقی پاکستان کا پہلا اور آخری دورہ تھا۔ ان کے اس اعلان اور وضاحت سے بظاہر حالات پرسکون ہو گئے لیکن یہ سکون عارضی اور سطحی تھا۔ بہرحال یہ پہلا موقع تھا کہ زبان کے مسئلے پر عوام میں مسلم لیگ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے اور مسلم لیگ کے مقابلے میں ایک نئی جماعت کے قیام کے لئے فضا ہموار ہوئی۔ اس خلا کو عوامی مسلم لیگ نے پُر کیا۔ بعد میں اس کے دروازے غیر مسلموں پر بھی کھول دیئے گئے اور اس جماعت کا نام عوامی لیگ رکھ دیا گیا۔ غیر مسلموں کی شمولیت سے عوامی لیگ کو بہت تقویت ملی کیونکہ اوّل تو غیر مسلم مشرقی پاکستان کی آبادی کا تقریباً بیس فیصد تھے۔ دوئم مشرقی پاکستان کے کاروبار اور معاشیات پر ان کا قبضہ تھا اس لئے وہ بے حد اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ انہوں نے نہ صرف عوامی لیگ کو سیاسی قوت مہیا کی بلکہ فراخدلی سے چندے بھی دیئے۔

مسلم لیگ کی تنظیم نو کے صوبائی آرگنائزر مولانا اکرم خان مشرقی پاکستان صوبائی مسلم لیگ کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ وہ اس عہدہ پر ۱۹۵۰ء تک فائز رہے۔ اس پورے عرصے میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو موثر اور فعال تنظیم بنانے کے لیے کوئی بھی اقدام نہ کیا گیا۔ سیاسی جماعت کی حیثیت سے مسلم لیگ سے یہ توقع کی جاتی تھی اور یہ اس کا فرض بھی تھا کہ وہ حکومت اور عوام کے مابین رابطہ بنتی لیکن عام لوگوں سے کوئی تعلق ورابطہ نہ رکھنے کے باعث مسلم لیگ اپنا بنیادی فریضہ ادا کرنے میں ناکام ہو گئی۔ ۱۹۴۸ء کے لسانی تنازعہ کے دوران میں بھی مسلم لیگ نے رائے عامہ کو ڈھالنے کی کوئی سعی نہ کی اور اقتدار کے نشے میں مست رہی۔ اس نے کسی طرح بھی عوام کی حالت بہتر بنانے یا ان میں دلچسپی کے اظہار کی ضرورت محسوس نہ

Marfat.com

کی اس بات کے شواہد ناپید ہیں کہ اس عرصہ میں مسلم لیگ مشرقی پاکستان کی ایک سرگرم سیاسی پارٹی تھی یا اس کے پاس عوام کے لئے کوئی باعث کشش پروگرام تھا۔ یہ حالات بد دل عناصر کے لئے مسلم لیگ اور حکومت کے خلاف کام کرنے کا زریں موقع ثابت ہوئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلم لیگی قیادت نے تن آسانی کی راہ اختیار کر رکھی تھی اور اس نے مخالفانہ پروپیگنڈے کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء کے ایجی ٹیشن اور مظاہرے بھی اسے خوابِ غفلت سے بیدار نہ کر سکے۔

بے تدبیر حکومتوں کے مانند مسلم لیگ کے پاس بھی ایک ہی علاج تھا اور وہ تھا عام گرفتاریاں۔ لیکن جوں جوں دوا کی مرض بڑھتا گیا۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان کی ہندو آبادی تھی جس نے کبھی قیام پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلم لیگ کے خلاف نفرت پھیلانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیونکہ ہندوؤں کی نظر میں مسلم لیگ اور پاکستان ہم معنی الفاظ تھے[1]۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی حکومت اس صورت حال سے یکسر بے خبر تھی[2]۔

۱۹۵۰ء میں چودھری خلیق الزمان کے مستعفی ہو جانے کے بعد لیاقت علیخان پاکستان مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ اس طرح حکومت اور پارٹی کی قیادت یکجا ہو گئی۔ وزیر اعظم کی اس مثال کو تمام صوبائی حکومتوں کے سربراہوں نے

---

[1] شمس الدین سے انٹرویو۔ بحوالہ سابقہ

[2] نور الامین سے انٹرویو۔ (بحوالہ سابقہ) نور الامین نے اس کا اعتراف مصنف سے کیا۔

Marfat.com

جزوِ ایمان سمجھ کر سینے سے لگایا اور فوراً مسلم لیگ پر قبضہ کر لیا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں قائدِ اعظم کے انتقال پر خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنائے گئے تو ان کی جگہ نورالامین مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ لیاقت علی خان کے صدر پاکستان مسلم لیگ منتخب ہونے کے بعد وہ بھی مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے صدر بن گئے اور ۱۹۵۴ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست فاش تک وزیرِ اعلیٰ کے ساتھ صدر مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے عہدوں پر بیک وقت فائز رہے۔

مشرقی پاکستان میں تین مطالبات کو تخلیقِ پاکستان کے وقت ہی سے بڑی مقبولیت حاصل رہی۔ ایک یہ کہ بنگلہ کو قومی زبان بنایا جائے۔ دوسرا یہ کہ زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری دی جائے اور تیسرا یہ کہ زمینداری نظام ختم کر دیا جائے۔ موخر الذکر دو مطالبات صرف مشرقی پاکستان میں ہی زبان زدِ خاص و عام نہیں تھے۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ان کی صدائے بازگشت سنی جاتی تھی۔ پہلا مطالبہ صرف مشرقی پاکستان تک محدود و مخصوص تھا۔ اس زمانے میں دوسرے صوبوں یعنی پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کی طرف سے مقامی زبانوں کو قومی زبانیں قرار دینے کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ تمام صوبائی مسلم لیگیں باقی دو مطالبات یعنی جاگیرداری کے خاتمے اور اور صوبائی خود مختاری کے لئے آئے دن قرار دادیں منظور کرتی رہتی تھیں۔ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کی نااہلی اور ناسمجھی کے سبب ان دونوں مطالبوں کا بروقت علاج نہ کیا گیا۔ حتیٰ کہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا اور بالآخر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنا۔

مشرقی پاکستان مسلم لیگ کی ایک کانفرنس اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔

Marfat.com

جس میں ۳۰۰ مندوبین نے شرکت کی۔ اس میں زمینداری نظام کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا۔ اور یہ انتباہ بھی کیا گیا کہ اگر حکومت نے اس مطالبے کو تسلیم نہ کیا تو مسلم لیگ لگان نہ دینے کی مہم شروع کر دے گی۔ اس مطالبے میں زمین کو کاشتکاروں میں مساوی طور پر تقسیم کر دینا بھی شامل تھا۔ ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ وزیروں کو اپنی تنخواہوں میں کمی کر کے صرف ایک ہزار روپے ماہانہ وصول کرنے چاہئیں[۱]

مشرقی پاکستان کے ان تین عوامی مطالبات میں سے صرف ایک پورا کیا گیا۔ یعنی زمینداری نظام کا خاتمہ۔ طویل انتظار کے بعد یہ زرعی اصلاحات ۱۹۵۱ء میں نافذ کی گئیں جب مشرقی پاکستان اسمبلی نے محصول و مزارعت ایکٹ منظور کیا جس میں زمینداری نظام کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا تھا[۲] مشرقی پاکستان کی ان زرعی اصلاحات میں ملکیت اراضی کی زیادہ سے زیادہ حد ۳۳ ایکڑ مقرر کی گئی[۳] مشرقی پاکستان میں زرعی اراضی کے بیشتر مالکان ہندو تھے۔ ان کے قبضہ و تصرف میں ۷۵ فیصد رقبہ تھا[۴] اس لیے زرعی اصلاحات سے زیادہ تر یہی طبقہ متاثر ہوا۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر ملک کے طول و عرض میں وسیع اور شدید بحث و نزاع کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چٹاگانگ مسلم لیگ نے اس رپورٹ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بعض ایسے مطالبات بھی پیش کیے جن کی بعد میں خواجہ

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۳۰ اپریل ۱۹۴۸ء

[۲] پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۴ ستمبر ۱۹۵۱ء

[۳] From Memory از ملک فیروز خان نون (مطبوعہ فیروز سنز) لاہور صفحہ ۲۲۵

[۴] ایضاً

Marfat.com

ناظم الدین نے تردید کی۔ مطالبات یہ تھے۔ مرکز میں صرف ایک ایوان ہونا چاہیئے اور اس میں نمائندگی آبادی کی اساس پہ دی جائے۔ صدر مملکت کا انتخاب ملک کی بالغ آبادی کرے اور وفاقی عدالت کو مملکت کے صدر کے کنٹرول سے آزاد ہونا چاہیئے۔ چٹاگانگ مسلم لیگ نے یہ سفارش بھی کی کہ دستور ساز اسمبلی کو کنفیڈریشن قائم کرنی چاہیئے اور تمام ٹیکس اور محصول اکائیوں یعنی صوبوں کو اپنے طور پہ وصول کرنے چاہئیں۔ اس طرح افسروں کے تقرر، برطرفی اور ان پر کنٹرول کا اختیار بھی اکائیوں کو حاصل ہونا چاہیئے۔[1] ان مطالبات اور سفارشات کو مغربی پاکستان میں پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا گیا۔ خواجہ ناظم الدین نے بھی ان پر سخت جرح و تنقید کی اور یہ واضح کیا کہ چٹاگانگ مسلم لیگ کے یہ نظریات مشرقی پاکستانی عوام کے خیالات کے عکاس و ترجمان نہیں ہیں۔[2] خواجہ صاحب کے اس قطعی نوعیّت کے بیان سے عام لوگ وقتی طور پہ مطمئن ہوگئے اور کسی نے بھی ان مطالبات کی اہمیّت سمجھنے کی نہ ضرورت محسوس کی اور نہ کوشش کی۔ بہرحال یہ مطالبات اس بات کی ایک واضح علامت تھے کہ مشرقی پاکستان میں کیا اندازِ فکر اُبھر رہا ہے۔ مسلم لیگ آنے والے طوفان کو بھانپ نہ سکی۔ آہستہ آہستہ یہی خیالات ایک طوفانی تحریک کی شکل اختیار کر گئے جس کے سامنے نہ صرف مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی بلکہ اس سے پاکستانی قومیت کے نظریئے کو بھی ناقابلِ تلافی

---

[1] ڈان کراچی ۱۱ر جنوری ۱۹۵۳ء

[2] ڈان کراچی۔ ۱۳ جنوری ۱۹۵۳ء

Marfat.com

نقصان پہنچا اور پھر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان، پاکستان سے الگ ہو گیا۔

مشرقی پاکستان اسمبلی ۱۹۴۶ء کے انتخابات پر مبنی تھی اور تقسیم کے بعد بنگال اور آسام کے ضلع سلہٹ کے صرف ان علاقوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی جو پاکستان کا حصہ بنے۔ نئے عام انتخابات ۱۹۵۴ء میں ہونے والے تھے۔ چنانچہ انتخابات کے قریب آنے سے سیاسی سرگرمیوں میں وسعت اور شدت پیدا ہو گئی۔ مسلم لیگ کی مخالف سیاسی پارٹیوں نے ایک متحدہ محاذ بنا لیا جس کے قائدین سہروردی، فضل الحق اور بھاشانی تھے۔

باشعور نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی مقبولیت کا سورج غروب ہو رہا ہے۔ اس زوال کے بنیادی اسباب یہ تھے۔ یہ جماعت عوام کی حالت بہتر بنانے اور ان کی مشکلات کا مداوا کرنے میں بری طرح ناکام رہی تھی۔ اس نے مشرقی پاکستان کے لیے کوئی ٹھوس اقتصادی پروگرام مرتب نہ کیا۔ اس کے لیڈروں کا عام رویہ تساہل پسندانہ غیر جمہوری اور عام سیاسی سوجھ بوجھ سے عاری تھا۔ اس کے سیاسی رہنما اور کارکن ایک دوسرے کے خلاف سازشوں اور گروہی جھگڑوں میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ مغربی پاکستان میں بھی مسلم لیگ مقبول اور ہردلعزیز نہ رہی تھی لیکن کسی اور مقبول عام مخالف پارٹی کے قائم نہ ہونے کے باعث اس نے عوامی تائید کا بھرم قائم رکھا۔ علاوہ ازیں مغربی پاکستان میں جاگیرداروں اور زمینداروں کی سیاسی بالادستی عروج پر تھی اور ان میں سے ہر ایک کی تحویل میں ہزارہا ووٹر تھے۔ اکثر و بیشتر زمیندار مسلم لیگ میں شامل تھے۔ اس لیے ان کی وجہ سے تمام صوبوں کے انتخابات میں مسلم لیگ کامیاب ہو گئی۔ لیکن اس سے مسلم لیگ کے بارے میں عام تاثر گو کہ یہ زمینداروں کی جماعت ہے" بڑی تقویت

Marfat.com

ملی جس کا ردِ عمل عوام میں بڑا شدید ہوا۔ مشرقی پاکستان میں صورتِ حالات بکسر مختلف تھی۔ اوّل تو وہاں بارسوخ جاگیردار اور زمینداروں کا وجود ہی نہ تھا۔ دوسرے وہاں مسلم لیگ کے مقابلے کے لئے کئی سیاسی پارٹیاں اُبھر آئی تھیں اور وہ پراپیگنڈے کے موثر ہتھیاروں سے لیس ہو کر رائے دہندگان کے سامنے مسلم لیگ سے زیادہ دلکش پروگرام پیش کر رہی تھیں۔ چنانچہ انتخابی مہم کے دوران میں وہاں مسلم لیگ کے خلاف بڑی تعداد میں مظاہرے کئے گئے اور جلوس نکالے گئے۔ اس سلسلے میں چاندپور خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہاں اس وقت مسلم لیگ کے خلاف مظاہرے کئے گئے جب وزیرِ اعلیٰ اور صدر صوبائی مسلم لیگ اپنی انتخابی مہم کے سلسلہ میں وہاں موجود تھے[1]۔

نورالامین نے بھی انتخابی مہم کے دوران میں سارے صوبے کا دورہ کیا۔ اُنھوں نے عوام کو آنے والے انتخابات کی اہمیت سے آگاہ کیا اور مسلم لیگ کے منشور کی وضاحت کی اور لوگوں پر بار بار زور دیا کہ "اگر وہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتے ہیں تو پھر انھیں لازماً مسلم لیگ کے حق میں ووٹ ڈالنے چاہئیں[2]۔" ان کو قطعی طور پر اس امر کا احساس نہ تھا کہ اسلام کے خالی نعروں سے زیادہ دیر تک عوام کو بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ اگر وہ اسلام کو صحیح معنوں میں اس قدر عزیز رکھتے تھے تو اُنھوں نے اپنے دورِ حکومت میں اسلامی نظام رائج کرنے کی کوششیں کیوں نہ کی۔ وہ اس بات کا بار بار اعادہ کرتے تھے کہ آنے والے انتخابات میں پاکستان کی نوعیت،

---

[1] ڈان کراچی ۱۲ اپریل ۱۹۵۳ء
[2] ڈان کراچی ۵ دسمبر ۱۹۵۳ء

کردار اور مستقبل کا فیصلہ ہو جائے گا[1]

دسمبر ۱۹۵۳ء کے وسط میں مشرقی پاکستان صوبائی مسلم لیگ کی کنونشن ہوئی جس میں کئی ممتاز رہنماؤں مولوی تمیز الدین، سردار عبدالرب نشتر، مولانا احتشام الحق تھانوی، غیاث الدین پٹھان اور فضل الرحمن نے خطاب کیا۔ کنونشن میں انتخابی پروگرام مرتب کیا گیا اور عوام کو یقین دلایا گیا کہ صرف مسلم لیگ ہی قوم کی توقعات پوری کر سکتی ہے[2] (جیسے گذشتہ چھ سال میں کی تھیں۔)

دوسری طرف متحدہ محاذ کے لیڈر ہر قسم کے نعرے لگانے میں دن رات مصروف تھے۔ ان کی صفوں میں پیشہ ورانہ ایجی ٹیٹروں کی بھی کمی نہ تھی، اور انہیں انتہائی کامیابی سے مسلم لیگ کے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ کئی مقامات پر مسلم لیگ کے دفاتر پر بھی حملے کئے گئے اور انتخابات سے عین پہلے ان کا ساز و سامان تباہ اور نذر آتش کر دیا گیا یا لوٹ لیا گیا۔[3] واقعات آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھے لیکن مسلم لیگ کی غیر مقبول حکومت بے بس تھی۔

انتخابات سے چند دن پہلے مس فاطمہ جناح سے مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کی درخواست کی گئی۔ مسلم لیگ کے لیڈران کے اثر اور مقبولیت کو مسلم لیگ کے حق میں بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے مشرقی پاکستان کے دورے میں کئی مقامات پر عام جلسوں سے خطاب کیا۔ عوام نے ہر جگہ ان کا پرجوش استقبال کیا اور ان کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے۔ چنانچہ وہ یہ تاثر متحدہ محاذ نے ۲۲۲ نشستیں حاصل کیں۔ مولوی فضل الحق کو متحدہ محاذ پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا اور گورنر نے انہیں وزارت بنانے کی دعوت دی۔ مولوی

---

[1] ڈان کراچی ۹ دسمبر ۱۹۵۳ء [2] ایضاً ۱۳ دسمبر ۱۹۵۳ء
[3] ایضاً ۲۴ فروری ۱۹۵۳ء

Marfat.com

لے کر واپس آئیں کہ مسلم لیگ کو انتخابات میں شاندار فتح حاصل ہوگی[1] اور مسلم لیگ کی قیادت بھی مادرِ ملّت کی مقبولیت کو اپنی جماعت کی مقبولیت سمجھ بیٹھی۔ یہ امید محض ایک سراب ثابت ہوئی۔

مشرقی پاکستان اسمبلی کی ۳۰۹ نشستیں تھیں۔ ان کے لئے ۱۲۳۵ امیدوار کھڑے ہوئے۔ ان میں ۱۰۱۳ مسلمان تھے اور ان میں ۳۲ خواتین تھیں۔ باقی اُمیدوار ہندو، بودھ اور اچھوت تھے۔ ان انتخابات میں جن اہم سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا، ان کے نام یہ تھے۔ مسلم لیگ، متحدہ محاذ، گنا تنتری دل، گنا سمتی، شیڈول کاسٹ فیڈریشن، انقلابی سوشلسٹ پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور خلافت ربانی پارٹی۔[2]

انتخابات کے نتائج سے معلوم ہوا کہ مسلم لیگ شکستِ فاش سے دوچار ہوئی ہے۔ ۳۰۹ میں سے صرف ۹ حلقوں میں اس کے اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ اسمبلی کے قواعد کے مطابق باضابطہ گروپ کم از کم دس ارکان پر مشتمل ہونا چاہیے تھا۔[3] چنانچہ صرف ۹ ارکان کی وجہ سے اسمبلی میں مسلم لیگ باقاعدہ گروپ بھی نہیں بنا سکتی تھی بعد میں مسلم لیگی لیڈر ایک آزاد منتخب رکن اسمبلی فضل القادر چودھری[4] کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح مسلم لیگ کو اسمبلی میں اپوزیشن گروپ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔[5]

---

[1] ایضاً ۸ر مارچ ۱۹۵۴ء

[2] ایضاً ۹ر مارچ ۱۹۵۴ء

[3] پاکستان ٹائمز لاہور۔ ۲۷ر مارچ ۱۹۵۴ء

[4] فضل القادر چودھری ایوب خان کے دور میں پہلے وزیر اور پھر قومی اسمبلی کے سپیکر۔

[5] مشرقی پاکستان میں سیاست کے تفصیلی مطالعے کے لئے اسی مصنف کی کتاب سقوط مشرقی پاکستان دیکھیں۔

Marfat.com

صاحب نے اپنی حکومت کے پروگرام کے طور پر حسبِ ذیل چار نکات کو اہم قرار دیا :-

۱۔ بنگلہ کو ایک قومی زبان بنانا ۔

۲۔ تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی ۔

۳۔ پٹ سن کے کاشتکاروں کے لیے اقتصادی قیمت کی ضمانت

۴۔ مشرقی پاکستان اور بھارت کے درمیان ویزا کی پابندی کا خاتمہ [۱]

متحدہ محاذ کی انتخابی کامیابی جس قدر محیر العقول تھی، اس کی صفوں میں انتشار وخلفشار کے آثار بھی اسی قدر جلد نظر آنے لگے ۔ وزارت بنانے کی دعوت ملنے پر فضل الحق نے اپنی کابینہ کے لیے صرف دو نام گورنر کو پیش کیے ۔ مولانا بھاشانی اور متحدہ محاذ کے دوسرے لیڈروں نے اس پر سخت جرح و تنقید کی کہ وزیرِ اعلیٰ نے اقربا نوازی کا مظاہرہ کیا ہے اور عوامی لیگ اور گنا تنتری دل کے نمائندے اس وقت تک کابینہ میں شامل نہیں ہوں گے جب تک فضل الحق صرف دو وزیروں کے نام تجویز کرنے کے سلسلہ میں وضاحت نہیں کریں گے [۲]

ابھی نئی کابینہ نے صحیح معنوں میں کام بھی شروع نہیں کیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں بنگالی غیر بنگالی کے سوال پر فسادات شروع ہو گئے ۔ متحدہ محاذ والوں نے اپنی انتخابی مہم میں صرف مرکزی حکومت اور مغربی پاکستان کو ہی ہدفِ ملامت بنانے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے بنگالی عصبیت

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء (پروگرام کے تیور ملاحظہ فرمایئے۔ اس پروگرام کی تشکیل میں کن عناصر کا ہاتھ تھا وضاحت کی ضرورت نہیں)

[۲] ڈان کراچی ۴ اپریل ۱۹۵۴ء

Marfat.com

کو بھی بڑی شدت سے اُبھارا تھا ۔چنانچہ متحدہ محاذ کی کابینہ بننے کے ساتھ ہی غیر بنگالی آبادی کے خلاف انتخابی مہم کے دوران میں پھیلائی گئی نفرت نے کھلے انتقام کی شکل اختیار کرلی۔ سب سے زیادہ خوفناک فساد کرنافلی پیپر ملز میں ہوا جہاں سرکاری اطلاعات کے مطابق ۱۹ افراد ہلاک ہوئے تھے ۔ ان فسادات میں بہاری ملازمین کو خاص طور پر ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ مل کا منیجر جو اپنے کام میں انتہائی ماہر تھا، غیر بنگالی ہونے کی پاداش میں زندہ جلا دیا گیا۔ جب مل کے اندر یہ فسادات ہو رہے تھے اور معصوم لوگوں کا خون بہہ رہا تھا تو مشرقی پاکستان کابینہ کے ایک وزیر شیخ مجیب الرحمٰن مل کے باہر جلسۂ عام سے خطاب کر رہے تھے[۱]۔ ان کی یہی تربیت بعد میں ان کے کام آئی اور وہ لاکھوں لوگوں کی ہڈیوں پر نام نہاد بنگلہ دیش بنانے میں کامیاب ہوگئے ۔ بپھرے ہوئے ہجوم نے کئی مرتبہ ڈھاکہ جیل پر بھی حملہ بولا ۔ بالآخر جب صورت حالات قابو سے باہر ہوگئی اور امن وامان برقرار رکھنا ممکن نہ رہا تو مرکزی حکومت اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس کا علاج صرف گورنر راج ہے ۔ چنانچہ مئی ۱۹۵۴ء کے اواخر میں فضل الحق کابینہ کو برطرف کر دیا گیا اور گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ منتخب اسمبلی کے اجلاس کی ابھی نوبت ہی نہ آئی تھی ۔

یہ صورت احوال اس لئے پیدا ہوئی کہ متحدہ محاذ نے مختلف قسم کی سیاسی جماعتوں کے وقتی اتحاد سے جنم لیا تھا اور اس اتحاد کی بنیاد بغض معاویہ یعنی مسلم لیگ سے دشمنی تھی ورنہ اس میں مختلف النوع عناصر جمع تھے جن کے

---

[۱] مصنف کا شمس الدین سے ذاتی انٹرویو (بحوالہ سابقہ)

سامنے کوئی مشترکہ نصب العین نہ تھا اور نہ اندازِ فکر ہی یکساں تھا مسلم لیگ کی شکست کے ساتھ ہی متحدہ محاذ کا مقصد پورا ہو گیا۔ ان کا اتحاد بھی انتشار کا شکار ہو گیا اور وزراء من مانی کرنے لگے بت یہاں تک پہنچی کہ متحدہ محاذ کی جماعتیں، رقابت کے سبب ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں کرنے لگیں۔ علاوہ ازیں متحدہ محاذ عوام کو اس قدر بلند امیدیں دلا کر تختِ حکومت تک پہنچا تھا کہ ان کے پورا ہونے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اس سے عوام میں بے چینی پھیلنے لگی جس نے بالآخر ہنگاموں کی صورت اختیار کر لی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عوام کو ان ہنگاموں کی تربیت بھی متحدہ محاذ ہی نے دی تھی اور اسی محاذ کے سبب متحدہ محاذ حکومت سے محروم ہو گیا۔

مشرقی پاکستان کی طرف سے بنگلہ کو قومی زبان بنانے کا مطالبہ ۲۰ اپریل ۱۹۵۴ء کو پورا ہو گیا تھا جب دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے اردو اور بنگلہ دونوں کو سرکاری زبانیں تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا[1] اور دستور ساز اسمبلی نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں "جمہوریہ کی زبانوں" کے زیرِ عنوان آٹھ دفعات پر مشتمل ایک نئے باب کا اضافہ کیا جس کے اہم پہلو حسبِ ذیل تھے۔

۱۔ جمہوریہ کی سرکاری زبانیں اُردو اور بنگلہ اور ایسی دوسری صوبائی زبانیں ہونی چاہئیں جنہیں متعلقہ صوبائی اسمبلی کی سفارش پر صدرِ مملکت یہ حیثیت دینے کا اعلان کرے گا۔

۲۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو انگریزی کے علاوہ اردو اور بنگلہ میں تقریر

---

[1] ڈان کراچی ۲۰ اپریل ۱۹۵۴ء

Marfat.com

کرنے کا حق ہوگا۔

۳۔ مندرجہ بالا دفعات کے باوجود آئین کے نفاذ کے بعد ۲۰ سال کے عرصہ کے لئے انگریزی کو حسبِ سابق تمام سرکاری معاملات کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

۴۔ مرکزی ملازمتوں کے امتحانات کے لئے صوبائی زبانوں کو مساوی درجہ دیا جائے گا۔

۵۔ ثانوی سکولوں میں عربی، اُردو اور بنگلہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا تاکہ طلبا اپنے ذریعہ تعلیم کے علاوہ ان میں سے بھی ایک یا دو زبانیں سیکھ سکیں۔

۶۔ حکومت ایک مشترکہ قومی زبان کی ترقی و فروغ کے لئے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔

۷۔ آئین کے نفاذ کے دس سال بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو انگریزی زبان کی جگہ متبادل انتظام کے لئے سفارشات پیش کرے گا۔

Marfat.com

مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست کے اسباب

یہ سوال بڑا اہم ہے اور اکثر پوچھا جاتا رہا ہے کہ جب مشرقی پاکستان کے لوگوں نے ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی اتنی بھرپور حمایت کی تھی تو صرف آٹھ سال بعد ۱۹۵۴ء میں انھوں نے اس جماعت کو کیوں مسترد کر دیا؟ ذیل میں ۵۴ - ۱۹۴۷ء کے دوران میں رونما ہونے والے سیاسی تغیر و تبدیل کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اور ان اسباب و عوامل کی نشاندہی کی جا رہی ہے جو بالآخر مسلم لیگ کی شکست فاش کا باعث بنے۔

وزارت اعلیٰ کے ساتھ جب نور الامین نے صوبائی مسلم لیگ کی صدارت کے فرائض بھی سنبھالے تو یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ مسلم لیگ میں نئی روح پھونک دیں گے خیال کیا جاتا تھا کہ موصوف دونوں عہدوں پر بیک وقت متمکن ہونے کی وجہ سے عوام کے احساسات کے ساتھ مشرقی پاکستان کی سیاسیات میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکیں گے لیکن یہ توقع محض سراب ثابت ہوئی اور ان سے وابستہ خوش فہمی حقائق کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ نور الامین اپنے صوبے میں ان اسباب و عوامل کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے، جو ان کی حکومت اور جماعت کے خلاف کارفرما تھے۔ ان برسوں میں عوام کے ساتھ مسلم لیگ کا ربط و تعلق تقریباً ختم ہو چکا تھا اور نئے صوبائی صدر کے طور پر نور الامین نے بھی اس ربط و تعلق کے احیا و تجدید کے سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا۔ غالباً وہ حکومت کے معاملات میں بے حد مصروف تھے اور جماعت کی تنظیم نو کی طرف توجہ کرنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہ بچتا ہوگا۔ جماعت کو موثر و فعال اور سرگرم قیادت کی ضرورت تھی اور نور الامین اس ضرورت کو پورا نہ کر سکے۔

Marfat.com

اس دوران میں مشرقی پاکستان میں جو واقعات رونما ہوئے اور جو قوتیں کار فرما تھیں ان کا پوری طرح تجزیہ کئے اور انہیں کماحقہ سمجھے بغیر وہاں کی سیاسیات کے پیچ و خم پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے۔ اول تو مشرقی اور مغربی پاکستان میں جغرافیائی بُعد نے وہاں کی سیاست پر بہت وسیع اور دوررس اثر ڈالا۔ موخر الذکر سبب کی وجہ سے دونوں صوبوں کے اندازِ فکر و عمل میں بھی بڑا فرق تھا۔ اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مسلم لیگ نے اس بُعد کو کم اور دور کرنے کے سلسلہ میں ٹھوس اقدامات نہ کئے نتیجے کے طور پر یہ بُعد نہ صرف برقرار رہا بلکہ جذباتی طور پر اس کی وسعت اور شدت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریہ حیات تھی اور مسلم لیگ نے اپنی جد و جہد میں اس نظریئے پر پورا زور دیا تھا۔ اس نظریئے سے ایک عام آدمی کی مراد اسلامی تعلیمات کے مطابق طرزِ زندگی بسر کرنا، مساوات کی کارفرمائی غربت و افلاس کا خاتمہ تھا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کو مسلم لیگ سے گہری جذباتی وابستگی تھی کیونکہ مسلم لیگ نہ صرف اسلامی نظریے کی علمبردار تھی بلکہ اس کا مظہر بھی سمجھی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں عوام نے مسلم لیگ کے حق میں اس لئے ووٹ ڈالے تھے کہ اس نے انہیں غربت و افلاس سے نجات دلانے اور آسودہ حال بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا[1]۔ تقسیم سے پہلے مسلم لیگ ان محکوم لوگوں کی نمائندہ ترجمان جماعت بن گئی تھی جنہیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت غربت و افلاس کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیا گیا تھا۔ بنگال کا جو حصہ مشرقی پاکستان بنا وہ اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے

---

[1] عبد الوحید خاں بحوالہ سابقہ (تاثرات و تصورات) صفحہ نمبر ۱۰۳

Marfat.com

مسلم ہند کا پس ماندہ ترین علاقہ تھا لیکن تقسیم اور آزادی کے بعد بھی مسلم لیگ نے عام لوگوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا۔

"مسلم لیگ مشرقی پاکستان کے لئے کوئی ٹھوس اقتصادی پروگرام مرتب کرنے میں ناکام رہی"[1] ساتھ ہی ساتھ اسلامی نظریہ کی گرفت کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی کیونکہ نہ نظامِ تعلیم کے ذریعے اسلامی ضابطہ حیات کی ترویج کی کوشش کی گئی اور نہ اسلامی طرزِ حیات کو عملی شکل دینے کے لئے تدابیر کی گئیں عام لوگوں اور مسلم لیگ کے درمیان مضبوط ترین رشتہ اسلامی نظریہ کا ہی تھا لیکن مسلم لیگ کی قیادت کے کوتاہ اندیشانہ رویئے کی سب سے زیادہ زد نظریئے ہی پر پڑی۔ دوسری طرف مخالف گروپ مسلم لیگ کے خلاف بڑے سرگرم تھے اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عام لوگ مسلم لیگ اور اس کی حکومت سے سخت مایوس اور بیزار ہو گئے۔[2]

وزارت اعلیٰ اور صدارت کو یکجا کرنے سے مسلم لیگ کو فائدہ تو کوئی نہ پہنچا، البتہ یہ جماعت ہر قسم کی جرح و تنقید کا ہدف بن گئی۔ حتیٰ کہ اس کی سرگرمیاں صرف گورنمنٹ ہاؤس کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ سال کے بعد سال گزرتا رہا لیکن نہ نئے رکن بنائے گئے اور نہ نئے انتخابات کرائے گئے۔ اس طرح جماعت کی شریانیں نئے خون سے یکسر محروم رہیں۔ چنانچہ لوگوں میں یہ احساس پیدا نہ ہو سکا کہ وہ حکومت اور جماعت کے معاملات میں شریک ہیں۔ دوسری طرف جماعت کے لیڈروں کی دھڑے بندیوں اور باہمی سازشوں نے بھی اسے

---

[1] عبدالوحید خان۔ بحوالہ سابقہ صفحہ نمبر ۱۴۲

[2] نورالامین نے (بحوالہ سابقہ) اپنے انٹرویو میں اعتراف کیا کہ نظریہ پاکستان کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی کوشش نہ کی گئی اور نہ نظامِ تعلیم کو اس کے مطابق ڈھالا گیا۔

Marfat.com

غیر مقبول بنانے میں اہم حصہ لیا۔

جس واحد سبب نے مشرقی پاکستان کے عوام اور مسلم لیگ میں مغائرت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں زیادہ حصہ لیا وہ لسانی تحریک تھی۔ مطالبہ یہ تھا کہ بنگلہ چونکہ عوام کی اکثریت کی زبان ہے اس لئے بنگلہ کو بھی اردو کے ساتھ قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ زبان کے سلسلے میں یہ مطالبہ تحریک پاکستان کے زمانے میں مقبول عام موقف کے خلاف تھا لیکن جب مسلم لیگ نے نظریۂ پاکستان کے دوسرے اہم اور بنیادی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا تو اسلام کی بنیاد دل پر ملی وحدت کے رشتے بھی کمزور ہو گئے اور اس دعویٰ کو مسترد کرنا آسان نہ رہا کہ بنگلہ چونکہ اکثریت کی زبان ہے، اس لئے لسانی مطالبہ اس کا حق ہے۔ یہ تحریک ۱۹۴۸ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس کے بعض پہلوؤں پر قبل ازیں کچھ روشنی ڈالی جا چکی ہے[1]۔ یہاں اس تحریک کے چند اہم نکات ہی زیر بحث لائے جا رہے ہیں۔ گورنر جنرل بننے کے بعد خواجہ ناظم الدین نے ڈھاکہ میں ۱۹۵۲ء میں یہ اعلان کیا کہ صرف اردو ہی قومی زبان ہو گی[2]۔ اس اعلان پر طلبہ مشتعل ہو کر سڑکوں پر آ گئے اور ایجی ٹیشن شروع کر دی گئی۔ بالآخر اس تحریک نے امن وامان کو بھی معطل کر دیا۔ اور صوبائی حکومت حالات پر قابو پانے کے لئے گولی چلانے پر مجبور ہو گئی۔ چند طلبا کے ہلاک ہونے پر تحریک نے شدت اختیار کر لی اور مسلم لیگ پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ ایک جائز مطالبہ پورا کرنے کے بجائے عوام پر بہیمانہ تشدد کر رہی ہے۔ اس تحریک میں بنگالی

---

[1] لسانی تحریک اور مشرقی پاکستان کی سیاسیات کے تجزیے کے لئے اسی مصنف کی تصنیف سقوط مشرقی پاکستان ملاحظہ فرمائیں۔

[2] نورالامین سے انٹرویو "بحوالہ سابقہ"۔

Marfat.com

ہند و پیش پیش تھے۔ گولی چلانے کا واقعہ مسلم لیگ کے لئے بڑا مہنگا سودا ثابت ہوا۔ مسلم لیگ وزارت کی اس سیاسی غلطی کو خوب اچھالا گیا اور چند طلبا کا خون اس تحریک کا روحانی اور جذباتی سرمایہ بن گیا، جسے برقرار رکھنے کے لئے ڈھاکہ میں "شہید مینار" تعمیر کیا گیا جسے بالآخر نہ صرف دانش وروں نے زیارت گاہ بنا لیا بلکہ مشرقی پاکستان میں متعین اور دورہ پر جانے والے سفارتی نمائندے بھی وہاں اس طرح حاضر ہوتے تھے جس طرح کراچی میں قائداعظم کے مزار پر[1]۔

دوسری طرف لیگی وزرا کوٹھیوں میں مقفل رہتے تھے اور ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ حکومت کے موقف کی وضاحت کر سکیں[2]۔ یہ مطالبہ اپنی جگہ معقول تھا اور قائداعظم نے مارچ ۱۹۴۸ء میں بڑے تدبر کے ساتھ اس پر عمل درآمد کا راستہ بھی تجویز کر دیا تھا لیکن مسلم لیگی وزارت نے اس معاملے میں سنگین غفلت سے کام لیا۔ حتیٰ کہ یہ مطالبہ ایک طوفان کی شکل اختیار کر گیا جس کے ریلے کے سامنے ۱۹۵۴ء میں مسلم لیگ خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی[3]۔ بعد میں مرکزی حکومت نے بھی اس مطالبے کو منظور کر لیا لیکن التوا و تاخیر سے ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا تھا اور مخالف جماعتوں، ہندوؤں اور کمیونسٹ عناصر نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اُٹھا لیا تھا۔ انہوں نے مسلم لیگ اور حکومت کے خلاف بڑی زور دار اور موثر تحریک شروع کر دی تھی اور زبان کے نام پر عام لوگوں کے دلوں میں صوبائیت کا زہر گھول دیا تھا۔ اس تاثر کے نقوش گہرے کرنے

---

[1] "علیحدگی کا تجزیہ" زیڈ اے سلیری کا مضمون۔ پاکستان ٹائمز ۱۴ نومبر ۱۹۷۱ء

[2] عبدالوحید خاں بحوالہ سابقہ صفحہ ۱۰۶

[3] نورالامین نے اپنے انٹرویو میں مولف کو بتایا کہ انہوں نے مرکزی حکومت پر بنگلہ کو تسلیم کرنے کے لئے بڑا زور دیا لیکن ان کی بات سنی ان سنی کر دی گئی۔

Marfat.com

کے لیے عوام کو یہ بتایا گیا تھا کہ چونکہ مغربی حصے کا غلبہ ہے اس لیے مشرقی پاکستان کے ایک جائز اور درست مطالبے کو دیدہ دانستہ نظر انداز کیا جا رہا ہے[1]۔ لوگوں کے اس مطالبے سے ہمدردی ظاہر کر کے متذکرہ صدر عناصر نے ایک طرف مسلم لیگ کے خلاف نفرت بڑھا دی اور دوسری طرف اسی تناسب سے عوام کی ہمدردی حاصل کر لی۔ مسلم لیگ اگرچہ برسر اقتدار تھی اور اس گمراہ کن اور معاندانہ پروپیگنڈہ کے ابطال کے لیے تمام ذرائع اس کی دسترس میں تھے لیکن مسلم لیگ اپنے لیڈروں کی بے عملی اور بدعنوانی کے باعث اس قدر بے اثر اور بدنام ہو چکی تھی کہ وہ اس مہم کا مقابلہ کرنے میں بری طرح ناکام رہی۔

مسلم لیگ کی شکست فاش کا دوسرا اہم اور ایک لحاظ سے سب سے بڑا سبب مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کا رویہ اور کردار تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے مشرقی پاکستان تین طرف سے بھارت میں گھرا ہوا ہے۔ تقسیم برصغیر سے پہلے کلکتہ نہ صرف متحدہ بنگال کا دارالحکومت تھا بلکہ بنگالیوں کے لیے ہر فکری ثقافتی اور سیاسی تحریک کا سرچشمہ بھی تھا۔ ہندوؤں نے کبھی پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ان کے لیے "تقسیم بھارت" ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے مترادف تھی۔ پاکستان سے بدلہ اور انتقام لینے کی جو آگ ان کے دلوں میں بھڑک رہی تھی اسے شعلوں کی شکل دینے کے لیے بھارت نے اپنے تمام ذرائع ان کی مدد کے لیے وقف کر رکھے تھے[2]۔ کلکتہ اور بھارت میں پاکستان کے خلاف جو مواد شائع ہوتا تھا، ہندو ناجائز طور پر اسے مشرقی پاکستان میں

---

[1] شمس الدین سے انٹرویو۔ (بحوالہ سابقہ)

[2] زیڈ اے سلیری۔ (بحوالہ سابقہ)

Marfat.com

لے آتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی درسگاہوں میں ہندو اساتذہ کو بڑا عمل دخل حاصل رہا۔ اس لئے انھوں نے بنگلہ زبان سے عربی اور فارسی زبان کے الفاظ چن چن کر نکالے اور ان کی جگہ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھر دیئے[1] اس طرح تعلیم یافتہ لوگوں بالخصوص طلبا کا انداز فکر بدلنے کی پوری اور کامیاب کوشش کی گئی۔ اس کام میں کالج کے ہندو پروفیسروں نے سب سے زیادہ حصہ لیا[2]۔ اس کے ساتھ اُنھوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ثقافتی فرق کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے ہر ممکن طریق سے اجاگر بھی کیا۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کے لیڈروں کا عوام سے رشتہ منقطع ہو چکا تھا چنانچہ ہندوؤں نے مسلم لیگ کے مخالف سیاسی عناصر کی دامے درمے، سخنے، قدمے پوری امداد کی اور پاکستانی قومیت کے خط و خال بدلنے کی کوشش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی[3]۔

درسگاہوں میں غیر معمولی اثر و نفوذ کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کی اقتصادیات بھی بڑی حد تک ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ جہاں عام لوگ ہندو مہاجنوں کی آہنی گرفت میں تھے وہاں اُن کے بچے ہندو اساتذہ کے رحم و کرم پر تھے[4]۔ اس اقتصادی اور تعلیمی بالادستی سے ہندوؤں کو مسلم

---

[1] اردو ڈائجسٹ ـ مشرقی پاکستان نمبر۔ نومبر ۱۹۷۱ء

[2] ایضاً

[3] زیڈ اے سلیری (بحوالہ سابقہ) نوٹ:۔ اب تو یہ بات بھارتی پریس نے بھی تسلیم کر لی ہے کہ بھارتی حکومت عرصے سے مجیب الرحمٰن کی مالی اور فوجی امداد کر رہی تھی۔ نوائے وقت ۵ مارچ سنہ ۱۹۷۳ء علاوہ ازیں اپنی رہائی کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن نے لندن میں بی بی سی ٹیلی ویژن سروس پر انٹرویو دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ وہ مشرقی پاکستان کی آزادی کے لیے ۱۹۴۸ء سے کام کر رہے تھے۔

[4] ایضاً۔

Marfat.com

اور مغربی پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کرنے کا سنہری موقع مل گیا جس سے انھوں نے پورا فائدہ اُٹھایا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوؤں کا پروپیگنڈہ یکسر بے جواز نہ تھا۔ ان کی تمام تر کامیابی مسلم لیگ کی غفلت اور حکومت کے سنگدلانہ رویّے کی مرہون منت تھی۔

یہ بات شک وشبہ سے بالا ہے کہ مسلم لیگ کی حکومت نے مشرقی پاکستان کی اقتصادی حالت بہتر بنانے میں نہ ہونے کے برابر دلچسپی لی اور آہستہ آہستہ یہ تاثر راسخ ہو گیا کہ حکومت اور عوام میں ربط وتعلق پیدا کرنے میں مسلم لیگ ناکام ثابت ہوئی ہے اور اسے مغربی پاکستان صرف اقتدار کے حصول اور تحفظ کے لئے استعمال کر رہا ہے۔

مغربی پاکستان کے خلاف جذبات مشتعل کرنے میں کئی عوامل نے حصّہ لیا۔ سب سے زیادہ زور دونوں حصوں کے درمیان اقتصادی عدم مساوات کے پروپیگنڈہ پر دیا گیا۔ اور اس سلسلے میں جھوٹ اور مبالغے سے بھی کام لیا گیا۔ یہ بات بار بار کہی جاتی تھی کہ مشرقی پاکستان جو زرِمبادلہ کماتا ہے اسے مغربی پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ تقسیم کے وقت مشرقی پاکستان میں نہ صرف یہ کہ کوئی صنعت نہ تھی بلکہ اعلیٰ ملازمتوں میں بھی بنگالی مسلمانوں کے تناسب کی وجہ سے بیشتر اعلیٰ افسر مغربی پاکستان سے بھیجے گئے تھے یا بھارت کے مختلف صوبوں سے وہ مسلمان افسر وہاں گئے تھے جنھوں نے پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔[1] اکثر اعلیٰ افسروں کا طرزِ عمل بھی متمردانہ تھا جس نے جلتی پر تیل کا کام دیا اور اسے مغربی پاکستان کے خلاف منافرت

---

[1] زبیڈ اے سلیری۔ (بحوالہ سابقہ) تفصیلات کے لئے دیکھیں اسی مصنف کی کتاب "سقوط مشرقی پاکستان"

Marfat.com

بڑھانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ مرکز میں سیاست کے عام معاملات بالخصوص ایک مغربی پاکستانی گورنر جنرل کے ہاتھوں خواجہ ناظم الدین کی برطرفی سے بھی اس تاثر کو تقویت پہنچی کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان پر حکومت کر رہا ہے۔ اگرچہ اس پروپیگنڈہ میں حقائق اور تاریخ کو بُری طرح مسخ کیا گیا تھا، لیکن مسلم لیگ نے زمانۂ اقتدار کی طرح اقتدار سے محرومی کے دور میں بھی اس کی تردید کے لیے کچھ نہ کیا[۱] چنانچہ مشرقی پاکستان کے عوام رفتہ رفتہ یہ سمجھنے لگے کہ ملک کی حکومت میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ مزید برآں تمام دوسرے صوبوں میں ۵۲-۱۹۵۱ء میں عام انتخابات کرائے گئے، مشرقی پاکستان میں تاخیر و التوا سے کام لے کر وہاں کے عوام کو اپنے نئے نمائندے چننے کے حق سے ۱۹۵۴ء تک محروم رکھا گیا۔ اس طرح محرومی کا احساس و تاثر دلوں کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا۔ اس کام میں مخالف پارٹیوں کے منظم پروپیگنڈے نے بڑا کام کیا۔ "حکومت میں بنگالیوں کی محرومی اور مخالفانہ پراپیگنڈے کا اثر اس قدر نمایاں تھا کہ اگرچہ صوبے کی اقتصادی ترقی کے لیے کروڑوں روپے خرچ کیے گئے لیکن رائے عامہ نے اس کا رتی بھر اثر قبول نہ کیا۔"[۲]

مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست اور ناکامی کی ایک اور بڑی وجہ مخالف جماعتوں کا متحدہ محاذ بھی تھا، جس کی قیادت سہروردی، بھاشانی اور فضل الحق کر رہے تھے۔ ان تینوں کو خواجہ ناظم اور نورالامین سے ذاتی رنجش تھی اور وہ مسلم لیگ کے خلاف ذاتی محرومیوں کے سبب مؤثر و مضبوط

---

[۱] نورالامین کا انٹرویو (بحوالہ سابقہ) اُنھوں نے بتایا کہ وہ مرکزی حکومت کو بار بار آگاہ کرتے رہے لیکن ان کی یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

[۲] زیڈ اے سلیری (بحوالہ سابقہ)

Marfat.com

تحریک چلانے کے لئے کوشاں تھے۔ اس جدوجہد میں کمیونسٹوں اور ان "کبیدہ خاطر" عناصر نے بھی ان کا پورا ساتھ دیا جنہیں مسلم لیگ کا رکن نہیں بنایا گیا۔ کمیونسٹ متحدہ محاذ میں کس قدر فعال اور سرگرم تھے۔ اس امر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے ارکان جو متحدہ محاذ میں گھس آئے تھے ان میں سے بائیس اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے اور اُنھوں نے ہنگامے بپا کرنے اور انتشار پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا[۲]۔ وہ مسلم لیگ کے خلاف کالے چور سے بھی تعاون کرنے پر آمادہ تھے۔ ان کے علاوہ ہندو بھی ان کی ہر خدمت سرانجام دینے کے لئے تیار اور آمادہ تھے[۳]۔ ان عناصر کے لیڈر ہندوؤں کے ناپاک عزائم کے لئے بڑے موزوں تھے چنانچہ ہندوؤں نے ہر ممکن طریق سے ان کی مالی اور سیاسی امداد کی مسلم لیگ نے اپنے دروازے ہندوؤں پر کھولنے سے انکار کر دیا تو نئی سیاسی پارٹیوں نے ان کے لئے دیدہ و دل فراش راہ کر دئیے۔ ہندوؤں کو بھی ان سیاسی پارٹیوں میں پناہ مل گئی تھی۔ حکومت کسی ہندو کے خلاف کوئی جائز کارروائی بھی کرتی تو یہ پارٹیاں اسے سیاسی انتقام ظاہر کرتیں۔ اس طرح ہندو اور زیادہ دیدہ دلیر ہو گئے۔ سہروردی ۱۹۴۷ء میں ہی غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر سیاسی جماعت کے قیام کی حمایت کرنے لگے تھے۔ وہ اپنے غلیظ سیاسی کردار کے باعث بنگالی مسلمانوں میں تو مقبول تھے ہی اب ہندو بھی ان کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔ وہ فضل الحق آزاد اور خود مختار بنگال کے حامی تھے، اس لئے ہندو ان کی بطور خاص حمایت کرتے تھے[۳]۔ فضل الحق نے

---

[۱] طارق علی خان (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۵۱۔۶۲

[۲] شمس الدین سے انٹرویو (بحوالہ سابقہ) وہ اس زمانہ میں عوامی لیگ میں تھے۔

[۳] مارشل لاء سے مارشل لاء تک" (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۲۱۷

قیام پاکستان سے چند سال پہلے مسلم لیگ سے نکلنے کے بعد ہندوؤں کے ایک انتہا پسند لیڈر شیاما پرشاد مکرجی کے ساتھ مل کر وزارت بھی بنائی تھی اس وجہ سے بھی ہندو ان کے حامی تھے[۱] بعض غیر ملکی طاقتوں نے بھی مشرقی پاکستان میں روپیہ پانی کی طرح بہایا[۲] ۔ سہروردی، بھاشانی اور فضل الحق اگرچہ مزاجاً اور نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے لیکن مسلم لیگ کی مخالفت ان میں قدر مشترک تھی۔ مسلم لیگ کو شکست دینے کیلئے انہوں نے متحدہ محاذ بنا لیا۔ وہ صوبائی خود مختاری کے پردے میں آزادی کامل کے لئے پروپیگنڈہ کرتے تھے اور عامۃ الناس کو مرعوب اور خوفزدہ کرنے کے لئے انھوں نے کرائے کے غنڈوں کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہ کیا[۳]۔ کمیونسٹوں نے اس زریں موقع سے فائدہ اُٹھایا اور متحدہ محاذ کی صفوں میں گھس گئے[۴] ۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں عام انتخابات بڑے خوف و ہراس کی فضا میں ہوئے۔

درسگاہوں اور پروپیگنڈے کے دوسرے ذرائع سے عام لوگوں کے دلوں میں مسلم لیگ کے خلاف اس قدر زہر بھر دیا گیا تھا کہ ان کے لئے متحدہ محاذ کے پروگرام کی حمایت کرنے اور اس کی پالیسیوں کی ہم نوائی کرنے کے سوا کوئی راہ عمل کھلی نہیں رہی تھی۔ مسلم لیگ کی کامیابی کے امکانات کو اور زیادہ تاریک اور مخدوش بنانے میں غلام محمد کی سربراہی

۱؎ متحدہ محاذ کا انتخابی منشور

۲؎ زیڈ اے سلیری (بحوالہ سابقہ)

۳؎ ڈان کراچی ۲۴ر فروری ۱۹۵۴ء

۴؎ مارشل لاء سے مارشل لاء تک" (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۴۸۔

میں مرکزی حکومت کے سازشی کردار نے بھی بڑا حصّہ لیا۔[۱]

یہ سب عوامل مسلم لیگ کے خلاف متحدہ طور پر سرگرمِ عمل تھے اور ان کا نتیجہ عام انتخابات میں اُس جماعت کی شکست فاش کی صورت میں نکلا جس نے صرف چھ سال قبل عوام کی بھرپور حمایت سے قیامِ پاکستان کا معرکہ عظیم سر کیا تھا۔ لیکن مسلم لیگ کے لیڈر اس قدر بے حس اور بے بصیرت ہو چکے تھے کہ اس دندان شکن شکست سے بھی انہوں نے کوئی سبق نہ سیکھا۔

مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست فاش سے پاکستانی قوم کے اتحاد کی بنیادیں بھی کمزور پڑ گئیں کیونکہ مسلم لیگ ہی نظریہ پاکستان کی مظہر اور علمبردار تھی اور یہی جماعت پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان اسلام کے بعد مضبوط ترین رشتہ تھی۔ جب یہ رشتہ کمزور پڑ گیا اور قومی اندازِ فکر کی حامل کوئی بھی دوسری جماعت نہ اُبھری تو پاکستان کے افق پر خطرے کے بادل منڈلانے لگے اور جب یہ بادل برسے تو مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک وسیع سمندر حائل ہو گیا جس پر بھارت کا قبضہ ہے۔

مسلم لیگ —— ریاستوں میں

تقسیم سے قبل مسلم لیگ نے ہند کی ریاستوں کے معاملات میں براہ راست کوئی نمایاں حصہ نہ لیا۔ زیادہ دلچسپی کشمیر سے تھی اس

---

[۱] غلام محمد نے صوبائی حکومتوں کو کمزور کرنے کی سازش کر رکھی تھی۔ مشرقی پاکستان مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ نے جن امیدواروں کے نام تجویز کیے تھے ان میں سے کئی کو مرکزی پارلیمانی بورڈ نے مسترد کر دیا۔ دراصل غلام محمد کو مشرقی پاکستان کی لیگی حکومت ناپسند تھی اور اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اس صوبے میں یہ جماعت نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ (نورالامین سے انٹرویو — بحوالہ سابقہ)

Marfat.com

اس لیے کہ اس ریاست کی آبادی کی اکثریت مسلمان تھی اور حکمران ایک ہندو راجہ تھا۔ تاہم لیگ نے ریاست کشمیر میں بھی براہ راست مداخلت کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ خیال زیادہ زور سے ابھرا کہ سیاسی اعتبار سے اگرچہ ریاستیں پس ماندہ ہیں لیکن انہیں بھی سیاسی زندگی میں پوری طرح شریک کرنا چاہیے۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستان مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں لیاقت علی خان نے جماعتی آئین کے دفعہ ۶۵ میں ایک ترمیم پیش کی جس میں مسلم لیگ کو بلوچستان، بہاولپور اور خیرپور کی ریاستوں میں اپنی شاخیں قائم کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

ریاستوں میں مسلم لیگ کی تنظیم کا فریضہ ورکنگ کمیٹی کی ایک نگران کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ اس نگران کمیٹی کو تنظیم کی مختلف شاخوں کے درمیان تنازعات طے کرنے اور دوسرے تنظیمی امور کے بارے میں فیصلہ صادر کرنے کا مجاز قرار دیا گیا۔

خیرپور

ریاست خیرپور میں رکنیت سازی کے لئے ایک تنظیمی کمیٹی معرض وجود میں لائی گئی۔ جب اس ریاست میں قانون ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے جماعتی طور پر ان میں حصہ لیا اور کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ یہ اپنی جگہ ایک خوشگوار کارکردگی تھی۔ انتخابات کے لئے خیرپور میں پہلی مرتبہ ریاستی اسمبلی قائم کی گئی۔ یہ انتخابات ۱۹۵۳ء میں ہوئے۔ ریاست خیرپور مسلم لیگ کے لئے حسین امام کو کنوینر مقرر کیا گیا۔ انہیں ریاست میں لیگ کی تنظیم کے ساتھ ساتھ ریاستی

Marfat.com

اسمبلی کے انتخابات میں جماعتی ٹکٹ دینے کا بھی اختیار دیا گیا تھا۔ تنظیم کے سلسلے میں ورکنگ کمیٹی اور پارلیمانی بورڈ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ حسین امام کے تقرر اور دوسرے اداروں کے قیام پر بعض حلقوں نے بڑے اعتراضات کئے اور خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد جب یوسف ہارون مسلم لیگ کے قائم مقام صدر بنے، تو انہوں نے ان شکایات پر توجہ بھی کی۔[۱] اس دوران میں ریاست خیرپور کو صوبہ سندھ میں مدغم کرنے کا فیصلہ ہو گیا تو یوسف ہارون نے خیرپور میں مسلم لیگ کی تنظیم کے سلسلے میں کام معطل کر دیا۔[۲]

بہاولپور مغربی پاکستان کے لئے مسلم لیگ کی نگران کمیٹی کے دورہ بہاولپور کے بعد ریاست بہاولپور میں مسلم لیگ کی تنظیم کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ بہاولپور کی ریاستی اسمبلی کے انتخابات ۱۹۵۲ء میں ہوئے اور مسلم لیگ کو ۴۹ میں سے ۳۵ حلقوں میں کامیابی حاصل ہوئی۔[۳] لیگ پارلیمانی پارٹی نے مخدوم زادہ حسن محمود کو اپنا لیڈر منتخب کیا اور امیر بہاولپور نے انہیں وزارت بنانے کی دعوت دی قبل ازیں عبدالرشید بہاولپور کے وزیر اعلیٰ تھے۔ منتخب وزارت کے قیام کے بعد وہ ریاستی حکمران کے مشیر بن گئے۔

بلوچستان تقسیم سے پہلے بلوچستان دو حصوں میں تقسیم تھا، ایک برطانوی بلوچستان، جس کا انتظام گورنر جنرل کے ایجنٹ کے سپرد تھا۔ دوسرا حصہ ریاستوں، قلات، لس بیلہ، مکران، خاران وغیرہ پر مشتمل تھا۔

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۸ر اکتوبر ۱۹۵۳ء

[۲] ایضاً

[۳] ایضاً ۲۸ر مئی ۱۹۵۲ء

Marfat.com

جن کے اپنے اپنے حکمران نواب تھے۔ سب سے بڑی اور اہم ریاست قلات تھی اور اس کا حکمران خان قلات تھا۔ برطانوی بلوچستان میں مسلم لیگ پہلے سے موجود تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ریاستوں میں مسلم لیگ کی تنظیم اور شاخیں قائم کرنے کا کام شروع ہوا تو گورنر جنرل کے ایجنٹ کے مشیر اعلیٰ قاضی عیسیٰ کو بلوچستان مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا۔ یہاں بھی دوسرے صوبوں کی طرح لیڈروں کے درمیان ذاتی اور شخصی وجوہ پر اختلافات پیدا ہو گئے اور جماعت دھڑے بندی کا شکار ہو گئی۔ اقتدار کے لئے رسہ کشی اس طرح شروع ہوئی کہ قاضی عیسیٰ کے نائب نے صدر صوبائی مسلم لیگ پر اعتراض کیا کہ وہ بیک وقت دو عہدوں پر کیوں فائز ہیں؟ ایک سیاسی عہدہ یعنی صوبائی مسلم لیگ کی صدارت اور دوسرا سرکاری عہدہ یعنی گورنر جنرل کے ایجنٹ کا مشیر اعلیٰ۔ قاضی عیسیٰ نے اس اعتراض پر اسے مسلم لیگ کی نائب صدارت کے عہدے سے معطل کر دیا۔[1]

قاضی عیسیٰ کے مخالف گروپ نے ۳۰ افراد پر مشتمل ایک وفد کراچی بھیجا جس نے لیاقت علی خان اور چودھری خلیق الزماں سے ملاقات کی۔ انہوں نے قاضی عیسیٰ کے خلاف الزامات کی فہرست پیش کرتے ہوئے مناسب کارروائی کے لئے التماس کی۔[2] قاضی عیسیٰ اس پر سخت برافروختہ ہوئے اور بلوچستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کر کے کراچی جانے والے وفد کے دو ممتاز ارکان کو مسلم لیگ سے ہی پانچ سال کے لئے خارج کر دیا۔ جن افراد کے خلاف "نامناسب سرگرمیوں کی پاداش میں تادیبی کارروائی" کی گئی، ان میں صوبائی لیگ کے

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۲ جنوری ۱۹۵۱ء

[2] ایضاً ۲۷ جنوری ۱۹۵۰ء

Marfat.com

جوائنٹ سیکرٹری میر نبی بخش اور کونسل کے ایک رکن میر قادر بخش بھی شامل تھے۔[1]

اس دوران میں پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزمان "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر کاربند رہے۔ قاضی عیسیٰ کی طرف سے اس کارروائی کے بعد انہوں نے فاتح گروپ کو آشیرباد دینے میں تاخیر نہ کی۔[2] چودھری خلیق الزمان خود پاکستان مسلم لیگ کا صدر بننا چاہتے تھے، اس لئے وہ ہر قیمت پر لیگ کے مقتدر صوبائی لیڈروں کی حمایت کرنے اور ان کی ہر قسم کی امداد کرنے پر کمربستہ رہتے تھے۔ بلوچستان سے وفد کی آمد پر انہوں نے یہ اعلان کیا تھا، کہ قاضی عیسیٰ کو مسلم لیگ کونسل کا وہ اجلاس بلانے کا اختیار ہی نہ تھا، جس میں دو لیڈروں کو جماعت سے خارج کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کے چند دن بعد انھوں نے ایک اور بیان جاری کیا کہ "کونسل اپنی صوابدید کے مطابق ہر کارروائی کرنے کی پوری طرح مجاز تھی"[3] اس متضاد اور مضحکہ خیز کارروائی کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان مسلم لیگ کے صدر صوبائی سربراہوں کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے میں معذور تھے۔ اول تو اس لیے کہ وہ سربراہ مقامی حکومتوں میں مقتدر حیثیت کے مالک تھے، دوسرے اس لئے کہ مسلم لیگ کے انتخابات کے معاملے میں چودھری صاحب کو خود بھی صوبائی لیڈروں کی حمایت و امداد کی ضرورت تھی۔ یہ طویل رسہ کشی بالآخر اس طرح ختم ہوئی کہ قاضی عیسیٰ صوبائی لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو گئے اور جماعت نے بھی ان کا استعفا

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۰ر فروری ۱۹۵۰ء

[2] ایضاً ۲۴ر فروری ۱۹۵۰ء

[3] ایضاً

Marfat.com

منظور کر لیا۔

قاضی محمد عیسیٰ پھر بلوچستان مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے اور بلوچستان میں بھی صوبائی خود مختاری کے لئے تحریک شروع ہو گئی۔ مئی ۱۹۵۱ء میں بلوچستان اصلاحات تحقیقاتی کمیٹی کا اجلاس کوئٹہ میں ہوا اور کمیٹی کے ارکان نے صوبائی مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کی۔ ان لیڈروں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیادوں پر بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ کا مطالبہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ شاہی جرگہ کا مستقبل، سرداری نظام اور دوسرے معاملات آئندہ منتخب ہونے والی صوبائی اسمبلی کی صوابدید پر چھوڑ دیئے جائیں۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ صوبہ بھی سیاسی پختگی کے مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے اور حکومت خود اختیاری کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا پوری طرح اہل ہے[1]۔ قاضی عیسیٰ نے ذمہ دار صوبائی اسمبلی اور وزارت کے قیام کو وقت کا تقاضا قرار دیا۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ بلوچستان میں ایک دیوانی مقننہ قائم کیا جائے[2]۔

انتخابات میں مختلف اضلاع سے ۷۰ ارکان چنے گئے لیکن منتخب ارکان کی اکثریت صوبائی لیگ کے لیڈروں کے مخالفین پر مشتمل تھی۔ ایک اجلاس میں دو تہائی ارکان نے صوبائی لیگ کی قیادت کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کی اور سابقہ انتخابات کو "بے ضابطہ، خلاف قانون اور غیر آئینی" قرار دے کر از سر نو انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا[3]۔

فروری ۱۹۵۲ء میں بلوچستان مسلم لیگ کے نئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء

[2] ایضاً

[3] ایضاً ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

اور ملک شاہ جہان نئے صدر منتخب ہو گئے۔ باز محمد خان۔ سردار نور محمد خان میر قادر بخش اور سردار محمد عیسیٰ خان پر مشتمل پارلیمانی بورڈ قائم کیا گیا۔ اس بورڈ کے لئے محمد حسن صدر اور میر نبی بخش سیکریٹری منتخب ہوئے[1]

عہدیداروں کے انتخاب کے سلسلہ میں اجلاس میں یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ مرکزی لیگ نے دونوں متحارب دھڑوں کے اختلافات کا جائزہ لینے کے لئے جو تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی، اس کے ارکان اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ کونسل صدر کا انتخاب ملتوی کر دے۔ لیکن کونسل نے ان کی یہ تحریک مسترد کر دی۔ اس پر وہ بطور احتجاج اجلاس سے اُٹھ کر چلے گئے[2]

تحقیقاتی کمیٹی کے ارکان نے خواجہ ناظم الدین کو جو رپورٹ پیش کی اس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ "بلوچستان مسلم لیگ عوام میں مقبول نہیں ہے اور اس کی تشکیل بھی بے ضابطہ اور غیر آئینی ہے۔ اس لئے اسے توڑ دیا جائے"[3]۔ اس سفارش کی بنیاد پر صوبائی لیگ توڑ دی گئی۔

بلوچستان میں مسلم لیگ کو توڑنے کے بعد نئی رکنیت سازی اور از سر نو جماعتی انتخابات کے لئے ایک ایڈہاک کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا[4]۔ اس دوران میں بلوچستان سے ۴۸ لیگی کارکنوں کے ایک وفد نے خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کی اور یہ شکایت کی کہ صوبائی لیگ کو توڑنے سے پہلے انہیں اپنا

---

[1] ڈان کراچی	۲ر جنوری ۱۹۵۲ء
[2] ایضاً	۲ر فروری ۱۹۵۱ء
[3] ایضاً	۷ر فروری ۱۹۵۲ء
[4] ایضاً	۷ر مارچ ۱۹۵۲ء

Marfat.com

نقطۂ نظر پیش کرنے اور اعتراضات کا جواب دینے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔[1]
لیکن اس وفد کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی اور پاکستان مسلم لیگ کے
صدر خواجہ ناظم الدین نے اکتوبر ۱۹۵۲ میں ۳ ارکان پر مشتمل ایڈہاک کمیٹی
قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کمیٹی کے قیام کے فیصلے کو بلوچستان کے
ہر مکتب فکر نے سراہا۔[2]

---

[1] ڈان کراچی ۲۱ مارچ ۱۹۵۲ء

[2] ایضاً ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۲ء

Marfat.com

باب ۵

مسلم لیگ کا دورِ حکومت

پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آیا اور پہلی دستور ساز اسمبلی ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو توڑ دی گئی تھی۔ ان دونوں تاریخوں کے درمیانی دور کو بالعموم مسلم لیگ کا کامیاب و خوشگوار زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس دوران میں مسلم لیگ ہی واحد پارٹی تھی جو مرکز اور صوبوں میں بلا شرکت غیرے برسر اقتدار رہی[1]۔ یہ کوئی عجیب اور ناقابل فہم بات نہ

---

[1] مشرقی بنگال میں بہت مختصر عرصہ سے قطع نظر اکتوبر ۱۹۵۵ء تک مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں صرف مسلم لیگی ہی شامل ہوتے تھے۔ اس وقت قانون کے تحت مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں رکنیت بیک وقت اختیار کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ بیس کے قریب سرکردہ مسلم لیگی لیڈر مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے اور وہی اہم اور سرکاری فیصلے کرتے تھے۔ انہی میں سے مرکزی اور صوبائی وزیر اور گورنر لئے جاتے تھے اور وہ سارے ملک کے سیاسی منظر پر چھائے ہوئے تھے۔ کیتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) صفحات ۲۵، ۲۶، ۳۳، ۶۱

Marfat.com

تھی۔ تاریخی اعتبار سے مسلم لیگ کی عمر پاکستان سے کہیں زیادہ تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے قیامِ پاکستان کے لیے جدوجہد کی اور تمام مخالفین کانگرس برطانوی سامراج اور قوم پرست مسلمانوں کے خلاف چومکھی لڑائی لڑی تھی۔ قانون آزادی ہند سے بہت عرصہ قبل مسلم لیگ نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ مسلمانانِ ہند ایک علیحدہ قوم ہیں اور اپنے لیے ایک علیحدہ مملکت کے حقدار ہیں۔ مسلم لیگ ہی واحد جماعت تھی جو تقسیم سے قبل تمام مسلمانوں کی ترجمانی کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کسی ایسی حکومت کے سیاسی طور پر وفادار نہ ہو سکتے تھے جو غیر ملکی ہو اور جس کا طرزِ عمل بعض پہلوؤں سے معاندانہ بھی ہو۔ ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ کانگرس کی طرف سے عبوری حکومت میں ایک قوم پرست مسلمان کو نامزد کرنے پر اصرار کیا جاتا تھا اور قائدِ اعظم محمد علی جناح اسے تسلیم کرنے پر کسی صورت آمادہ نہ ہوتے تھے۔ آزادی سے قبل مسلمانوں کی باضابطہ اور جائز وفاداری صرف سیاسی تنظیم (مسلم لیگ) اور اس کے مسلّم لیڈر قائدِ اعظم محمد علی جناح تک محدود تھی۔ مسلم لیگ کے صدر قائدِ اعظم بے پایاں قدر و منزلت کے مالک تھے اور پاکستان کے قیام سے بھی بڑا عرصہ قبل انھیں مسلم قوم کا واحد ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جب وائسرائے نے مسلم وزرائے اعلیٰ کو قومی دفاعی کونسل کا رکن بنایا تو قائدِ اعظم نے انھیں اس بنیاد پر مستعفی ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا کہ اس سلسلے میں دعوت نامے مسلم لیگ کی وساطت سے نہیں دیئے گئے تھے جس کے صدر وہ خود تھے[1]

---

[1] رچرڈ سائمنڈز (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۶۴)

Marfat.com

قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ اور اس کے عظیم المرتبت رہنما کے ساتھ عام آبادی کا ربط و تعلق اور زیادہ گہرا اور خوشگوار ہو گیا۔ مسلم لیگ اور اس کے رہنما قائد اعظم اس قدر مقبول اور ہر دلعزیز تھے کہ ان کے خلاف قول و فعل کو بمنزلہ کفر سمجھا جاتا تھا۔ کوئی مسلمان اگر مسلم لیگ کی مخالفت کرتا تو اسے پاکستان کا مخالف اور ملک کا غدار قرار دیا جاتا تھا۔ تقسیم برصغیر کو غلط قرار دینے یا ۱۹۴۷ء کے واقعات پر اظہارِ افسوس کو عدم وفاداری کے مترادف سمجھا جاتا تھا اور ۱۹۵۰ء میں ضابطہ تعزیرات میں ترمیم کے تحت اسے جرم قرار دے دیا گیا تھا۔[1] قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل اور دستور ساز اسمبلی کے صدر مقرر ہوئے۔ عام لوگ دل و جان سے ان کا احترام کرتے تھے اور وہ مملکت پاکستان کا مظہر و پیکر سمجھے جاتے تھے۔ جب اور جہاں کہیں وہ تشریف لے جاتے لاتعداد لوگ ان کا والہانہ استقبال کرتے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں جب مسلم لیگ بڑی حد تک عزت و احترام سے محروم ہو گئی تھی اور مشرقی پاکستان میں شکست فاش سے دو چار ہو چکی تو بھی پرانے اور مخلص مسلم لیگیوں کو اپنی اس جماعت کی جگہ کوئی دوسری تنظیم قابلِ قبول نہ تھی۔ ۱۹۵۴ء کے یوم آزادی کے موقع پر قائداعظم کی بہن مس فاطمہ جناح نے اپنے پیغام میں کہا تھا:-

"میں آپ پر زور دیتی ہوں کہ مسلم لیگ کی حمایت و امداد کریں کیونکہ صرف مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کیا تھا اور یہی جماعت پاکستان کے تحفظ و استحکام کا فرض ادا کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ بے عیب نہ ہو لیکن مسلمانوں کی یہی واحد تنظیم ہے اور دوسری جماعتیں

---

[1] کینتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۵۴

Marfat.com

نوزائیدہ ہیں۔ اس لیے مسلم لیگ کی مخالفت کرنے کے بجائے اس میں شامل ہو کر اس کی خامیاں اور عیوب دور کریں۔ اگر آپ مسلم لیگ کو تباہ و برباد کریں گے تو آپ پاکستان کو تباہ و برباد کریں گے[1]

بعض دوسرے پرانے اور آزمودہ کار سیاسی لیڈر اس سلسلے میں مس فاطمہ جناح سے بھی زیادہ پُر زور لب و لہجہ سے کام لے کر مسلم لیگ اور تقسیم یعنی قیام پاکستان کو ہم معنی الفاظ قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلم لیگ کا درجہ پارلیمنٹ سے اعلیٰ اور مملکت کے برابر تھا۔

اکتوبر ۱۹۵۰ء میں پاکستان مسلم لیگ کونسل سے خطاب کرتے ہوئے لیاقت علی خاں نے کہا:۔

"اس ایوان مسلم لیگ کی کونسل کو اب پارلیمنٹ سے زیادہ وزن حاصل ہے اور یہاں زبان سے نکلنے والا ہر لفظ اس کے شایان شان اور درجہ ذمہ داری کے مطابق ہونا چاہیئے۔

میں نے ہمیشہ کہا ہے بلکہ ہمیشہ سے یہ میرا پختہ عقیدہ رہا ہے کہ مسلم لیگ کا وجود اور اس کا استحکام پاکستان کے وجود اور استحکام کے مترادف ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے اور میں آج یہاں اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کا وزیر اعظم سمجھا ہے جسے دستور ساز اسمبلی کے ارکان نے چنا ہے۔

جس دن میں یہ محسوس کروں گا کہ مسلم لیگ کو مجھ پر اعتبار و اعتماد نہیں رہا اس دن سے آپ لیاقت علی خاں کو پاکستان کا

---

[1] پاکستان سٹینڈرڈ۔ آزادی نمبر ۱۴ راگست ۱۹۵۴ء

وزیرِ اعظم نہیں پائیں گے۔[۱]

اس سلسلے میں قائدِ اعظم کی ایک تقریر کا حوالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا:

"اگر آپ پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ پاکستان کی تعمیرِ نو اور استحکام کے خواہاں ہیں تو پھر میرے نزدیک ہر مسلمان کے لیے ایماندارانہ طریقہ یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق پاکستان کی خدمت کرے۔ جو بھی خود رو پارٹیاں اس وقت جنم لے رہی ہیں ان پہ شک و شبہ کیا جائے گا۔ ہر مسلمان کو مسلم لیگ کے پرچم تلے آجانا چاہیئے کیونکہ یہی جماعت پاکستان کی حقیقی محافظ ہے۔"[۲]

مسلمانانِ ہند و پاک میں مسلم لیگ کی اتنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے

---

[۱] لیاقت علی خاں کا یہ بیان ۱۹۵۵ء میں چودھری محمد علی (جو اس وقت وزیرِ اعظم تھے) کے رویّہ سے نمایاں طور پہ مختلف ہے۔ اس زمانہ میں مسلم لیگ اپنی سابق شان و شوکت اور ساکھ سے محروم ہو چکی تھی۔ چودھری محمد علی نے کہا: "میں یہ بات واضح کر دینی چاہتا ہوں کہ وزیرِ اعظم کے طور پہ میں جو بھی قدم اٹھاتا ہوں، اس کے لیے میں کسی سیاسی پارٹی کی قرارداد کا پابند نہیں ہوتا۔ میں وہی اقدام کرتا ہوں جو آئین کے تحت درست اور مناسب ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے میں کابینہ اور پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوں۔" لیاقت علی خاں کی تقریر کے لیے "ڈان" ۹ اکتوبر ۱۹۵۰ء ملاحظہ کریں علاوہ ازیں دیکھیں ایم رفیق افضل (بحوالہ سابقہ) صفحہ نمبر ۷۳ - چودھری محمد علی کی تقریر کے لیے "پاکستان آبزرور" ۱۵ مئی ۱۹۵۶ء، دیکھیں۔

[۲] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۶۴ء - اشاعتِ خاص بہ سلسلہ یومِ پاکستان ص ۲

Marfat.com

دو بڑے محرک تھے ایک سیاسی اور دوسرا مذہبی۔ سیاسی میدان میں مسلم لیگ ہی واحد مضبوط و منظم جماعت تھی جس نے تقسیم سے پہلے آل انڈیا کانگرس کے مقابل قیامِ پاکستان کے لیے جنگ لڑی تھی۔ اس جماعت کے ذریعے مسلمانانِ ہند نے اپنے عزائم اور امنگوں کا اظہار کیا اور اس کی وساطت سے اپنی شکایات و تکالیف کا ازالہ چاہا۔ مسلم لیگ پر اعتماد اور یقین کو مذہبی بنیادوں پر بھی استحکام نصیب ہوا۔ برِصغیر میں مسلمانوں کی کئی اور پارٹیاں بھی تھیں لیکن ان میں سے صرف مسلم لیگ کو یہ منفرد شرف حاصل ہوا کہ اسلامی مملکت کا جو نعرہ اس کے پلیٹ فارم سے بلند ہوا صرف اُسی کو کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ "اسلام" کا لفظ ہی تھا جس نے ہند کے مسلمانوں کو اتحاد کے جذبے سے سرشار کر دیا اور ہند کے ان حصوں کے مسلمان بھی مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے تن من دھن سے کوشاں ہو گئے جو کسی صورت پاکستان میں شامل نہ ہو سکتے تھے۔ برِصغیر کے ہر حصّے کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہو کر صرف سات سال کے مختصر عرصے میں برطانیہ اور ہندوؤں سے اپنا حق خود اختیاری منوا لیا۔

جن دوسری چھوٹی پارٹیوں نے تصورِ پاکستان کی مخالفت اور مزاحمت کی تھی قیامِ پاکستان کے بعد ان کا شیرازہ بکھر گیا لیکن مسلم لیگ نہ صرف شاندار ماضی کی مالک تھی بلکہ اس کا نام بھی سحر آگیں تھا۔ مزید برآں صرف مسلم لیگ ہی واحد جماعت تھی جسے ۱۹۵۴ء تک مشرقی پاکستان میں اور کچھ پسپائی کے ساتھ ۱۹۵۶ء تک مغربی پاکستان میں حکومت و اقتدار میں اجارہ داری حاصل رہی۔

تقسیم کے نتائج و عواقب

۱۹۴۷ء میں شاندار کامیابی کے اس پس منظر میں مسلم لیگ ایک اپوزیشن پارٹی کے بجائے پہلی مرتبہ حکمران جماعت کے طور پر ظہور پذیر ہوئی۔ ماضی میں

Marfat.com

اس کی شاندار اور ٹھوس کارکردگی کے پیش نظر مسلم لیگ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ برسراقتدار آنے کے بعد معاشرتی انصاف اور اسلامی اخوت کا ایک نیا دور شروع کرے گی اور نئی مملکت کو خوش حالی اور استحکام سے بہرہ ور کرے گی۔ لیکن تقسیم برصغیر کے بعد پے در پے کئی ایسے واقعات اور ناسازگار حالات پیش آئے جو لوگوں کی امیدوں اور امنگوں پر اوس ڈال گئے اب انھیں یہ معلوم ہوا کہ قیام پاکستان سے سارے مسائل حل نہیں ہوئے بلکہ پاکستان کا قیام زندہ رہنے کے لیے ایک طویل اور سخت جدوجہد کا نقطۂ آغاز ہے۔ بعد کے برسوں میں ایک کے بعد دوسرا واقعہ روزافزوں پریشانی میں اضافے کا موجب بنا۔ تقسیم کے فوراً بعد پاکستان کو جن مسائل و مصائب سے دوچار ہونا پڑا وہ انتہائی حوصلہ شکن اور زہرہ گداز تھے۔ تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کی جدوجہد قیام پاکستان کے لیے تھی لیکن جب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تو پھر اسے پاکستان کے تحفظ و بقا کے لیے پہلے سے بھی زیادہ سخت جدوجہد کرنی پڑی۔

آزادی کے بعد نئی مملکت کو پیش آنے والے مسائل بے انتہا مشکل تھے۔ اس صورت حال کے اسباب بڑے واضح تھے۔ پاکستان نے ہمہ جہتی انتشار و خلفشار کے ماحول میں جنم لیا تھا۔ اس کے معرض وجود میں آنے سے پہلے ہی غیر منقسم ہند میں ہیئت حاکمہ کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ آزادی کی ساعت قریب آنے کے ساتھ برطانوی حکومت اور اس کے مطیع فرمان اداروں کا کنٹرول بہت کمزور ہو گیا تھا۔ نئی سرحدوں کے اعلان سے قبل ہی امن و امان کے بجائے قتل و غارت لوٹ مار اور آتش زنی کا دور دورہ شروع ہو گیا اور دونوں مملکتوں کے وسیع و عریض حصوں میں لاکھوں کروڑوں لوگوں

Marfat.com

کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ تقسیم کے فوراً بعد چند ہفتوں میں حالات مزید ابتر ہو گئے اور امن و عافیت کا دائرہ مسلح افواج کے دستوں کی گولیوں کی مار تک محدود ہو کر رہ گیا۔ نئے بھارت کو بھی عبوری دور میں نقصان سے دوچار ہونا پڑا لیکن پاکستان میں چونکہ ہر معاملہ بالکل ابتداء ہی سے شروع ہوا اس لیے وہ مکمل تباہی اور شکست و ریخت کے عین کنارے پر پہنچ گیا۔ پاکستان کے حصے میں وفاقی دارالحکومت نہ آیا تھا اور اس کی کابینہ نے بھی کام شروع نہیں کیا تھا۔ کسی قانون ساز ادارے یا اسمبلی کا وجود نہ تھا اور وفاقی عدالت بھی نہ تھی حتیٰ کہ مرکزی خزانہ بھی نہ تھا اور اس کے حصے کے نقد اثاثہ جات کو بھارت نے ابھی منتقل نہیں کیا تھا۔ دفاع کے لیے مسلح افواج کی ضرورت تھی لیکن پاکستان کے حصے میں جو فوجی دستے آئے وہ برصغیر کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے تھے یا جنگ عظیم دوم کے بعد دور دراز برطانوی مقبوضات میں مامور تھے۔ اس کے برعکس بھارت بڑی حد تک ایک متحدہ مملکت تھا اس کی وفاقی حکومت سارے لوازمات کے ساتھ موجود تھی، جبکہ پاکستان کے صرف معدودے چند اور مختصر حصوں میں نسبتاً امن و سکون تھا۔ تقسیم سے قبل سندھ کے سوا کسی بھی مسلم اکثریتی علاقے میں پاکستان کی حامی صوبائی حکومت تک موجود نہ تھی۔ تمام بڑے بڑے کاروباری اور صنعتی مراکز مثلاً کلکتہ، بمبئی، مدراس، کانپور، احمد آباد، بھارت کے علاقوں میں واقع تھے۔ پاکستان نے اس معاملے میں محرومی سے آغاز کار کیا۔ پاکستان میں نقل و حمل، بنکاری اور تمام اقتصادی ڈھانچہ تہس نہس ہو چکا تھا۔ نئی مملکت کے لیے راتوں رات ایک نئے اقتصادی نظام کو معرض وجود میں لانے اور اسے نافذ کرنے کی ضرورت تھی۔ اثاثوں اور واجبات

Marfat.com

کی تقسیم کے سلسلے میں بھی پاکستان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ علاوہ ازیں اس کے حصے میں برِصغیر کے بڑے پس ماندہ علاقے آئے تھے جو نہ صرف صنعت وحرفت سے تقریباً محروم تھے بلکہ ان کی آبادی بھی تعلیم اور ہنر وفن میں بڑی حد تک پس ماندہ تھی۔ مزید برآں عام سلسلۂ مواصلات منقطع ہو چکا تھا۔ تجارت و کاروبار کی تمام تر مشینری بھارت کے حصہ بننے والے علاقوں کی مرہونِ منت تھی اب اس کی از سرِ نو تشکیل اور اسے نئی سیاسی سرحدوں کی ضروریات کے مطابق بنانے کی ضرورت تھی۔ پاکستان تمام اہم مصنوعات میں غیر کفیل تھا۔ ذرائع و وسائل اور بجلی کی پیداوار نہ حد ناکافی تھی۔ ان سخت نامساعد حالات میں پاکستان کی بقا ایک عظیم الشان کارنامہ تھا۔ یہ مشکلات اس قدر ہمت شکن تھیں کہ کانگرسی لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ پاکستان چند ہفتے یا زیادہ سے زیادہ چند ماہ تک زندہ رہ سکے گا اور جن مسلمانوں نے مسلم لیگ کے پرچم تلے "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے لگائے تھے وہ بہت جلد مشکلات سے عاجز آکر بھارت میں دوبارہ شامل ہونے کے لیے منت سماجت کریں گے۔[1]

مہاجرین کا مسئلہ

قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند برسوں میں اس نوزائیدہ مملکت کو جن سنگین اور مہیب مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان میں سب سے زیادہ تشویشناک مہاجرین کا مسئلہ تھا۔ پاکستان اور بھارت دونوں میں لاکھوں افراد کو اپنے آبائی گھر چھوڑنے پڑے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے ساتھ اگر لاکھوں غیر مسلم ترکِ وطن کر کے بھارت چلے گئے تو ان سے کہیں زیادہ لٹے پٹے مسلمان بھارت کے مختلف حصوں سے قافلوں کی صورت میں پناہ لینے کے لیے پاکستان میں آنے لگے۔ دوطرفہ

---

[1] کانگرسی لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ پاکستان معاشی طور پر زندہ نہیں رہ سکے گا لیکن آخر کار یہ پتہ چلا کہ پاکستان کی اصل ٹریجڈی سیاسی لیڈر شپ کا قحط ہے نہ کہ معاشی مشکلات۔

Marfat.com

آمد و رفت کا یہ سلسلہ اس نئی مملکت کی سرحدوں کے سرکاری اعلان سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ پاکستان میں تباہ حال مہاجرین کی آمد کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ ان میں سے اکثر صرف تن کے کپڑوں میں پیدل آئے۔ بعض نے ریل گاڑیوں سے لے کر بیل گاڑیوں تک ہر ممکن سواری کے ذریعے اس نئی مملکت کی سرحدوں تک کا سفر کیا تھا۔ راستے میں ان پر حملے ہوئے اور وہ بہیمانہ قتل و غارت اور سنگدلانہ لوٹ مار کا شکار ہوئے۔ آج تک پاکستان آتے ہوئے شہادت کا جام نوش کرنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی لیکن عام اندازے کے مطابق تقسیم کے بعد ابتدائی چند ماہ میں سوا کروڑ کے لگ بھگ لوگ اپنے آبائی گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔[1] وہ اپنے ساتھ ناقابلِ یقین ظلم و ستم اور وحشیانہ سلوک کی لرزہ انگیز داستانیں لے کر آئے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں کو موت کے گھاٹ اترتے اور اپنی بہنوں اور ماؤں کو اغوا ہوتے دیکھا تھا۔[2] یہ وحشت اثر مناظر ان کے لیے ناقابلِ فراموش تھے۔ ان کے سینوں میں بدلہ اور انتقام کی آگ روشن تھی جس کی تپش سے دونوں نو آزاد مملکتوں میں باہمی نفرت کی آگ بھڑک اٹھی، اور تلخی اور کشیدگی نے اتنی وسعت اور شدت اختیار کر لی کہ دونوں ملکوں میں کسی بھی وقت کھلی جنگ بعید از امکان معلوم نہیں ہوتی تھی۔[3]

پاکستان کو نئی حد بندیوں کی وجہ سے علاقائی تبدیلیوں اور اقتصادی اکھاڑ پچھاڑ کے باعث جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ان کا ہر پہلو پریشان کن

---

[1] وچرد ھائمنڈز (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۸۳ [2] اس ضمن میں مثال کے طور پر دیکھیے آزادی کے چراغ از مشکور حسین یاد مطبوعہ ادارہ اردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور [3] کیتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۱۵

Marfat.com

اور مہیب تھا، لیکن لاکھوں تارکینِ وطن نے انھیں مزید بھیانک بنا دیا۔
تارکینِ وطن کی آمد و رفت کا مسئلہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کے لیے بدرجہا زیادہ مشکل مسائل کا منبع ثابت ہوا۔ غیر مسلموں کے انخلاء سے پاکستان نہ صرف بڑے وسیع پیمانے پر آبادی کے اکھاڑ پچھاڑ سے دوچار ہوا بلکہ نئی مملکت کی انتظامیہ بھی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ غیر مسلموں کی جگہ بھارت کے مختلف علاقوں سے جو مسلمان اہل کار آئے وہ انتظامیہ کا کما حقہ تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ اس طرح انتظامیہ کو نہ صرف ناقابلِ بیان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بلکہ لاکھوں مہاجرین کی آمد کے ساتھ ان کی دیکھ بھال، کیمپوں میں قیام اور عارضی آبادکاری کے انتظام کے بے حد کٹھن کام کے علاوہ امن و امان برقرار رکھنے کی حوصلہ شکن آزمائش سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ یہ تمام مسائل بے حد مشکل ہی نہ تھے، فقید المثال تھے۔ ان سے ایک ایسی انتظامیہ کو عہدہ برآ ہونا پڑا جس کے نہ صرف وسائل بڑے محدود اور مسائل لامحدود تھے بلکہ وہ ابھی تک پوری طرح منظم بھی نہیں ہو سکی تھی۔ بہر حال تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود قلیل المیعاد منصوبے کے تحت مہاجرین کے لیے خوراک، لباس قیام اور طبی امداد کا انتظام کیا گیا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں مہاجرین کے لیے جہاں بھی اور جیسے بھی ممکن تھے عارضی کیمپ قائم کیے گئے۔ جن میں سرکاری ملازمین کے ساتھ مسلم لیگ کے رضاکاروں نے بھی شبانہ روز کام کیا۔ مہاجرین کی آمد کا سلسلہ بڑی تعداد میں جاری تھا کہ حکومت نے لٹے پٹے اور خستہ حال مہاجرین کی مستقل آبادکاری کے طویل المیعاد منصوبے پر بھی عمل درآمد شروع کر دیا۔ تاریخ انسانی میں اتنی بڑی تعداد میں ترکِ وطن اور اتنے وسیع پیمانہ پر تبادلِ آبادکاری کے انتظام کی مثال نہیں ملتی۔ آبادکاری کا انتظام صرف بے خانماں

Marfat.com

کنبوں تک محدود نہ تھا۔ ایسے ہزاروں مردوں عورتوں اور بچوں کا مسئلہ بھی فوری طور پر توجہ طلب تھا جو اپنے آبائی گھروں سے بے سروسامانی کی حالت میں نکلے ان کے گھر والے اور سرپرست بے رحمانہ قتل و غارت کا نشانہ بن گئے۔ وہ پاکستان پہنچنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن وہ کسی کو بھی اپنا نہ کہہ سکتے تھے۔ مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ اتنا وسیع اور سنگین تھا کہ ان کی آبادکاری میں جو خامیاں رہ گئیں یا کوتاہیاں ہوئیں ان کی تمام تر ذمہ داری صرف حکومت پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ نئی حکومت کے وسائل بڑے محدود تھے اور اس زمانے میں غیر ملکی امداد کی اصطلاح ابھی وضع نہ ہوئی تھی۔ مزید برآں مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری بلکہ لامتناہی تھا۔ چنانچہ ان کی دیکھ بھال کے لیے جو بھی انتظام کیا جاتا تھا مزید ہزاروں مہاجرین کی آمد کے باعث ناکافی ثابت ہوتا تھا۔ پاکستان سے تو غیر مسلم آبادی کا انخلا چند ماہ کے اندر مکمل ہو گیا لیکن بھارت کے کئی صوبوں اور اضلاع میں مسلم کش فسادات کا سلسلہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ ابھی بھارتی پنجاب اور ملحقہ علاقوں سے مہاجرین کی آمد ختم نہیں ہوئی تھی کہ کشمیر میں بھارتی فوجوں کے داخلے سے لاکھوں مہاجرین کی آمد کا ایک نیا محاذ کھل گیا۔ دوسری طرف یوپی، سی پی، بمبئی کا ٹھیاواڑ الغرض بھارت کے ہر حصے اور کونے سے ستم رسیدہ مہاجرین پاکستان آتے رہے۔ اتنے زیادہ بلکہ لاتعداد مہاجرین از خود ایک بہت بڑا مسئلہ اور انتظامیہ کے لیے چیلنج تھے۔ جب تک انھیں کوئی ٹھکانا نہ مل جاتا تھا وہ ایک سے دوسری جگہ کے لیے پابہ سفر رہتے تھے۔ ان میں اکثریت بالکل تہی دست تھی اس لیے سفر کے دوران میں ٹکٹ بھی خرید نہ سکتے تھے اور جو آسودہ حال تھے وہ اپنے آپ کو سرکاری مہمان سمجھ کر ٹکٹ خریدنا مناسب نہ سمجھتے

Marfat.com

تھے۔ پاکستان کے لیے جدوجہد مسلم لیگ نے کی تھی اور عامۃ المسلمین نے "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" پر لبیک کہتے ہوئے مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے اس لیے انہیں بجا طور پر یہ توقع تھی کہ پاکستان میں ان کی آبادکاری مسلم لیگ کا فرض ہے۔ سرکاری خزانے سے مہاجرین کی خوراک قیام اور سفر کے سلسلے میں خطیر رقوم صرف کی گئیں اور یہ اسی بار گراں کا نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد پنجاب کے پہلے بجٹ میں پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ روپے کا خسارہ تھا۔ اس میں سے ۳ کروڑ ۷۲ لاکھ روپے صرف اگست ۱۹۴۷ء سے مارچ ۱۹۴۸ء تک مہاجرین پر صرف کیے گئے تھے۔ [۵]

پاکستان کے طول و عرض میں مسلم لیگ کے رضا کاروں نے سرحد عبور کرنے والے مہاجرین کی پیشوائی اور پھر کیمپوں میں ان کی دیکھ بھال کے سلسلے میں قابلِ تعریف خدمات سرانجام دیں۔ رضا کاروں کے ساتھ طالب علم اور سماجی کارکن بھی دن رات کام کرتے رہے لیکن یہ کام اتنا وسیع تھا کہ صرف مسلم لیگ کے کارکن یا دوسرے ادارے لاتعداد مہاجرین کی آبادکاری کے جملہ تقاضوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے تھے۔ بہرحال یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مہاجرین کی امداد اور دیکھ بھال کے سلسلے میں مسلم لیگ کے کارکنوں اور رضا کاروں نے حکومت کا پورا پورا ہاتھ بٹایا۔ صوبائی انتظامیہ نے بھی مہاجرین کی بحالی اور آبادکاری کو سرفہرست فرض سمجھ کر سرانجام دیا۔ اور آج اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد جب اس پر آشوب زمانے کے حالات کا تصور کیا جاتا ہے تو بعض خامیوں اور نقائص کے باوجود بہت تھوڑے

---

[۵] مغربی پنجاب اسمبلی کی کارروائی۔ جلد اول صفحہ ۲۵

Marfat.com

عرصہ میں بڑے محدود وسائل کے باوجود مہاجرین کی آباد کاری کے سلسلے میں جو کام ہوا وہ بہت بڑا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائی دور میں صرف مغربی پنجاب اور مشرقی پاکستان نے ہی مہاجرین کا تمامتر بار برداشت کیا تھا لیکن بعد میں مرکزی حکومت کی ہدایات پر دوسرے صوبوں نے بھی مہاجرین کی آباد کاری میں کچھ حصّہ لیا۔ خاص طور پر سندھ میں بڑی تعداد میں مہاجرین کی آباد کاری کے لیے گنجائش نکالی گئی۔

حکومت کی پوری امداد اور رضا کاروں کی گراں قدر خدمات کے باوجود مہاجرین کی آباد کاری کے کام کی رفتار پوری طرح تسلی بخش نہ تھی۔ چنانچہ مہاجر کیمپوں میں حالت زار اور مہاجرین کی دیکھ بھال میں غفلت پر مختلف حلقے انتظامیہ پر سخت نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ اس اہم انسانی کام میں ایک مشکل اور رکاوٹ مہاجرین کا اپنا طرزِ عمل بھی تھا جو اپنی مجبوریوں اور بعض صورتوں میں خود غرضی کے تحت کسی قسم کے نظم و ضبط کو ملحوظ رکھنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے اور جب بعض سیاسی لیڈروں نے بھی مہاجرین کو اپنے ذاتی مفاد میں استعمال کرنے سے گریز نہ کیا تو حکومت کے لیے مشکلات میں اضافہ ہو گیا جس سے صورت حال بہتر بنانے میں کوئی مدد نہ ملی۔

مہاجرین کی آباد کاری کی ذمہ داری محکمہ بحالیات کو سونپ تو دی گئی لیکن اس محکمہ کی راہنمائی کے لیے کوئی ٹھوس پروگرام اور واضح پالیسی بنانے کا فرض کماحقہ ادا نہ کیا گیا۔

اس موقع سے اکثر لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور غلط کلیم بھر دیئے بعد میں ان کو منظور کرانے کے لیے رشوت کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ صحیح کلیم منظور کرانے کے لیے بھی مقررہ رشوت دینا پڑتی تھی۔

Marfat.com

اس طرح محکمہ آباد کاری نے سب سے پہلے پاکستان میں رشوت ستانی کا بازار گرم کیا۔ اس محکمے کے ہاتھوں اَن گنت بے انصافیاں ہوئیں۔ کتنے ہی لوگ کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے اور بہت سے غلط الاٹمنٹیں کروا کر رئیس زادے بن بیٹھے۔ محکمہ بحالیات نے رشوت کو رواج دے کر نہ صرف پاکستان کی انتظامی مشینری کو کمزور کر دیا بلکہ پاکستان کے تصور کو بھی بے حد نقصان پہنچایا اور عوام میں مایوسی پھیلائی۔

اس سلسلے میں حکومت بھی ایک بڑی مشکل سے دوچار تھی۔ کیونکہ بھارت کے مختلف حصوں میں مسلم کش فسادات کا سلسلہ تھمنے میں نہ آتا تھا اور بھارتی حکومت اس پالیسی پر کاربند نظر آتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو پاکستان میں زبردستی دھکیل کر اس نئی مملکت کے لیے ایک لاینحل مسئلہ پیدا کر دیا جائے چنانچہ صرف دو ماہ کے اندر پاکستان میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ مہاجرین پناہ لینے کے لیے پہنچے۔

پنجاب میں پہلی وزارت نواب افتخار حسین ممدوٹ نے بنائی تھی۔ اگرچہ اس صوبے کو مہاجرین کے سلسلہ میں سب سے زیادہ زیر بار ہونا پڑا۔ پھر بھی مہاجرین کے مسئلے سے پوری طرح آگاہ و باخبر نہ ہونے کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ ابتداء میں ممدوٹ وزارت میں کوئی باقاعدہ وزیر مہاجرین نہ تھا۔ اس کابینہ کے بیشتر ارکان نے پہلی مرتبہ وزارتی ذمہ داری سنبھالی تھی چنانچہ پرانے سیاستدان اور مسلم لیگی بھی ممدوٹ وزارت کو "سکول کے ناتجربہ کار بچوں کی ٹیم" قرار دیتے تھے بعد میں مہاجرین کے لیے علیحدہ وزارت قائم کی گئی۔ میاں افتخار الدین نے ۱۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پہلے وزیر مہاجرین کے طور پر حلف اٹھایا اور انھوں نے صرف ایک ماہ کے اندر صوبے کے مختلف اضلاع میں ۴۶۱۰۰۰

مہاجرین کی آباد کاری کا انتظام کیا[1] لیکن ان کا عرصہ وزارت بہت مختصر تھا۔ مہاجرین کی آباد کاری کے لیے وہ جن خطوط پر پالیسی وضع کرنا چاہتے تھے چونکہ ان کے ساتھی اس سے متفق نہ تھے اس لیے میاں افتخارالدین کو بہت جلد مستعفی ہونا پڑا۔

مہاجرین کی مستقل آباد کاری میں ان کی طرف سے مبالغہ آمیز دعاوی پیش کئے جانے سے بھی بڑا مشکل مسئلہ ہو گیا۔ لاکھوں مہاجرین جو اس نوزائیدہ مملکت میں آئے تھے وہ اپنے پیچھے اراضی مکانات صنعتی و کاروباری املاک باغات وغیرہ چھوڑ کر آئے تھے لیکن جب ان کے لیے دعاوی پیش کیے گئے تو ایسے مہاجرین کی کمی نہ تھی جنھوں نے اپنی متروکہ املاک کے معاملے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا اور اکثر اوقات مرجانے والوں کی جگہ دوسرے لوگوں نے دعاوی داخل کر دیئے۔ بہت سے یکسر بے بنیاد اور جھوٹے دعاوی بھی داخل کر دیئے گئے اور ان کی سو فی صد پڑتال اور تحقیقات ممکن نہ تھی۔ بعد میں جب حکومت نے غلط اور مبالغہ آمیز دعاوی سے حاصل کی گئی اراضی کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی قائم کی تو پنجاب میں ناجائز قابضین سے ۱۸۰۰۰۰ ایکڑ اراضی بازیاب ہوئی[2] مزید برآں متروکہ املاک کی تقسیم کا کام جن افسروں اور اہلکاروں کے سپرد ہوا وہ بھی حرص کا شکار ہو گئے اور محکمہ بحالیات بدعنوانی اور رشوت ستانی کے باعث بڑا بدنام ہو گیا۔ بیسیوں ماتحت اہلکاروں کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی لیکن متروکہ املاک نے بدعنوانی اور

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۱۹ راکتوبر ۱۹۴۷ء

[2] تنویر احمد (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۸۴ حاشیہ نمبر ۷۷

Marfat.com

لوٹ کھسوٹ کا اتنا وسیع موقع پیدا کر دیا تھا کہ افسروں اور اہلکاروں کے علاوہ اکثر وبیشتر سیاستدان بھی اس میں ملوث ہو گئے۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے شوق نے وبا کی صورت اختیار کر لی اور جب پنجاب میں گورنر راج قائم ہوا تو نواب ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ پر یہ الزامات بھی عاید ہوئے کہ انھوں نے خود اور اپنے رشتہ داروں کے لیے متروکہ املاک سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے[1]

زرعی اصلاحات

مسلم لیگ کو اپنے دورِ حکومت میں اتنے مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ اصلاحات کی جانب خاطر خواہ توجہ نہ دے سکی۔ آغاز میں مہاجرین کی آبادکاری، معاشی نظام کا قیام، ملک وقوم کو مستحکم بنانے کا مسئلہ، اندرونی سازشیں اور مسئلہ کشمیر جیسے اہم مسائل حکومت کی توجہ کا مرکز رہے اس لیے اصلاحات کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا لیکن جب اصلاحات کے نفاذ کا وقت آیا تو قائداعظم رحلت فرما چکے تھے اور ان کے جانشین ماسوا چند ایک کے جذبہ حب الوطنی سے عاری ہو چکے تھے اس لیے انھیں اپنی کرسی کے سوا کسی اور شے سے دلچسپی نہ رہی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد یہاں کی معاشیات بنیادی طور پر زرعی تھی آبادی کا بہت بڑا حصّہ زراعت سے متعلق تھا اس لیے زرعی اصلاحات کا مسئلہ بڑی اہمیّت رکھتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں تو زرعی اصلاحات آسانی سے نافذ کر دی گئیں، کیونکہ وہاں ان سے زیادہ تر ہندو متاثر ہوتے تھے[2] لیکن

---

[1] تنویر احمد (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۴۸ حاشیہ نمبر ۷۷

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں گذشتہ باب بعنوان صوبائی سیاست (مشرقی پاکستان)

Marfat.com

مغربی پاکستان میں زرعی اصلاحات اپنی اصل خصوصیات کے ساتھ نافذ نہ کی جا سکیں کیونکہ یہاں کی لیڈر شپ اور صوبائی حکومتیں زیادہ تر زمینداروں پر مشتمل تھیں۔ چنانچہ زرعی اصلاحات کا صوبائی حکومتوں کے ہاتھوں جو حشر ہوا وہ گذشتہ باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔

مسلم لیگ اور اس کے قائدین زرعی اصلاحات کے وعدے کرتے رہے تھے لیکن جب ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا وقت آیا تو لیگ کی قیادت کے لیے وعدے نباہنے مشکل ہو گئے کیونکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ لیگ کی قیادت پر زمیندار قابض ہو گئے تھے اور ان کی سیاسی قوت کا راز عوامی مقبولیت یا اعلیٰ کردار نہیں تھا بلکہ ان کے مزارعین تھے۔ بہت سی نامور سیاسی شخصیتوں کی اپنی ذاتی اراضی اتنی تھی کہ انھیں ووٹ لینے کے لیے عوام کے پاس جانے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑتی تھی۔ وہ سیاست میں محض مہم جوئی کے شوق کی تسکین کے لیے آئے تھے لیکن سیاسی حادثات کی بدولت لیڈر بننے پر مجبور ہو گئے تھے اور اب وہ مجبوری ان کی کمزوری بن چکی تھی اس لیے وہ زرعی اصلاحات نافذ کر کے اپنے مزارعین کی غیر مشروط حمایت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے کیونکہ "خدانخواستہ" یہ محرومی ان کی سیاسی موت کا باعث بھی بن سکتی تھی۔ چنانچہ زرعی اصلاحات کی مخالفت سب سے زیادہ ناعاقبت اندیش زمینداروں نے کی۔ جہاں تک پڑھے لکھے اور باشعور زمینداروں کا تعلق ہے وہ کچھ نہ کچھ زرعی اصلاحات کے حق میں تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس طوفان کو زیادہ دیر تک روکا نہیں جا سکتا

پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جمہوریت کی ناکامی کی بہت بڑی وجہ زمینداری نظام تھا۔ اس نظام

Marfat.com

کی بدولت عوام کے صحیح اور مخلص نمائندے منتخب نہ ہو سکے۔ اس لیے اگر شروع ہی سے زرعی اصلاحات نافذ کر کے زمینداروں کا اثر توڑ دیا جاتا تو شاید پاکستان میں جمہوریت کا مستقبل اتنا تاریک نہ ہوتا۔

زرعی اصلاحات کا مسئلہ ۱۹۴۹ء میں پہلی بار سنجیدگی سے زیر غور آیا۔ ۱۹، ۲۰، ۲۱ فروری ۱۹۴۹ء کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس کراچی میں ہوا جس میں ایک ریزولیشن کے ذریعے ورکنگ کمیٹی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ موجودہ "فرسودہ" اور "نقصان دہ" زرعی نظام کو بدلنے پر غور کرے۔ اس نظام کی بدولت کاشتکاروں اور مزارعین کی زندگی تکلیف دہ بن کر رہ گئی ہے۔ مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ صوبائی مسلم لیگوں کے مشورے سے اسلامی اصولوں کی روشنی میں زرعی اصلاحات کا خاکہ تیار کرے تاکہ معاشرتی تفریق اور تضادات کو ختم کیا جا سکے۔" [1]

مسلم لیگ کونسل کے اس ریزولیشن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۳ اپریل ۱۹۴۹ء کو کراچی میں ہوا جس میں ایک "ریزولیشن کے ذریعے صدر کو زرعی اصلاحات کے لیے کمیٹی بنانے کا اختیار دیا گیا۔" "اس ریزولیشن میں کہا گیا تھا کہ پاکستان بنیادی طور پر زرعی ملک ہے اور یہاں مزارعین کی معاشی، تعلیمی اور سماجی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ کمیٹی ایسے قوانین تجویز کرے جن سے مزارعین کی حالت بہتر بنائی جا سکے۔" [2]

---

[1] ڈان کراچی ۲۰، ۲۱، ۲۲ فروری ۱۹۴۹ء

[2] ایضاً ۴ اپریل ۱۹۴۹ء

Marfat.com

۱۲ر اپریل ۱۹۴۹ء کو صدر مسلم لیگ نے اس مقصد کے لیے زرعی کمیٹی بنائی جس کا کنوینر میاں ممتاز دولتانہ کو نامزد کیا گیا۔ کمیٹی نے زرعی مسائل کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رپورٹ ۱۱ر جولائی ۱۹۴۹ء کو صدر پاکستان مسلم لیگ کے سامنے پیش کی۔

اس رپورٹ میں درج ذیل سفارشات کی گئی تھیں:

۱۔ جاگیروں اور انعامات کو فی الفور منسوخ کر دیا جائے اور اس کے لیے کوئی معاوضہ نہ دیا جائے کیونکہ یہ جاگیریں حکومت برطانیہ کا عطیہ ہیں۔ آزادی کو ہمارے دامن سے یہ داغ دھو دینے چاہئیں۔

۲۔ حکومت برطانیہ کی خدمات کے صلے میں عطا کردہ اراضی فوراً بحق سرکار ضبط کر لی جائیں۔

۳۔ قابض مزارعین Occupancy Tentants زمینداروں کو سالانہ لگان ادا کرتے ہیں۔ ایسی اراضی مزارعین کو دے دی جائیں۔

۴۔ موجودہ صورتِ حال کے مطابق زمیندار جب بھی چاہے مزارع کو نکال سکتا ہے۔ ایسے قوانین بنائے جائیں کہ زمیندار پندرہ سال سے پہلے مزارع کو بے دخل نہ کر سکے۔

۵۔ کوئی زمیندار بھی خود کاشت کے لیے ۲۵ ایکڑ سے زیادہ اراضی نہیں رکھ سکے گا۔

۶۔ زمیندار مزارع سے حکومت کے لگان کے علاوہ کوئی اور فیس یا خدمات نہیں لے گا۔

۷۔ فصل کا ۲/۵ زمیندار لے گا اور باقی مزارع۔ لگان، پانی کا خرچہ وغیرہ زمیندار ادا کرے گا۔

۸۔ مزارعین کے لیے بھی وہ مراعات ہونی چاہئیں جو مزدوروں کے لیے ہوتی

Marfat.com

ہیں۔ مثلاً یہ کہ زمیندار اپنے مزارعین کے لیے رہائشی کوارٹر تعمیر کرے۔ ہفتے میں ۵۶ گھنٹے سے زیادہ کام نہ لے وغیرہ

۹۔ زمینداروں اور مزارعین کے اشتراک سے بے روزگاری الاؤنس، بیمہ اور پنشن وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

۱۰۔ کاشتکاروں اور مزارعین کے لیے صحت اور تعلیمی سہولیات کا انتظام کیا جائے۔

۱۱۔ ۱۵۰ ایکڑ نہری زمین اور ۴۵۰ ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ اراضی زمینداروں سے بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔ ایسی اراضی کے حصول کے لیے حکومت تحقیقی کمیٹی بنائے۔ زمینداروں سے حاصل کی ہوئی اراضی مزارعین کی کواپریٹو سوسائیٹیوں کو دی جائے۔[۱]

کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں بار بار کہا تھا کہ زرعی اصلاحات کے نفاذ کے لیے اس سے بہتر موقع پھر نہیں آئے گا اور زرعی اصلاحات سے کنارہ کشی عوام سے دھوکہ کے مترادف ہے[۲] لیکن اس کے باوجود حکومت پاکستان نے سارے ملک کے لیے زرعی اصلاحات کا کوئی پروگرام تشکیل نہ دیا اور محض صوبوں سے زرعی اصلاحات نافذ کرنے کی سفارش کر دی۔ صوبائی حکومتوں پر بڑے بڑے زمینداروں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے اصلاحات تو نافذ کیں لیکن اپنے مفادات پر آنچ نہ آنے دی۔ نتیجے کے طور پر مزارعین کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مایوسی کے سائے پھیلتے گئے۔ وہ مسلم لیگ

۱: Report of the Agrarian Committee, Appointed by the Working Committee of the Pakistan Muslim League (1949) Pp. 25-41.

۲: ایضاً ص ۴۲۔

Marfat.com

جو کبھی مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن تھی عوام سے دور ہوتی گئی۔ مسلم لیگ نے عوام سے جو وعدے کیے تھے انھیں عملی جامہ پہنانے میں بُری طرح ناکام رہی اور اس کی پوری ذمہ داری لیگ کی قیادت پر تھی۔ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا تو الگ مسلم لیگ عوام کے بنیادی مسائل بھی حل نہ کر سکی، اور جس پارٹی کا رویہ یہ ہو اس کا مستقبل معلوم۔ چند ہی برس میں مسلم لیگ کی اکثریت سمٹ کر اقلیت بن گئی حالانکہ کانگریس آج بھی ہندوستان پر حکمران ہے۔ پاکستان کے مستقبل کے سیاسی لیڈروں کو اپنی تاریخ کے اس ورق سے سبق سیکھنا چاہیے۔

پاکستان میں تشکیل آئین کا مسئلہ

یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ پاکستان میں لاکھوں مہاجرین کی آمد نے ملک کی سیاست اور معاشرتی فضا پر بھی بہت گہرا اور وسیع اثر ڈالا۔ جو دوسری بات ابتدا میں ہی پاکستان کی قومی زندگی کے لیے انتہائی پریشان کن اور بالآخر مہلک ثابت ہوئی وہ آئین کی ترتیب و تدوین میں تاخیر تھی۔ قیام پاکستان کے وقت ملک کا اپنا کوئی آئین نہ تھا۔ قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کی دفعہ ۸ اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو بعض ترامیم کے ساتھ عبوری آئین کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ یہ محض کاروبار مملکت جاری رکھنے کا انتظام تھا اس لیے تمام تقاضے پورے کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ ملک کے لیے ایک نیا آئین مرتب کرنے کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس اسمبلی کا اولین اجلاس پاکستان کے یوم آزادی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے چار دن پہلے ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں ہوا۔ اس اسمبلی کو دو گونہ فرائض سپرد کیے گئے تھے۔ اسے ملک کے لیے آئین تیار کرنا تھا اور جب تک اس کا مرتبہ آئین نافذ نہیں ہوتا اسے وفاقی

Marfat.com

پارلیمنٹ یعنی مرکزی مجلس قانون ساز کے طور پر بھی کام کرنا تھا۔

آزادی کے بعد پہلا سال انتظامی ڈھانچے کو وجود میں لانے کی مساعی کی نذر ہو گیا۔ پھر بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو وفات پا گئے اور اس طرح پاکستانی قوم آزادی کی پہلی سالگرہ کے فوراً بعد یتیم ہو گئی۔ آئین بنانے کی ساری ذمہ داری وزیراعظم لیاقت علی خاں کے کندھوں پر آن پڑی۔ نہایت سازگار حالات میں بھی آئین کی ترتیب و تدوین ایک مشکل اور کٹھن کام ہوتا ہے کیونکہ نظریہ و ضمیر، مذہبی و صوبائی نمائندگی لسانی اور نسلی اختلافات سدِ راہ بن جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات دوسرے ملکوں کی آئین سازی کی تاریخ کے مطالعہ سے بھی ثابت ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پاکستان میں آئین سازی کا کام بے انتہا سست رفتاری سے ہوا اور پاکستان نے دستور بنانے میں دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ وقت لیا۔

باشعور لوگوں کے لیے یہ احساس انتہائی کربناک ہے کہ پچیس سال گذر جانے کے بعد بھی پاکستان مستقل دستور سے محروم ہے۔ دستور سازی کا موزوں ترین وقت پاکستان کے پہلے چند سال تھے اور یہ عرصہ گذر جانے کے بعد یہ دستوری مسائل روز بروز پیچیدہ اور مشکل تر ہوتے چلے گئے حتّٰی کہ انہی مسائل کی بدولت پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان اس قدر تلخی اور ناخوشگواری پیدا ہو گئی کہ بالآخر مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے الگ ہو گیا۔ کاش! دستور سازی کی چھوٹی چھوٹی شقوں پر اڑ جانے والے سیاسی لیڈروں کو یہ احساس ہوتا کہ پاکستان کو اس تاخیر کی کس قدر بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

Marfat.com

آزادی کے بعد پہلے چند برسوں کی تاریخ کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں آئین ساز اوّل تو اپنی کم مائیگی کا شکار تھے۔ دوم انھیں اپنے اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے میں لاتعداد مسائل سے دوچار ہونا پڑا جو نہ صرف بہت پیچیدہ تھے بلکہ بے انتہا مختلف النوع بھی تھے جو معاملات خاص طور پر لامتناہی رکاوٹ کا باعث بنے اور جن کی وجہ سے آئین سازی کا کام ازحد پیچیدہ ہو گیا ان میں سے حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ مجوزہ آئین کی نوعیّت۔ اس سے مراد وہ اختلافات ہیں کہ آئین میں اسلام کو کیا حیثیّت و مرتبہ حاصل ہونا چاہیئے۔

۲۔ مذہبی اقلیتوں اور طریق انتخاب (بالغ یا محدود رائے دہندگی اور جداگانہ یا مخلوط انتخاب) کے مسائل

۳۔ ملک کی جغرافیائی تقسیم اور وفاقی مقننہ میں نمائندگی کے تناسب و تعداد کے مسائل۔

۴۔ وفاقی حکومت اور صوبوں میں تقسیم اختیارات۔

۵۔ لسانی تنازعات

۶۔ عاملہ اور مقننہ میں تعلقات کا سوال۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پاکستان میں پارلیمانی جمہوری نظام ہونا چاہیے یا صدارتی۔

۷۔ صوبائی تعصبات اور سیاسی راہنماؤں کا رویہ۔

پاکستان دستور ساز اسمبلی نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنا کام شروع کیا اور طویل بحث و غور کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں آئندہ آئین کے اغراض و مقاصد کے سلسلہ میں ایک قرارداد منظور کی جسے "قراردادِ مقاصد" کے نام سے شہرت حاصل ہو چکی ہے[1]

---

[1] اس قرارداد کا متن آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے

Marfat.com

اس قرارداد کی منظوری کو لیاقت علی خاں نے "ملک کی تاریخ میں حصولِ پاکستان کے کارنامہ کے بعد اہم ترین واقعہ" قرار دیا۔ اس قرارداد میں ان اصولوں کی بالوضاحت نشاندہی کی گئی تھی جن کی بنیادوں پہ ملک کا آئندہ آئین تیار ہونا تھا۔ مختصراً اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ اسلامی اصولوں کے مطابق جمہوریت، آزادی، مساوات اور معاشرتی انصاف کی پوری پاسداری کی جائے گی اور مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات اور مقتضیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔ اس قرارداد میں اقلیتوں کے حقوق کا بھی ذکر کیا گیا تھا کہ وہ اپنے مذاہب پر پوری آزادی سے کاربند رہ سکیں گی اور اپنی ثقافت کو فروغ دینے کی مجاز ہوں گی۔ اس قرارداد میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ بنیادی حقوق کا پورا تحفظ کیا جائے گا، عدلیہ کی مکمل آزادی کی ضمانت دی جائے گی اور پاکستان ایک وفاقی مملکت ہو گا۔

قرارداد میں واضح الفاظ میں اعتراف کیا گیا تھا کہ ساری کائنات پہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے اور اس نے پاکستان کے عوام کو جو اختیار تفویض کیا ہے وہ ایک مقدس فریضہ ہے جسے پاکستان کے عوام اپنے منتخب نمائندوں کی وساطت سے سرانجام دیں گے۔

قراردادِ مقاصد سے پاکستان کا جو خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے اس سے واضح ہے کہ قرارداد کا مقصد پاکستان کو ایک ایسی اسلامی مملکت بنانا تھا جو جمہوری تقاضے بھی پوری کرتی ہو۔ اس کا مقصد ہرگز خالصتاً مذہبی ریاست کا قیام نہیں تھا اور نہ ہی اس قرارداد کے ذریعے علماء کو کوئی خاص مقام یا اختیارات دیئے گئے تھے۔ قرارداد مقاصد کے مطابق پاکستان کو ایک وفاقی سلطنت بننا تھا جس میں صوبوں یا یونٹوں کو ایک مقررہ حد تک آزادی ملنی تھی۔ لیاقت علی خاں نے قرارداد کو دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ "یوں تو

Marfat.com

مغربی ممالک اور روس بھی جمہوریت کا دعوی کرتے ہیں لیکن ہماری اسلامی جمہوریت کا تصوّر ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اس کا جتنا تعلق نظامِ حکومت سے ہے اتنا ہی ہمارے معاشرے سے بھی ہے۔" [1]

یہ قرارداد اس امر کی بھی وضاحت کرتی ہے کہ ریاست کو عوام کی زندگیوں میں مثبت کردار ادا کرنا تھا اور یہ ریاست کی ذمہ داری تھی کہ وہ اسلامی معاشرے کی تعمیر کرے اور عوام کی زندگیاں اسلامی سانچے میں ڈھالے۔

قرارداد مقاصد پر دستور ساز اسمبلی کے پانچ مسلسل اجلاسوں میں بحث و غور کا سلسلہ جاری رہا۔ پاکستان نیشنل کانگرس نے جو واحد اپوزیشن پارٹی تھی اس قرارداد پر اعتراض کیا۔ کانگرس کے رکن بی کے دتا نے کہا "قرارداد میں مذہب اور سیاست کو خلط ملط کر دیا گیا ہے حالانکہ مذہب سیاست سے الگ ہوتا ہے۔" [2] اور اس کے تحت اقلیتی فرقوں کے لوگ محض غلام بن کر رہ جائیں گے۔ پاکستان نیشنل کانگرس دراصل انڈین نیشنل کانگریس کے ان نمائندوں اور ارکان پر مشتمل تھی جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور تقسیم کے بعد وہ پاکستان میں رہ گئے تھے۔ تمام مسلمان ارکان نے، میاں افتخار الدین کے سوا، اس قرارداد کی پرزور حمایت کی۔ میاں افتخار الدین کا خیال و نظریہ یہ تھا کہ جب تک اقتصادی نظام میں بنیادی اور دور رس تبدیلیاں نہیں کی جائیں گی محض سیاسی آزادیوں کا تحفظ بےسود ثابت ہوگا۔ اسمبلی کے غیر مسلم ارکان اس

---

[1] پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کراچی ۱۹۴۹ جلد پانچ نمبر ۱، صفحہ ۳

[2] ——— ایضاً ——— جلد تین نمبر ۳ صفحہ نمبر ۴۵

قرارداد پر غیر مطمئن تھے اور انہیں یہ خدشہ تھا کہ اس طرح مملکت کی طرف سے لوگوں کی نجی زندگی میں مداخلت کا دروازہ کھل جائے گا۔ کانگرس پارٹی کے لیڈر ایس سی چٹو پادھیا نے قرارداد مقاصد پر تنقید و احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اس سے پاکستان میں غیر مسلم محض "پانی بھرنے والے اور لکڑہارے بن کے رہ جائیں گے۔[1] ان اعتراضات کے جواب میں وزیر اعظم نے غیر مسلموں کو یقین دہانی کرائی کہ ان میں اور مسلمانوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔ غیر مسلموں کے علاوہ راسخ العقیدہ مسلمان بھی اس قرارداد سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے ان کے خیال میں اس قرارداد میں غیر مسلموں کے حقوق پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا تھا۔

قرارداد مقاصد اپنی جگہ مکمل آئین نہیں تھی۔ اس میں صرف بنیادی اصولوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ مستقل اور وفاقی طرز کا آئین تیار کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی قائم کی جسے منتخب میں مختلف صوبوں کو اس طرح نمائندگی مہیا کرنی تھی کہ کسی صوبے کو بھی دوسروں پر غلبہ حاصل نہ ہو سکے[2] اس کمیٹی میں تمام سیاسی پارٹیوں کے نمائندے شامل تھے اور اسے یہ فرض سپرد کیا گیا تھا کہ وہ حتی الوسع جلد از جلد ان بنیادی اصولوں کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کرے جن کی بنیاد پر آئندہ آئین تیار کیا جا سکے۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے تین سب کمیٹیاں قائم کیں تاکہ وہ علیحدہ وجداگانہ

---

[1] پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کراچی ۱۹۴۹ء جلد پانچ صفحہ ۶۶

[2] Constitutional Development In Pakistan, G. W: Chaudhry, Longman, London, (1969). P. 69.

طور پر اہم معاملات کا جائزہ لیں۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کا کام اس نقطۂ نظر سے انتہائی دشوار تھا کہ اسے جس ملک کے لیے دستور بنانا تھا اس کے مشرقی اور مغربی حصّوں میں ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل تھا اور مغربی پاکستان کے صوبوں میں بھی آبادی کی تقسیم خاصی غیر متناسب تھی۔ ملک کے مختلف حصّوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں ملک میں ایسے سیاستدانوں کی بھی کمی نہ تھی جن کا مقصدِ حیات صوبائی تعصبات کی آگ بھڑکانا اور قومی استحکام کی بنیادیں کمزور کرنا تھا تاکہ دستور سازی کی راہ میں رکاوٹیں ڈال کر ملک کا شیرازہ بکھیرا جا سکے[۱] بلاشبہ ان سیاستدانوں کو اپنے مقاصد میں کافی حد تک کامیابی ہوئی اور دستور سازی میں تاخیر کے سبب ملک کے مختلف حصوں میں اتنی بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیل گئیں کہ قومی اتحاد کا دامن تار تار ہو گیا۔ انھوں نے صوبائی منافرت کی جو چنگاریاں بھڑکائی تھیں وہ بالآخر شعلے بنیں اور مشرقی و مغربی پاکستان کے رشتے جل کر راکھ ہو گئے۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی پہلی رپورٹ ۱۹۵۰ء میں پیش کی۔ اس رپورٹ کے مطابق مرکزی مقننہ کو دو ایوانوں پر مشتمل ہونا تھا۔ پہلے ایوان میں تمام صوبوں کو یکساں نمائندگی ملنی تھی[۲] دوسرے ایوان کے ارکان اور ان کے طریقہ انتخاب پر روشنی نہیں ڈالی گئی تھی کیونکہ ابھی تک حق رائے دہی Franchise سب کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش نہیں کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق دونوں ایوانوں کو یکساں اختیارات حاصل تھے اور اختلاف

---

[۱] ایضاً صفحہ نمبر ۶۸

[۲] بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۵۰ء) صفحہ نمبر ۹

Marfat.com

کی صورت میں دونوں کا اجلاس بلاکر فیصلہ کرنا ضروری تھا۔ کمیٹی نے یہ بھی تجویز کیا کہ کابینہ دونوں ایوانوں کے سامنے جوابدہ ہو۔[۱]

جہاں تک دو ایوانوں کی تجویز کا تعلق تھا وہ بہرحال وفاقی طرزِ حکومت کا بنیادی اصول ہے لیکن دونوں ایوانوں کو یکساں اختیارات دے کر اس رپورٹ میں وفاق کی روح کو مجروح کیا گیا تھا۔ اگر امریکہ میں ایوانِ اعلیٰ زیادہ بااختیار ہوتا ہے تو کینیڈا میں ایوان زیریں۔ عام طور پر کابینہ ایوانِ زیریں، جسے بالغ رائے دہی کے اصول پر منتخب کیا جاتا ہے، جوابدہ ہوتی ہے۔ لیکن اس رپورٹ کے مطابق اسے دونوں ایوانوں کے سامنے جوابدہ ہونا تھا۔ اس سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

اس رپورٹ کے ردِ عمل کے طور پر مشرقی پاکستان میں احتجاج کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کا خیال تھا کہ انھیں آبادی میں اکثریت حاصل ہونے کی وجہ سے مرکزی قانون ساز اداروں میں زیادہ نشستیں ملیں گی لیکن اس رپورٹ کے مطابق دونوں ایوانوں کے اکٹھے اجلاس کی صورت میں مشرقی پاکستان کی اکثریت اقلیت میں بدل جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان کو دونوں ایوانوں کے یکساں اختیارات پر بھی اعتراض تھا۔ "چنانچہ مشرقی پاکستان کو اس رپورٹ کی تجاویز سے دلی صدمہ ہوا۔"[۲] مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے بھی اس رپورٹ میں بنیادی اور اہم تبدیلیوں کی سفارش کی۔[۳] مشرقی پاکستان

۱۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۵۰ء) صفحہ نمبر ۱۰

۲۔ پاکستان آبزرور (ڈھاکہ) یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء۔

۳۔ ایضاً ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء۔

Marfat.com

کی مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں بھی اس رپورٹ کو "اینٹی بنگالی" رپورٹ کہا گیا اور اس اجلاس میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں رپورٹ پر غور کے التوا کا اعلان کر دیا۔[1] اس التوا کا مقصد یہ تھا کہ کمیٹی ان مسائل پر مزید غور و خوض کرے، لوگوں کی تجاویز پر ہمدردانہ نگاہ ڈالے اور کوئی ایسا دستوری فارمولا وضع کرے جو ملک کے تمام حصوں کے لیے قابلِ قبول ہو لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

آئین سازی کے کام کی رفتار بڑی سست تھی اور ابھی آئین سازی کے سلسلے میں کوئی ٹھوس کام بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں کو راولپنڈی میں قتل کر دیا گیا۔ مرحوم کی جگہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم مقرر ہوئے لیکن رپورٹ کی تکمیل میں تاخیر کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔

لیاقت علی خاں نے تحریک پاکستان میں جو خدمات سر انجام دیں ہر شخص ان کا معترف ہے۔ پھر قیامِ پاکستان کے بعد بھی ان کی کارکردگی کی عام تعریف کی جاتی ہے لیکن ان کے مدح خواں اور معتقد بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ جس طرح آزادی کے بعد پنجاب کے پہلے انتخابات میں انہوں نے آزادانہ و منصفانہ انتخابات کے تقاضوں کو کما حقہ ملحوظ نہ رکھا اور اپنی پارٹی کے بعض امیدواروں کے حق میں کھلم کھلا سرکاری مشینری استعمال ہونے دی۔ اسی طرح ان کے خلاف یہ شکایت بھی بالکل بے بنیاد نہیں کہ انہوں نے آئین سازی کے کام میں تاخیر کو دور کرنے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں میں ان پر سرکاری کام کا بڑا بار تھا لیکن انتظامی امور میں ان کی بے پناہ مصروفیات کو آئین سازی میں تاخیر کا جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ بات فی الواقع حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم ہے کہ وہ کم و بیش سوا چار

---

[1] پاکستان ٹائمز ۲۲ نومبر ۱۹۵۰ء

Marfat.com

سال تک ملک کے وزیر اعظم رہے لیکن آئین کی بنیاد رکھنے میں ناکام رہے یوں لگتا ہے کہ جیسے آئین سازی میں ان کی کوشش نیم دلانہ تھی اور جب بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ کو ناکافی قرار دیا گیا تو انھوں نے کوئی مزید کوشش ہی ضروری نہ سمجھی۔ قیام پاکستان کے وقت قومی سطح پر اتحاد کا جذبہ پورے عروج پر تھا۔ اور پاکستان کو آغاز کار میں ہی جن بے پایاں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کی وجہ سے یہ احساس بھی عام تھا کہ پاکستان کو صرف اتحاد سے ہی محفوظ و مستحکم بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ سیاسی مفادات و اغراض نے مسلم لیگ میں بھی گروہ بندی کی دیواریں کھڑی کر دیں۔ قومی نقطۂ نظر کے بجائے صوبائی رجحانات ملکی سیاسیات پر غالب آ گئے۔ چنانچہ آئین سازی میں تاخیر سے کشمکش اور انتشار کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس صورت حال کے نتیجے کے طور پر لیاقت علی خاں کے زمانہ اقتدار کے آخری دنوں میں تعطل اور سیاسی بے یقینی کے سائے گہرے اور لمبے ہونے لگے تھے۔[لے]

لے " ان پر اکثر ایک ہی بڑا اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایسے زمانے میں (۵۰ - ۱۹۴۹ء) آئین سازی کا کام کیوں آگے نہ بڑھایا جب قوم متحد تھی اور مسلم لیگ کو دستور ساز اسمبلی میں غالب اکثریت حاصل تھی اور کل ۷۹ ارکان سے مٹھی بھر کانگرسی ہندو اپوزیشن میں تھے۔

قائد اعظم کے انتقال کے بعد کچھ عرصے کے لیے وزیر اعظم اور مرکزی حکومت کی ساری توانائیاں قومی استحکام پر مرکوز تھیں۔ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں وزیر اعظم کے لیے ممکن ہوا کہ وہ اپنی توجہ آئینی مسائل کی طرف مبذول کریں۔ ۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خاں نے قرارداد مقاصد کی تحریک کی — ۱۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے اگلے سال رپورٹ پیش کر دی لیکن جب اس رپورٹ پر کچھ مخالفانہ

(باقی صفحہ آئندہ)

Marfat.com

آئین کے سلسلے میں پہلا اور مشکل ترین مسئلہ لیاقت علی خاں کی زندگی

بقیہ حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ: نکتہ چینی ہوئی تو وزیر اعظم نے آئین ساز اسمبلی سے درخواست کی کہ اس پر بحث ملتوی کر دی جائے اور عام لوگوں کو اپنی آرا و افکار پیش کرنے کی کھلی دعوت دی۔ ان کے ناقدین یہ سوچتے ہیں کہ انھوں نے اس طرح آئین سازی کے کام سے کیوں پہلوتہی کی؟ بھارت نے یہ کام اواخر ۱۹۴۹ء تک مکمل کر لیا تھا اور پہلے انتخابات ۱۹۵۱ء میں بیک وقت کرا لیے تھے۔

اس کی وجہ وہ منصوبہ تھا جو اس زمانے میں لیاقت علی خاں نے مرتب کیا کہ آئینی مسائل کو طے کرنے سے پہلے باری باری ہر صوبے میں اور اس کے بعد مرکزی اسمبلی کے انتخابات کرائے جائیں۔ انہوں نے اپنے اس منصوبہ سے مجھے اور بعض دوسرے احباب کو آگاہ کیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر مبنی عبوری آئین تسلی بخش طور پر کام کر رہا ہے۔ بالغ رائے دہی کی اساس پر عام انتخابات سے جمہوری اداروں کے قیام کی یقینی ضمانت مل جائے گی لیکن صوبائی اور مرکزی قانون ساز اداروں کے انتخابات بیک وقت کرانے سے انتظامیہ اور مسلم لیگ پارٹی کے وسائل پر بے حد بار پڑے گا۔ اس لیے یہ انتخابات مرحلہ بہ مرحلہ ہونے چاہئیں۔ ان کا آغاز پنجاب سے کیا جائے اور علی الترتیب شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ سندھ۔ مشرقی بنگال اور سب سے آخر میں مرکز کے لیے۔ جب عوام سے تازہ سند اختیار لیے نو منتخب حکومتیں باگ ڈور سنبھالیں گی تو پھر آئین سازی کا کام ہاتھ میں لے کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے گا لیکن ایک قاتل کی گولی نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لیاقت علی خاں کی زندگی کے ساتھ ان کے منصوبے کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پاکستان کے لیے یہ ایک شدید المیہ اور ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔" بحوالہ چودھری محمد علی۔ سابق وزیر اعظم، ظہور پاکستان۔ مکتبہ کارواں لاہور صفحہ نمبر ۴۵۰، ۴۵۳

Marfat.com

میں ہی ابھر آیا تھا۔ یہ مسئلہ مملکت کی نوعیت و کردار کا تھا کہ آئندہ آئین میں
اسلام کو کیا مقام و مرتبہ حاصل ہوگا۔ ابتداء میں دو سوال سامنے آئے کہ:

۱۔ آئین میں اسلام کی کس قدر عکاسی ہونی چاہیئے اور اسلامی ریاست کس قسم کی ہوتی ہے؟

۲۔ ملک میں اسلامی ماحول اور فضا پیدا کرنے میں سیاسی پارٹیوں کو کیا کردار ادا کرنا چاہیئے؟

اس ضمن میں ابتدا سے ہی دو مکاتیبِ فکر بہت نمایاں طور پر سامنے آگئے تھے۔ ایک مکتبِ فکر راسخ العقیدہ لوگوں کا تھا جو اس بات کے علمبردار تھے کہ مسلم لیگ کی تحریک نے اسلام کا نعرہ لگایا تھا اسے اپنا یہ وعدہ پورا کرنا چاہیئے۔ دوسرے مکتب فکر کے علمبردار مذہب کو نجی معاملہ قرار دیتے تھے اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ قیام پاکستان کے لیے جدوجہد میں اقتصادی و معاشرتی عوامل ہی اصل قوتِ محرکہ تھے۔ اس مسئلے کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کو "اسلامی ریاست" ہونا چاہیئے یا نہیں؟ آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں جو قرارداد لاہور منظور کی تھی اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں تھا اور شاید اس کا کوئی موقع و محل بھی نہیں تھا اس قرارداد میں صرف مسلم اکثریتی علاقوں کی آزادی و خود مختاری کا مطالبہ کیا گیا تھا تاکہ مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی اور دوسرے مفادات کا تحفظ و فروغ ہو سکے۔ قائداعظم محمد علی جناح بھی اگرچہ اسلامی ریاست کا ذکر کرتے تھے لیکن بالوضاحت نہیں۔ وہ پاکستان کو ایک جدید جمہوری مملکت قرار دیتے رہے تھے جس کے عوام حاکمیت کے حق سے بہرہ ور ہوں گے۔ علاوہ ازیں ان کے بیانات اور خطبات میں اسلام کی تعلیمات، قرآن بطور آئین وغیرہ کا بھی ذکر ہوتا

Marfat.com

تھا۔[1] لیکن جب آئین سازی کا مرحلہ آیا تو اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کے لوگوں نے اسلامی آئین پر زور دیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ مطالبہ پاکستان میں اسلامی ریاست کا مطالبہ بھی مضمر تھا۔ لیاقت علی خاں نے جب دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پیش کی تو انھوں نے تحریک پاکستان میں اسلامی پالیسی کے حصول کے سلسلہ میں لوگوں کی آرزو پوری کرنے کی کوشش کی۔ قرارداد مقاصد (مارچ ۱۹۴۹ء) کے ایک حصّے میں اس نقطۂ نظر یعنی اسلامی ریاست کی تائید و حمایت کی تھی لیکن اس پر ٹھوس عمل درآمد تک نوبت نہ پہنچی۔ لیاقت علی خاں کی زندگی میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کی بھی توثیق نہ ہو سکی سیاسی کشمکش و نزاع کے تین بنیادی اسباب تھے :۔

۱۔ سیاسی تعطل و جمود

۲۔ آئینی خلا اور

۳۔ پاکستان میں اسلام کا مقام و مرتبہ

"اسلامی ریاست" کی اصطلاح کی ۱۹۵۴ء تک کوئی واضح تعریف نہ کی جا سکی۔ خود علماء میں بھی اس اصطلاح کی صحیح اور واضح تعبیر میں اختلاف تھے لیاقت علی خاں کی وفات کے بعد ملک کی تاریخ میں انہی اختلافات میں اضافہ اور

---

[1] ریاستہائے متحدہ امریکہ کے عوام کے نام قائد اعظم نے اپنے پیغام میں فروری ۱۹۴۸ء میں فرمایا: "پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے اور مجھے یہ علم نہیں کہ اس کی آخری شکل کیا ہو گی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جمہوری دستور ہو گا جس کی بنیاد اسلام کے اصولوں پر ہو گی۔ بہرحال پاکستان ایک ایسی مذہبی ریاست نہیں ہو گی جس پر مذہبی پیشواؤں کی حکومت ہو۔ یہاں تمام اقلیتوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔

Marfat.com

ان کے بارے میں بے لچک رویہ کی عکاسی ہوتی ہے۔[1]

لیاقت علی خاں آئین سازی کا کام ادھورا چھوڑ کر اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم بنے تو آئین سازی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا کام ان کا فرض قرار پایا۔ انہوں نے وزیر اعظم بننے کے تقریباً سوا سال بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی مکمل و مبسوط رپورٹ دستور ساز اسمبلی میں پیش کی۔ اس رپورٹ کی بنیادی سفارشات حسب ذیل تھیں۔

صدر مملکت مسلمان ہو گا۔ اس کا انتخاب مرکزی مقننہ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں کیا جائے گا لیکن وہ مقننہ کا رکن نہیں ہو گا۔

اس کے عہدہ کی میعاد پانچ سال ہو گی اور اس میعاد کے اندر کسی بھی عدالت میں اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہیں کی جا سکے گی۔

مرکزی مقننہ دو ایوانوں پر مشتمل ہو گی۔ ایک اکائیوں کا ایوان اور دوسرا عوام کا ایوان یا دار العلوم۔ اول الذکر ایوان ۱۲۰ ارکان پر مشتمل ہو گا اور انہیں ملک کے ہر دو حصوں سے مساوی تعداد میں منتخب کیا جائے گا۔ موخر الذکر ایوان کے ارکان کی تعداد ۴۰۰ ہو گی اور انہیں بھی ملک کے ہر دو حصوں سے مساوی تعداد میں منتخب کیا جائے گا۔ ہر دو ایوانوں کی میعاد پانچ سال ہو گی۔ اس رپورٹ کے مطابق دار العوام ہی اصل اختیارات کا سر چشمہ تھا۔ مالیاتی بل صرف ایوان زیریں میں پیش کیے جانے تھے اور وزارت بھی ایوان زیریں کے سامنے جواب دہ ہونی تھی۔[2]

---

[1] زیڈ اے سلہری (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۳۵

[2] بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۵۲ء) صفحہ نمبر ۱۰

Marfat.com

دونوں ایوانوں میں اختلاف کی صورت میں دونوں کا مشترکہ اجلاس بلایا جائے گا جس میں فیصلے اکثریت سے ہوں گے۔

آئین میں ترمیم مرکزی اور صوبائی مجالسِ قانون ساز کی منظوری سے کی جائے گی البتہ یہ ترمیم ان شرائط کے تابع ہوگی جو اس آئین کی منظوری کے وقت طے کی جائیں گی۔

انتخابات عام بالغ رائے دہی کی اساس پہ ہوں گے۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی ایک اہم سفارش اسلامی قانون پر عبور رکھنے والے علماء کے بورڈوں کے قیام کے بارے میں تھی۔ یہ بورڈ صدرِ مملکت اور صوبائی گورنروں کو قائم کرنے تھے۔ تمام مجوزہ قوانین ان بورڈوں کے سامنے یہ معلوم کرنے کے لیے پیش کیے جانے تھے کہ ان میں قرآن و سنت کے منافی کوئی بات تو نہیں ہے۔ اس طرح قانون ساز اداروں کے سلسلہ میں علماء کے بورڈوں کو عملاً حقِ استرداد (ویٹو) دے دیا گیا تھا۔

ملک کے لیے ایک سپریم کورٹ ہوگی جس کے جج صدرِ مملکت مقرر کرے گا اور جنہیں صدرِ مملکت ہی ججوں کے ایک بنچ کے مشورہ پہ ہٹا سکے گا۔ اسی طرح ہائی کورٹ کے ججوں کو صوبائی گورنروں کو مقرر کرنا تھا اور یہ سپریم کورٹ سے رجوع کرنے کے بعد انھیں ہٹایا جا سکتا تھا۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی یہ رپورٹ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو منظرِ عام پہ آئی اس کے شائع ہوتے ہی اس پہ جرح و تنقید نے ملک گیر طوفان کی حیثیت اختیار کر لی اور اس کی کوکھ سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نہ ختم ہونے والی کشمکش اور روابط و تعلقات میں روز افزوں تلخی اور بدگمانی نے جنم لیا۔

بحث و نزاع کا ایک بڑا موضوع آئین کا وفاقی ڈھانچہ اور وفاقی مقننہ میں نمائندوں کی تعداد تھا[1]۔ رپورٹ میں مشرقی پاکستان کو مرکزی مقننہ میں نشستوں کی تعداد کے اعتبار سے مغربی پاکستان کے مساوی حیثیت دی گئی تھی۔ اسے

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء

Marfat.com

"مساوی نیابت کی تجویز Parity Formula کا نام دیا گیا تھا۔ یہ بات وفاقی نظام کے تمام اصولوں کے خلاف تھی کہ عوام کے ایوان میں مشرقی پاکستان کے ۲۰۰ نمائندے ہونے تھے اور مغربی پاکستان کے بھی ۲۰۰ نمائندے۔ اکائیوں کے ایوان میں بھی صرف مشرقی پاکستان کے ۶۰ نمائندے لیے جانے تھے اور مغربی پاکستان کے تمام صوبوں سے بھی ۶۰۔ یہ انتظام ملک کو مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کرنے کے مترادف تھا۔ بہرحال یہ بات عجیب اور ناقابلِ فہم تھی کہ جب دونوں ایوانوں میں ملک کے ہر دو بازوؤں سے مساوی نمائندے لیے جانے تھے تو پھر دو ایوانوں کی ضرورت یا مصلحت کیا تھی۔ اس عجیب وغریب انتظام کی بنیادی وجہ مشرقی پاکستانی نمائندوں کا اصرار تھا۔ انھیں ایوانِ زیریں میں تو آبادی کی اساس پر اپنی اکثریت قبول تھی لیکن جب ایوانِ بالا میں ہر چھوٹی بڑی اکائی کو مساوی نمائندگی دینے کا سوال آتا تھا تو پھر ان کی یہ خواہش وکوشش ہوتی تھی کہ ان کی اکثریت دونوں ایوانوں میں مجموعی طور پر اقلیت میں تبدیل نہ ہونے پائے۔ ان کا یہ استدلال دونوں صوبوں میں "مساوی نیابت" کی اصطلاح کی بنیاد بنا۔ چنانچہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں مساوات کے اصول کو مقدس حیثیت حاصل ہوگئی۔ آئینی تجاویز میں یہ ذکر بھی موجود تھا کہ مستقبل میں جب کبھی کشمیر اور جوناگڑھ پاکستان میں شامل ہوں گے تو اس وقت بھی دونوں بازوؤں میں مساوی نیابت کو برقرار رکھا جائے گا۔[1]

مقننہ میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے نشستوں کی مساوی تعداد وفاقی نظام کے اساسی اصولوں کے یکسر منافی تھی۔ حد یہ ہے کہ دونوں بازوؤں میں

۱۔ پاکستان ٹائمز لاہور (سیمنار کی روداد) ۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء

Marfat.com

قدرتی اختلافات مثلاً زبان، معاشرت، معیشت، ثقافت، آب وہوا، آبادی میں عدمِ توازن، جغرافیائی بعد وغیرہ کو بھی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ان فروگذاشتوں پر پنجاب نے شدید نکتہ چینی کی[۵۱] پنجاب گروپ نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ مشرقی پاکستان کو مغربی بازو پر مکمل غلبہ عطا کر دیا گیا ہے کیونکہ مغربی پاکستان نو اکائیوں میں منقسم ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں مشرقی پاکستان واحد اکائی ہے[۵۲] بنگالی گروپ بھی مساوی نمائندگی کی تجویز سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا کیونکہ آبادی کے لحاظ سے ان کا صوبہ ایوان زیریں میں جتنی نشستوں کا حقدار تھا مقابلتاً اس کے حصہ میں کچھ کم آئی تھیں[۵۳] مغربی پاکستان کو یہ اعتراض بھی تھا کہ اس کی نو اکائیوں کو ایوان بالا میں مشرقی پاکستان کی واحد اکائی کے برابر نمائندگی دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس رپورٹ میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ دونوں ایوانوں میں اختلاف کی صورت میں کیا قدم اٹھائے جائیں گے۔ ان اختلافات و نزاعات کی وجہ سے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو بعض حلقوں کی طرف سے بنگالی پنجابی بحران رپورٹ کا نام بھی دیا گیا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں مساوی نیابت کی اس تجویز کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس نے ذہنوں میں صوبائی حصار کھڑے کر دیئے جن کو مستقبل بھی گرانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عام لوگوں

---

۵۱ پاکستان ٹائمز لاہور (سیمینار کی روداد) ۱۱-۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء

۵۲ 〃 〃 〃 〃 〃

۵۳ 〃 〃 〃 〃 〃

نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا اور یہ صرف مشرقی اور مغربی پاکستان کے صوبے ہی تھے جن کے اشتراک و اتحاد سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا[۱] اس اندازِ فکر کی ترجمانی پرانے اور سرکردہ مسلم لیگی لیڈر راجہ غضنفر علی خاں نے بھی کی۔ انھوں نے کہا:

"کمیٹی نے بڑے غور و خوض کے بعد وفاقی نوعیت کے آئین کا ڈھانچہ وضع کیا تھا۔ لیکن آبادی کی اساس پر مشرقی پاکستان کو اکثریت نہ دی گئی۔ اس کے برعکس دونوں حصّوں میں مساوات کا اصول اختیار کیا گیا۔ مشرقی پاکستان کی اس قربانی کے باوجود ایسی صورتِ حال پیدا کر دی گئی کہ اگر تمام دوسرے صوبوں کے نمائندے ایک ٹیم کی طرح بھی کام کرتے تو بھی مشرقی پاکستانی دوسرے بازو کے سب سے چھوٹے صوبے کو ساتھ ملا کر اکثریت حاصل کر سکتے تھے۔ دوسری طرف مغربی حصّے کے تمام صوبے مل کر بھی مشرقی پاکستان کے مقابلے میں اکثریت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں مرکز میں کوئی ایسی وزارت نہیں بن سکتی تھی جس میں مشرقی پاکستان کا حصّہ غالب نہ ہو۔ اس طرح ملک کی حاکمیّت کی باگ ڈور عملاً مشرقی پاکستان کے ہاتھ میں چلی گئی۔"[۲]

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں جو دوسری سفارش سب سے زیادہ تنقید کا ہدف بنی وہ علماء کے بورڈوں کے بارے میں تھی جنھیں مرکز اور صوبوں میں قانون سازی کا جائزہ لینے کا اختیار دیا گیا تھا[۳] ان بورڈوں

---

[۱] زیڈ اے سلہری (بحوالہ سابقہ) ص ۵۳ ۵۴

[۲] مارشل لا سے مارشل لا تک روزنامہ مشرق لاہور (بحوالہ سابقہ) ۱۰ مئی ۱۹۶۴ء

[۳] پاکستان ٹائمز لاہور ۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء

Marfat.com

میں معدودے چند افراد کو لامحدود اختیارات حاصل ہوتے تھے اور وہ ساری قوم کی طرف سے قرآن وسنت کی تعبیر Interpretation کے اجارہ دار بن سکتے تھے۔ رپورٹ کا یہ حصہ علماء اور خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کے دو تین وزیروں کے درمیان طویل مذاکرات کا مرہون منت تھا۔ اس تجویز میں بلاشبہ مذہبی رنگ غالب تھا لیکن اس میں یہ خطرہ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا کہ خواجہ ناظم الدین نے جن راسخ العقیدہ علما کے ساتھ پارلیمنٹ سے باہر علماء کے بورڈ کے معاملے میں مفاہمت کی تھی وہ کسی بھی قانون کو اپنی دانست میں غیر اسلامی قرار دے کر اسے ویٹو کر سکتے تھے۔ یہ امکانی خطرہ بہت مہیب تھا۔ خواجہ ناظم الدین کا اسلامی ریاست کے بارے میں یہ تصور تھا کہ بعض قوانین اور معمولات کے احیاء سے یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے گا لیکن قرآن وسنت کی تعبیر کی اجارہ داری ان علماء کو حاصل ہو رہی تھی جنہیں عصر حاضر کی نوعیت، تقاضوں اور چیلنج کا کما حقہ علم و احساس نہ تھا۔

آئین کی ترتیب میں تاخیر کا باعث ایک اور مسئلہ بھی بنا۔ یہ مسئلہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے مابین تقسیم اختیارات کا تھا جس کے بارے میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اختلافات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں جو قرارداد مقاصد منظور کی گئی تھی اس میں یہ بنیادی بات شامل تھی کہ پاکستان میں وفاقی جمہوری نظام ہو گا اور اس فیصلے کو "جغرافیائی مجبوری" قرار دیا گیا تھا۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں مملکت کے لیے وفاقی ڈھانچہ کی سفارش کی گئی تھی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مرکز اور صوبوں میں تقسیم اختیارات کے سلسلے میں تین فہرستیں مرتب کی گئی تھیں لیکن دوسرے معاملات کی طرح اس سفارش پر بھی اختلاف اور بحث وتمحیص کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حصول آزادی

Marfat.com

کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ تحریک پاکستان کے زمانے کا جوش و خلوص کمزور ہو رہا تھا اور اس دوران میں واضح نظریات و رجحانات کے کئی گروپ وجود میں آچکے تھے۔ ایک گروپ اگر مضبوط مرکز کا حامی تھا تو دوسرا گروپ صوبوں کے لیے زیادہ سے زیادہ خود مختاری کا علمبردار تھا۔ یہ بات بھی بڑی عجیب تھی کہ اگرچہ مشرقی پاکستان سب سے بڑا صوبہ تھا لیکن زیادہ سے زیادہ خود مختاری کے لیے سب سے پہلی آواز وہیں سے اٹھی۔ آئین سازوں نے ان دو متصادم نظریات کے مابین اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران میں دونوں بازوؤں کے رہنماؤں اور عوام کے درمیان اعتماد اور باہمی مفاہمت کی فضا مکدر ہو چکی تھی جس نے معاملات اور زیادہ پیچیدہ بنا دیئے۔

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں مسلمہ خامیوں کے باوجود خواجہ ناظم الدین نے قوم سے اسے قبول کر لینے پر زور دیا اور اسے زیادہ سے زیادہ مفاہمت کی آئینہ دار قرار دیا۔ انھوں نے اسے "سورج کی پہلی سنہری کرن قرار دیا جس سے آسمان منور ہو جاتا ہے۔" ان کے خیال میں کمیٹی کی سفارشات نہ صرف لوگوں کی امنگوں کے عین مطابق تھیں بلکہ پاکستان کی ضرورت اور مزاج سے بھی ہم آہنگ تھیں۔ چنانچہ جب ان پر اتفاق رائے نہ ہو سکا تو وہ بہت مایوس اور رنجیدہ ہوئے۔ بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ کمیٹی کے اصل ۲۹ ارکان میں سے صرف ۱۶ ارکان نے اس پر توثیقی دستخط کیے تھے۔ پنجاب کے اکثر سرکردہ لیڈروں نے جو کمیٹی کے ارکان تھے اس رپورٹ سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ دستاویز صرف مشرقی پاکستان کے عزائم اور

Marfat.com

امنگوں کی ترجمان بن کر رہ گئی۔ اختلاف و نزاع کی وجہ سے تعطل کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس سے آئین سازی کے کام میں مزید تاخیر ہو گئی۔ بالآخر اس سیاسی تعطل کا خاتمہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۳ء کو ہوا جب گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا اور ان کی جگہ امریکہ میں سفیر پاکستان محمد علی بوگرہ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے ضمن میں یہ بات بھی بڑے وثوق سے کہی گئی کہ یہ قدم اٹھاتے وقت گورنر جنرل نے قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کی روح کو نظر انداز کر دیا تھا حالانکہ اس قانون کی دفعہ ۱۰ کے تحت کسی وزارت کا برسر اقتدار رہنا گورنر جنرل کی ''خوشنودی'' پر منحصر تھا۔ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کا ایک جواز گورنر جنرل کے خیال میں وہ پالیسی تھی جس پر وہ کاربند تھے اور جس کی وجہ سے ملک میں بڑی تلخی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی جو رپورٹ پیش کی تھی مغربی پاکستان کے لوگوں کی بھاری اکثریت اس کے سخت خلاف تھی۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان کے عوام کی اکثریت کا بھی مسلم لیگ کی حکومت سے اعتماد اٹھ چکا تھا جس کا واشگاف مظاہرہ اگلے ہی سال ۱۹۵۴ء کے موسم بہار میں پہلے صوبائی انتخابات میں ہو گیا۔ مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب اور کراچی میں اینٹی قادیانی تحریک نے سیاسی بے چینی کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا[1] اس ایجی ٹیشن کا اعصابی مرکز لاہور رہا تھا۔ وہاں مارچ سے مئی ۱۹۵۳ء تک مارشل لا نافذ رہا۔ خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے خلاف

---

[1] زیڈ اے سلہری (بحوالہ سابقہ) صفحات ۷۸۔ ۷۹

بنیادی الزامات یہ تھے کہ وہ ملک کو درپیش مشکل معاملات سے عہدہ برآ ہونے میں بُری طرح نااہل ثابت ہوئی ہے۔[۵۱]

دروغ بر گردن راوی۔ جب خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل غلام محمد سے اپنی برطرفی کے خلاف شکوہ کیا اور یہ کہا کہ جب وہ خود گورنر جنرل تھے تو لیاقت علی خاں کے ساتھ انھوں نے بالکل صحیح اور قانون و آئین کے عین مطابق طرزِ عمل اختیار کیے رکھا۔ غلام محمد نے اس کا یہ جواب دیا "خواجہ صاحب! ہوش سے کام لیں۔ نہ آپ لیاقت علی ہیں اور نہ میں ناظم الدین ہوں"۔[۵۲]

اس روایت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ قومی مسائل کو سمجھنے میں خواجہ ناظم الدین کس قدر سادہ لوح اور بھولے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قائداعظم کے پرانے اور معتمد نائب ہونے کی حیثیت میں خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل کے طور پر عوام کے اعتماد پر پورا اترنے کے لیے بہترین شخص تھے لیکن لیاقت علی خاں کے سانحہ قتل کے بعد جب انھوں نے وزارت عظمٰی کی عنان سنبھالی تو ان کے زمانہ اقتدار میں ملک یکے بعد دیگرے سخت مشکلات میں محصور ہو کر رہ گیا، جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، بعد کی حکومتوں کو بھی بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔

محمد علی بوگرہ کا فارمولا

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد محمد علی بوگرہ وزیراعظم مقرر ہوئے۔ گورنر جنرل کے اقدام کا حقیقی جواز اس وقت سامنے آیا جب مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی

---

۵۱ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۱۷ را پریل ۱۹۵۳ء

۵۲ زیڈ اے سلہری Pakistan's Lost Years صفحہ ۷۸

Marfat.com

نے اس شخص کو بھی اپنا لیڈر منتخب کر لیا جسے گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین کا جانشین مقرر کیا تھا۔ محمد علی بوگرہ نے وزیر اعظم بنتے ہی دستور سازی کو سب سے زیادہ اہمیّت دی۔ چنانچہ وزیر اعظم بننے کے صرف چھ ماہ کے اندر انھوں نے دستور ساز اسمبلی میں آئین کے سلسلے میں اپنا فارمولا پیش کر دیا جو ان کے بیان کے مطابق ملک کے دونوں بازوؤں کے نمائندوں کے لیے قابلِ قبول تھا[1] یہ فارمولا ۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کیا گیا اور ان تجاویز پر مشتمل تھا۔

مرکزی مقننہ دو ایوانوں — ایوان بالا اور ایوانِ زیریں — پر مشتمل ہوگی۔ ایوان بالا کے کل ۵۰ ارکان ہوں گے۔ پاکستان پانچ اکائیوں پر مشتمل ہوگا اور مشرقی پاکستان بھی ایک اکائی ہوگا اور ایوان بالا میں اس کے صرف ۱۰ نمائندے ہوں گے۔ ایوان زیریں میں ۳۰۰ ارکان ہوں گے اور اس میں ملک کی پانچ اکائیوں کو آبادی کے مطابق نمائندگی حاصل ہو گی۔ اس ایوان میں مشرقی پاکستان کے ۱۶۵ نمائندے ہوں گے اور باقی ۱۳۵ نمائندے مغربی پاکستان سے منتخب ہوں گے۔ اس تجویز کا نمایاں ترین پہلو یہ تھا کہ دونوں ایوانوں میں مشرقی پاکستان کے بھی ۱۷۵ ارکان ہوں گے اور چار اکائیوں پر مشتمل مغربی پاکستان کے نمائندوں کی مجموعی تعداد بھی ۱۷۵ ہو گی۔ اس طرح بین الصوبائی مساوی نیابت کا اصول اس فارمولا میں بھی بحال رکھا گیا تھا۔

---

[1] Constituent Assembly Debates, Vol. XVI, No. 9, Pp. 88-89.

Marfat.com

اس فارمولے کے تحت مرکزی مقننہ میں نشستوں کی تقسیم یوں کی گئی تھی:[1]

اکائی	ایوان بالا	ایوان زیریں	میزان
۱ مشرقی بنگال	۱۰	۱۶۵	۱۷۵
۲ پنجاب	۱۰	۷۵	۸۵
۳ صوبہ سرحد، سرحدی ریاستیں اور قبائلی علاقے	۱۰	۲۴	۳۴
۴ سندھ	۱۰	۱۹	۲۹
خیرپور		۱	
۵ بلوچستان، بلوچستان کی ریاستیں بہاول پور اور کراچی	۱۰	۱۶	۲۷
	(۴۷-۷-۲ ۳)		
	۵۰	۳۰۰	۳۵۰

دونوں ایوانوں کے اختیارات مساوی ہوں گے۔ وزارت دونوں ایوانوں کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ صدر کا انتخاب اور تحریک عدم اعتماد کا فیصلہ بھی دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں ہوگا۔ فیصلے سادہ اکثریت سے ہوں گے بشرطیکہ مغربی و مشرقی پاکستان دونوں صوبوں سے کم از کم تیس فیصد نمائندے اجلاس میں شریک ہوں۔ دونوں ایوانوں میں اختلاف و نزاع کی صورت میں مشترکہ اجلاس ہوگا۔ دونوں صوبوں میں سے ہر ایک کے تیس فیصد نمائندے

لـه Report of the Basic Principles Committee (as adopted by the C.A.), 1950, Pp. 10-13.

Marfat.com

حاضر ہونے کی صورت میں فیصلے اکثریتی ووٹ سے ہوں گے ۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لیے تین فہرستیں بنائی گئی تھیں فیڈرل، صوبائی اور مشترکہ ۔ مرکزی حکومت کو دفاع، خارجہ پالیسی، کرنسی، بینکنگ مواصلات، غیر ملکی تجارت وغیرہ پر کنٹرول کے لیے وسیع اختیارات دیئے گئے تھے ۔ فیڈرل فہرست میں ۶۷ مضامین تھے جبکہ صوبائی فہرست میں ۴۸ ۔ ؂

مرکزی مقننہ کو سارے ملک یا کسی حصے کے لیے توانین بنانے کے اختیارات دیئے گئے تھے ۔ کسی معاہدے یا کنونشن یا بین الاقوامی کانفرنس کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کا اختیار بھی مرکزی مقننہ کے پاس تھا ۔ گویا محمد علی فارمولا مضبوط مرکز کے تصور پر مبنی تھا اور اس میں مرکزی حکومت کو اس قدر اختیارات دیے گئے تھے کہ وہ کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کر سکے ۔ علاوہ ازیں اس میں یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ مرکزی مقننہ اور صوبائی مقننہ کے بنائے ہوئے قانون میں اختلاف کی صورت میں مرکزی مقننہ کا قانون صوبائی قانون پر حاوی ہوگا ۔ اسی طرح انتظامی معاملات میں بھی مرکزی حکومت کو غالب حیثیت حاصل تھی ۔

اسی فارمولے نے زبان کا مسئلہ بھی حل کر دیا تھا اور بنگالی اور اردو کو پاکستان کی سرکاری زبانیں قرار دے دیا تھا ۔ اگرچہ آئندہ بیس سال کے لیے

؂ Report of the Basic Principles Committee (as adopted py the Constituent Assembly) (1954, Pp. 73-79.

Marfat.com

انگریزی ہی کو سرکاری زبان کا مرتبہ حاصل رہنا تھا۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی گذشتہ رپورٹ میں یہ فرض علما کے بورڈ کے سپرد کیا گیا تھا کہ وہ اس بات کا جائزہ لیں گے کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون منظور نہ کیا جائے۔ محمد علی بوگرہ فارمولا میں یہ کام سپریم کورٹ کو تفویض کیا گیا اور بلاشبہ یہ اقدام صحیح سمت میں تھا۔

ان آئینی سفارشات کو بالعموم "محمد علی بوگرہ فارمولا" کا نام دیا گیا اور ملک کی رائے عامہ کے تمام حصوں نے انہیں عام طور پر سراہا۔ یہ فارمولا اس سے قبل تمام دستوری تجاویز سے بہتر تھا اور اس نے ملک کے بڑے بڑے مسائل بھی حل کر دیئے تھے۔ جہاں اس میں "پیریٹی" کا اصول شامل تھا وہاں اس امر کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ کوئی ایک صوبہ پورے ملک پر حکمرانی Dominate نہ کر سکے۔ اس فارمولا میں مضبوط مرکز کا بھی تصور شامل تھا اور صوبوں کو بھی مطمئن کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ اس لیے اس فارمولے کا عام طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ اور یہ امید ظاہر کی گئی کہ ان سفارشات پر عمل درآمد سے ملک کے دونوں بازوؤں میں بہتر اشتراک عمل اور زیادہ یک جہتی پیدا ہوگی، مرکز گریز رجحانات کا ازالہ ومقابلہ کرنے میں مدد ملے گی اور یہ انتظام پاکستان کے استحکام کا دائمی سرچشمہ ثابت ہوگا۔

ان آئینی تجاویز پر دستور ساز اسمبلی نے اکتوبر ۱۹۵۳ء میں تیرہ دن تک غور وخوض کیا اور دستور ساز اسمبلی کی منظوری حاصل ہو جانے کے بعد ۱۴ نومبر ۱۹۵۳ء کو انھیں ضبط تحریر میں لانے کے لیے ایک مسودہ کمیٹی قائم کر دی گئی۔ اس سلسلے میں برطانیہ سے ایک ممتاز آئینی ماہر

سر آئیور جیننگز Sir Ivor Jennings کی خدمات بھی حاصل کر لی گئیں لیکن اس کے باوجود مسودہ آئین مرتب کرنے کی رفتار بڑی سست تھی۔ وزیر اعظم نے اگرچہ یہ یقین دلایا تھا کہ آئین کی تیاری میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہونے دی جائے گی اور حتمی مسودہ کی تکمیل تک دستوریہ کا اجلاس مسلسل جاری رہے گا لیکن یہ یقین دہانی نقش بر آب ثابت ہوئی۔ اس کام کی سست رفتاری کے اسباب کئی تھے لیکن ان میں سب سے اہم سبب مشرقی پاکستان کے انتخابات اور سیاسی صورتِ حال تھی۔

آزادی سے قبل غیر منقسم بنگال میں صوبائی انتخابات ۱۹۴۶ء میں ہوئے تھے۔ لیکن اسمبلی کی پانچ سالہ میعاد کا شمار تقسیم کے بعد اسمبلی کے پہلے اجلاس سے کیا گیا تھا۔ اس حساب سے بھی اسمبلی کی میعاد اوائل ۱۹۵۳ء میں ختم ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود نئے انتخابات نہ کرائے گئے اور دستور ساز اسمبلی سے اس کی میعاد میں ایک سال کی توسیع کرنے کے لیے کہا گیا[۱]۔ در اصل مشرقی پاکستان کی مسلم لیگی حکومت عام انتخابات میں عوام کا سامنا کرنے سے گھبراتی تھی کیونکہ ایک اہم ضمنی انتخاب میں سرکاری امیدوار بری طرح ہار گیا تھا اس کے بعد دوسرے خالی حلقوں میں سرے سے ضمنی انتخابات ہی نہ کرائے گئے اور بڑھتے بڑھتے ایوان میں خالی نشستوں کی تعداد ۳۴ تک پہنچ گئی[۲]۔

---

[۱] مشرقی پاکستان قانون ساز اسمبلی (جاری) ایکٹ ۱۹۵۳ء۔ اس کا ذکر کینتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) نے صفحہ ۲۹ پر کیا ہے۔ [۲] کینتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۲۹

Marfat.com

مسودہ کمیٹی کے قیام کے چار ماہ بعد عوام کے پرزور اور مسلسل مطالبے کے سامنے حکومت نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور مارچ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں نئے انتخابات کرائے گئے۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کے تمام سیاسی مخالفین نے متحدہ محاذ بنا لیا۔ یہ محاذ دو بڑی سیاسی پارٹیوں اور کئی چھوٹے سیاسی گروپوں کا ڈھیلا ڈھالا اتحاد تھا۔ ان میں قدر مشترک صرف یہ تھی کہ مسلم لیگ کو انتخابات میں شکست دی جائے۔ متحدہ محاذ کی تمام جماعتیں مشرقی پاکستان کے لیے زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری کی علمبردار تھیں۔ اس محاذ نے انتخابی مہم میں مسلم لیگ کی مخالفت کے ساتھ مغربی پاکستان کے خلاف منافرت کے جذبات کو بھی پوری طرح ابھارا اور مشرقی پاکستان کے استحصال کے سلسلہ میں افسانہ طرازی سے بھی گریز نہ کیا۔ ان انتخابات سے رائے دہندگان کے احساسات کھل کر سامنے آ گئے۔[۵] مسلم لیگ شکست فاش سے دوچار ہوئی اور ۳۱۰ کے ایوان میں اس کے صرف ۹ ارکان کامیاب ہوئے اور ایک آزاد امیدوار فضل القادر چودھری کی شمولیت سے مسلم لیگ کو ایک باضابطہ پارلیمانی گروپ کی حیثیت حاصل ہو سکی۔ مشرقی پاکستان کے ان انتخابات کا اثر مرکزی حکومت پر بھی پڑا اور یہ کہا جانے لگا کہ دستور ساز اسمبلی میں مشرقی پاکستان کے مسلم لیگی ارکان عوام کے اعتماد سے محروم ہو چکے ہیں اور اس طرح دستور ساز اسمبلی ایک نمائندہ ادارہ نہیں رہی۔ چنانچہ یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ اس غیر نمائندہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا جائے اور ملک کے لیے آئین نئی

۵۔ کیتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) صفحات ۲۹ - ۳۰

Marfat.com

دستور ساز اسمبلی بنائے۔

مشرقی پاکستان میں انتخابات سے قبل نور الامین وزیر اعلیٰ تھے۔ مسلم لیگ کی شکست کے بعد گورنر نے متحدہ محاذ کے ایک لیڈر مولوی فضل الحق کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ لیکن انتخابات میں محیر العقول کامیابی کے بعد متحدہ محاذ میں بھی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ مولوی صاحب نے شروع میں اپنی کابینہ میں صرف دو وزیر لیے۔ ابھی متحدہ محاذ میں وزارت بنانے کے سلسلے میں رسہ کشی جاری تھی کہ صوبے کے طول و عرض میں غیر بنگالیوں کے خلاف خونریز فسادات نے امن وقانون کی حالت ابتر بنا دی۔ یہ صورت حال اواخر مئی ۱۹۵۴ تک جاری رہی اور اس دوران میں وزارت کو برطرف کر کے گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ یہ سیاسی خلفشار کافی حد تک دستور سازی میں تاخیر کا باعث بنا۔

تاخیر کا دوسرا سبب لسانی تنازعہ تھا۔ آئینی مسائل میں سب سے زیادہ تند و تیز بحث قومی زبان یا زبانوں کے مسئلے پر ہوئی۔ اس مسئلہ نے باہمی بے اعتمادی اور مخاصمت کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ پاکستان کی صرف ایک قومی زبان اُردو ہونی چاہیئے یا اردو اور بنگلہ دونوں قومی زبانیں ہونی چاہئیں۔ قیام پاکستان سے پہلے صرف اردو کو برصغیر کے ہر حصے کے مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا تھا اور مذہبی اور سماجی تقریبات میں عام طور پر اُردو ہی میں اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ غیر منقسم ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوسرے اختلافات کے ساتھ زبان کا مسئلہ بھی بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ اگر ہندوؤں کی طرف سے ہندی کو ترجیح دی جاتی تھی تو اردو کو بھی مسلمانوں کی قومی زبان قرار دیا جاتا تھا۔ یہ اختلاف

Marfat.com

بہت پرانا تھا اور ۱۸۸۲ء میں اس وقت بھی بڑی شدت کے ساتھ ابھرا تھا جب یوپی کے ایک ہندو نواز انگریز گورنر نے ہندی کو دفتری زبان قرار دے دیا تھا۔ اس پر سرسید احمد خاں نے سخت احتجاج کیا تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے علیحدہ اور جداگانہ اقوام ہونے کا ذکر کیا تھا۔ اردو کو مسلمانوں کی قومی زبان قرار دینے میں بنگال کے مسلمان رہنما کسی دوسرے علاقے سے پیچھے نہیں تھے۔ مولوی فضل الحق نے کئی اردو کانفرنسوں کی صدارت کی اور ۱۹۴۲ء میں جب مولوی تمیز الدین بنگال میں وزیرِ تعلیم تھے تو انہوں نے بنگال کے تمام سکولوں میں مسلمان بچّوں کو لازمی طور پر اردو پڑھانے کے احکام جاری کیے تھے۔ اسی طرح ۱۹۴۶ء کے مسلم لیگ کنونشن میں بھی اردو ہی کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا گیا تھا۔ لیکن آزادی کے حصول کے بعد جب تحریک پاکستان کے اصل اور بنیادی مقاصد کو نظر انداز کرنے کا عمل شروع ہوا اور سیاسی مفاد کے پیشِ نظر مقامی اور صوبائی مسائل کو اہمیت دی جانے لگی تو زبان کے مسئلہ پر بھی صوبائی تعصب کے سائے پھیل گئے۔

مشرقی پاکستان میں لسانی تنازعہ کا پس منظر بھی سیاسی تھا اور یہ مسئلہ قیام پاکستان کے صرف چند ماہ بعد ہی پیدا ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت ملک نہایت مشکل اور کٹھن مسائل سے دوچار تھا۔ اوائل ۱۹۴۸ء میں طلبا کے ایک گروہ نے بنگلہ کو بھی پاکستان کی ایک سرکاری زبان بنانے کے لیے ایجی ٹیشن شروع کی۔ جب اس مسئلہ نے سر اٹھایا تو قائد اعظم کو اس میں نوزائیدہ مملکت کے لیے خطرہ محسوس ہوا۔ چنانچہ وہ بنفسِ نفیس ڈھاکہ تشریف لے گئے اور بر سر موقع انھوں نے اس تحریک کے ان خطرات کی

Marfat.com

نشاندہی کی جو ملک کی وحدت و یکجہتی کو لاحق ہو سکتے تھے۔ انھوں نے یہ کہا کہ اردو اور صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہو گی۔ البتہ اس صوبے کے عوامی نمائندے اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد جس زبان کو چاہیں صوبے میں دفتری استعمال کے لیے اختیار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا ــــ" کیا یہ بات آپ کو عجیب معلوم نہیں ہوتی کہ بھارت کے جن اخبارات کے لیے پاکستان کا نام تک ناقابلِ برداشت تھا اب انھوں نے زبان کے مسئلہ پر آپ کے لیے ایک خود ساختہ محاذ قائم کر لیا ہے۔ سارے ملک کی سرکاری زبان صرف اُردو ہی بن سکتی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے صرف اسی زبان کی آبیاری کی ہے۔ اور اس کا دنیائے اسلام کی دوسری زبانوں سے بھی گہرا اور قریبی رشتہ ہے۔" [1] قائداعظم کے اس بروقت اقدام سے لسانی تنازعہ وقتی طور پر دب گیا لیکن ان کی وفات کے بعد مشرقی پاکستان میں بنگلہ کے بارے میں جذبات ایک مرتبہ پھر بڑی شدت اختیار کر گئے۔ مسلم لیگی لیڈروں نے جن پرانے کارکنوں کو اپنے خودغرضانہ مفاد میں نظرانداز کیا تھا انھوں نے بھی بنگلہ کے مسئلہ کو ابھارنے میں نمایاں حصہ لیا اور اس طرح یہ احساس ہونے لگا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے بنگلہ کو ایک قومی زبان کا درجہ دلانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ مشرقی پاکستان آبادی کے لحاظ سے اکثریتی صوبہ تھا اور وہاں کی آبادی کی اکثریت کی زبان بنگلہ تھی بنگلہ کو قومی زبان بنانے کی تحریک میں بعض

---

[1] روزنامہ مشرق لاہور ۶ رمئی ۱۹۶۴ء اس کے علاوہ تفصیل کے لیے دیکھیں قائداعظم کی تقریریں بحیثیت گورنر جنرل۔

دوسرے اسباب نے بھی اہم حصہ لیا۔

آزادی کے بعد بھارت کے مختلف علاقوں سے اردو بولنے والے جو افسر، اہل کار، تاجر، صنعت کار اور دوسرے مہاجرین مشرقی پاکستان گئے ان کے بارے میں یہ احساس و تاثر پیدا ہونے لگا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بنگالی مسلمانوں سے اعلیٰ مخلوق سمجھتے ہیں۔ مغربی پاکستان سے جو افسر وہاں بھیجے گئے انھوں نے بھی اس تاثر کو تقویت پہنچائی۔ دوسری طرف مغربی پاکستان میں بھی اردو کے علمبرداروں نے احتیاط سے کام نہ لیا اور جوش سے مغلوب ہو کر حزم و احتیاط کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیا اور بنگلہ کے سلسلے میں کچھ ایسی توہین آمیز باتیں بھی کہیں جن پر مشرقی پاکستان میں بڑا غم و غصّہ ظاہر کیا گیا۔ فروری ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ میں تیسری پاکستان تاریخ کانفرنس میں صدارتی خطبہ کے دوران میں مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ کہہ دیا کہ بنگلہ میں ہندو ثقافت کی بھرمار ہے اس لیے یہ پاکستان کی ایک قومی زبان بننے کی مستحق نہیں ہے۔ ان کی اس بات کو بے جواز اور نامناسب قرار دیا گیا اور بالآخر اس پر طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈھاکہ میں اس کے خلاف غم و غصّہ کے اظہار کی خاطر سخت مظاہروں تک نوبت پہنچی اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں فساد بھی ہوا۔ اس سے قبل وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے بھی جنوری ۱۹۵۲ء میں ڈھاکہ میں ہی اردو کو واحد قومی زبان بنانے کی حمایت کی تھی جس پر بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ صرف ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا یا عام لوگ ہی بنگالی کو ایک قومی زبان بنانے کے حامی نہیں تھے بلکہ مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ بھی اس کی تائید کرتی تھی۔ چنانچہ زبان کے مسئلہ پر تحریک شروع ہو گئی، مظاہروں نے امن و قانون کا مسئلہ پیدا کر دیا جس پر قابو پانے کے لیے پولیس کی فائرنگ

Marfat.com

سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے چند طالب علم ہلاک ہوگئے۔ مشرقی پاکستان کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے خلاف صف آرا متحدہ محاذ نے مسئلہ زبان کی واشگاف اور بھرپور حمایت کی اور اپنے ۲۱ نکاتی پروگرام میں بنگلہ کو قومی زبان بنانے کا مطالبہ بھی شامل کر دیا۔

۱۹۵۴ء میں اس مطالبے کو اس قدر تقویت حاصل ہو چکی تھی کہ دستور ساز اسمبلی نے بھی اس پر باضابطہ غور و خوض کیا۔ آئین ساز کئی ماہ تک قابل قبول حل تلاش کرتے رہے لیکن یہ مسئلہ کافی مشکل اور پیچیدہ تھا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کے اس مطالبے کو مغربی پاکستان میں تحریک پاکستان کے بنیادی مقاصد سے انحراف قرار دیا جاتا تھا۔ بالآخر دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے ۲۰ اپریل ۱۹۵۴ء کو یہ فیصلہ کیا کہ اردو اور بنگلہ دونوں پاکستان کی سرکاری زبانیں ہونی چاہئیں[1]۔ کراچی میں اس فیصلے کے خلاف مظاہرے ہوئے اور بہت سخت احتجاج کیا گیا[2] لیکن یہ مسئلہ اب طے ہو چکا تھا۔ اس فیصلے کے مطابق ۸ مئی ۱۹۵۴ء کو "جمہوریہ کی زبانیں" کے زیر عنوان ۸ دفعات پر مشتمل مسودہ آئین کا ایک نیا باب دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا جسے من و عن منظور کر لیا گیا۔

حقیقت پسندی سے جائزہ لیں تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ ایک سے زائد قومی زبانوں کی وجہ سے قومی وحدت کے لیے کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ایک ہی قومی زبان کو ترجیح اور فوقیت دی جاتی ہے۔

---

[1] ڈان کراچی ۲۰ اپریل ۱۹۵۴ء

[2] ایضاً ۲۳ اپریل ۱۹۵۴ء

Marfat.com

چنانچہ قائدِ اعظم کا ۱۹۴۸ء میں یہ مشورہ بالکل صحیح تھا کہ صرف ایک ہی قومی زبان اختیار کرنی چاہیئے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد ؎

وہ بات کو ہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ

کے مصداق قومی قیادت میں صوبائی جذبات کی راہ میں حائل ہونے کی صلاحیت کمزور ہوگئی اور بالآخر مرکز گریز رجحانات اتنی تقویت اختیار کر گئے کہ قومی وحدت اور یک جہتی کا احساس وجذبہ روز بروز کمزور ہوتا گیا ان حالات میں مشرقی پاکستان کے عوام کے اس پُرزور مطالبے کو نظر انداز کرنا حقیقت پسندانہ نہ تھا اور ایک ہی قومی زبان پہ اصرار قرین دانش نہ تھا۔ اس کے برعکس بنگلہ کے حامیوں کی طرف سے یہ کہا جاتا تھا کہ بنگلہ کو ایک قومی زبان تسلیم کرنے سے مشرقی پاکستانی عوام کے جذبہ حب الوطنی کو تقویت پہنچے گی اور اس کے نتیجہ میں دونوں حصوں کے لوگوں میں قریبی تعلقات اور بہتر مفاہمت پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ مشرقی پاکستان کا یہ مطالبہ جمہوری ہے کیونکہ مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ اس لیے حالات کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ایک سے زائد قومی زبانوں کو تسلیم کرکے یہ مسئلہ حل کر لیا جائے۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ارباب اقتدار کو اس امر کا احساس اس وقت ہوا جب صورتِ حال ناقابلِ تلافی حد تک ابتر ہو چکی تھی۔

اس زمانے میں آئین سازی کے کام میں ایک اور سبب بھی سدِ راہ ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ اگر مرکز میں دو ایوان ہوئے تو پھر مرکزی مقننہ میں مختلف علاقائی اکائیوں کو کس تناسب سے نمائندگی دی جائے اور دونوں ایوانوں میں تقسیم اختیارات کی نوعیت کیا ہو؟ پاکستان کی جغرافیائی

Marfat.com

نوعیت اپنی مثال آپ تھی۔ نہ صرف اس کے دونوں حصوں کے درمیان ۱۲۰۰ میل کی مسافت تھی بلکہ ان میں حائل علاقہ بھی بھارت کا تھا۔ جس نے قیام پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ مزید برآں مشرقی بازو میں صرف ایک صوبہ تھا جبکہ مغربی پاکستان چار صوبوں اور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں قبائلی علاقوں میں منقسم تھا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں دونوں حصوں میں مساوی نیابت کی تجویز پیش کی تھی۔ ابتدا میں اس پر مغربی پاکستان کا ردِ عمل سخت مخالفانہ تھا کیونکہ اس تجویز سے نہ وحدانی نظام حکومت کے تقاضے پورے ہوتے تھے اور نہ وفاقی نظام کے۔ زیریں اور بالا دونوں ایوانوں میں مساوی نیابت کھلی بے اصولی تھی اور اسے مشرقی پاکستان کے مستقل غلبہ کا ذریعہ بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن بعد میں جب خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا گیا تو ان کے رخصت ہوتے ہی یہ رپورٹ بھی طاقِ نسیاں کی زینت بن گئی۔ وزیر اعظم مقرر ہونے کے بعد جب محمد علی بوگرہ نے اپنا آئینی فارمولا پیش کیا تو اس میں بھی بعض تبدیلیوں کے ساتھ مساوی نیابت کی تجویز کو برقرار رکھا گیا تھا۔ خواجہ ناظم الدین کے حامی گروپ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس تجویز کے مقدر میں ناکامی لکھی ہے۔ اس مرحلہ پر مستقل حل کی تلاش میں حکومت نے مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں کو ایک ہی واحد صوبہ کی صورت میں مدغم و متحد کرنے کی تجویز مرتب کی تاکہ دونوں حصوں میں مساوی طور پر توازن پیدا کیا جا سکے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر محمد علی بوگرہ نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ئ کو یہ اعلان کیا کہ ان کی حکومت مغربی پاکستان کی مختلف انتظامی اکائیوں کو باہمی

Marfat.com

ادغام سے ایک ہی متحدہ صوبہ بنانا چاہتی ہے کچھ عرصہ بعد جب دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی اور نئے انتخابات سے قبل عبوری کابینہ میں سہروردی وزیر قانون بنے تو انہوں نے مغربی پاکستان کو ایک ہی متحدہ صوبہ - ایک یونٹ - بنانے کا قانون مرتب کیا۔ لیکن جب انتخابات کے بعد دوسری دستور ساز اسمبلی نے ایک یونٹ کا قانون منظور کیا تو سہروردی اس وقت اپوزیشن میں تھے - بہرحال سہروردی ہمیشہ مغربی پاکستان کے ایک یونٹ کے حامی رہے اور ان کی کوششوں سے ہی ایک مرکزی ایوان میں مشرقی پاکستان نے مساوی نیابت قبول کی تھی - سہروردی نے ایک یونٹ کے لیے جو مسودہ قانون مرتب کیا تھا اسے چودھری محمد علی کی وزارت عظمٰی کے زمانہ میں منظور کیا گیا۔ چودھری صاحب ۱۰ اگست ۱۹۵۵ء کو محمد علی بوگرہ کی جگہ وزیراعظم بنے تھے اور ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کو اسمبلی نے ایک یونٹ کا قانون منظور کیا - اسے ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو نافذ کیا گیا اور مغربی پاکستان کا متحدہ صوبہ معرض وجود میں آیا -

ایک یونٹ کے قیام سے مرکزی مقننہ میں صوبوں کی نمائندگی کا مسئلہ اس قدر اہم نہ رہا اور پاکستان کے دونوں حصوں کے لیے مساوی نیابت کی راہ ہموار ہو گئی - اس طرح آئین سازی کے راستے میں وہ رکاوٹیں بھی دور ہو گئیں جن کی چٹان سے ٹکرا کر آئین سازی کی ہر کوشش پاش پاش ہو جاتی تھی - ایک یونٹ کے قیام سے یہ توقع بھی وابستہ کی گئی تھی کہ اس سے مغربی پاکستان کے مختلف حصوں کے لوگوں میں اتحاد اور یک جہتی بڑھے گی لیکن یہ توقع عارضی ثابت ہوئی، کیونکہ ایک یونٹ کے منطقی تقاضے پورے کرنے سے غفلت برتی گئی اور جو قدم یک جہتی کے فروغ کے ارادہ سے اٹھایا گیا تھا وہ روز افزوں تلخی اور خلفشار کا باعث بن گیا۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ اہم ہے لیکن ہمارے

Marfat.com

زیر بحث دور ۵۴ - ۱۹۴۷ سے متعلق نہیں ہے -

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے لیے ایک اور بنیادی اہمیت کا مسئلہ مخلوط بمقابلہ جداگانہ انتخابات کا سوال بھی تھا۔ متحدہ ہند میں جداگانہ طریق انتخاب پر عمل درآمد کا آغاز منٹو مارلے اصلاحات (۱۹۰۹) کے تحت ہوا تھا۔ اس نظام کے تحت رائے دہندگان کی فہرستیں علیحدہ علیحدہ مذہبی بنیادوں پر مرتب کی گئی تھیں اور ہندو، مسلمان، سکھ، یورپین نژاد اور اینگلو انڈین صرف اپنے مذہب کے مخصوص حلقوں ہی میں علیحدہ علیحدہ ووٹ ڈال سکتے تھے۔ اس نظام کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی تھی کہ متحدہ ہند میں مذہبی اقلیتیں اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ ہندوؤں کی بھاری اکثریت کی وجہ سے مخلوط انتخابات میں ان کے سیاسی، معاشی، لسانی، ثقافتی اور دوسرے مفادات کی کماحقہ حفاظت نہیں ہو سکتی۔

جداگانہ نظام انتخابات گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت بھی برقرار رہا اور اسی قانون کو بعض ترامیم کے ساتھ پاکستان نے عبوری آئین کے طور پر اختیار کر لیا تھا۔ اصلی قانون میں ایک ترمیم کے ذریعہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ہندوؤں کی پس ماندہ اقوام (اچھوتوں) کو بھی علیحدہ حقِ نیابت عطا کر دیا تھا۔ اس ترمیم کی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے شدید مخالفت کی کیونکہ انھیں یہ خطرہ نظر آتا تھا کہ اس طرح اچھوتوں پر ان کے دیرینہ غلبہ و تسلط کو کاری ضرب لگے گی۔ انھوں نے اس ترمیم کو ہندو معاشرے کو تقسیم کرنے کی کوشش قرار دیا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے اچھوتوں نے کئی یادداشتیں اور عرضداشتیں پیش کر کے

Marfat.com

اپنے لیے جداگانہ حق نیابت کی پر زور حمایت و تائید کی۔

بہر حال بد قسمتی سے مسلم لیگ اس معاملے میں تذبذب کا شکار ہو گئی اور کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے معذور رہی۔ یہ مسئلہ مشرقی پاکستان میں بڑی سیاسی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ وہاں ایک کروڑ کے لگ بھگ ہندو تھے جو مشرقی پاکستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ بنتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں مستحکم وزارت کے لیے ہندو گروپ کی حمایت ناگزیر تھی اور وہاں کے ہندوؤں کی اکثریت چونکہ مخلوط انتخابات کی حامی اور علمبردار تھی اس لیے مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ پارٹی بھی ان کے اس مطالبے کی تائید و حمایت کرنے لگی۔ مغربی پاکستان میں صورتِ حال چونکہ یکسر مختلف تھی اس لیے یہاں اس مسئلہ کو کبھی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔

دستور ساز اسمبلی کا خاتمہ

پاکستان میں آئین سازی کی تاریخ ایک اہم واقعہ کے ذکر کے بغیر ادھوری رہ جائے گی یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پیش آیا۔ اس واقعہ کے صحیح فہم و ادراک کے لیے ان سابق اسباب و معاملات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس واقعہ پر منتج ہوئے۔

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو معرضِ وجود میں آئی تھی اور اسے دوگونہ فرائض سپرد کیے گئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ ملک کے لیے نیا آئین تیار کرے اور دوسرا یہ کہ آئین کی تیاری اور نفاذ تک وفاقی مقننہ یا قومی پارلیمنٹ کے طور پر بھی کام کرے۔ اگرچہ مجلس قانون ساز کے طور پر بھی اس کی کارکردگی قابلِ رشک نہیں تھی لیکن آئین ساز ادارے کے طور پر اس کی ناکامی بدرجہا زیادہ

Marfat.com

نمایاں بلکہ اظہر من الشمس تھی ۔ قیام پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے لیاقت علی خاں کے سانحہ قتل ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء تک اس کی واحد کارکردگی قرار داد مقاصد کی منظوری تھی ۔ دستور ساز اسمبلی نے بنیادی اصولوں کی جو پہلی رپورٹ مرتب کی اسے یکسر ناقابلِ اعتنا سمجھا گیا اور یہ بات از حد حوصلہ شکن تھی کہ اس کے بعد لیاقت علی خاں نے آئین سازی میں سرے سے کوئی مزید کوشش ہی نہ کی ۔ ان کے بعد خواجہ ناظم الدین نے دوسری رپورٹ مرتب کرنے میں سوا سال کا عرصہ گزار دیا ۔ اس دوسری رپورٹ میں بین الصوبائی مساوات کی تجویز نے قوم کو منقسم کر دیا ۔ ان کے جانشین محمد علی بوگرہ کو بھی وزیر اعظم بنے اٹھارہ ماہ گزر گئے ، لیکن آئین سازی کی ساعت سعید طلوع ہونے میں نہ آتی تھی ۔ ان کے زمانہ اقتدار میں پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کو مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات میں شکست فاش ہوئی اور ان انتخابات میں محیّر العقول کامیابی حاصل کرنے والے متحدہ محاذ نے یہ اعلان اور دعویٰ شروع کر دیا کہ دستور ساز اسمبلی کے مشرقی پاکستانی مسلم لیگی ارکان اب عوام کے اعتماد سے محروم ہو چکے ہیں ۔ اس لیے وہ آئین بنانے کے اہل اور مجاز نہیں رہے ۔ مغربی پاکستان میں بھی عام لوگ مسلم لیگ سے بڑے مایوس اور غیر مطمئن ہو چکے تھے ۔ مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں حصوں میں بڑھتی ہوئی مخالفت کے باوجود جب مسلم لیگ نے آئین بنانے کی کوشش جاری رکھی تو اس سے تلخی ، شک و شبہ اور مخالفت بڑھانے کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ خاص طور پر مارچ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی بھرپور شکست کے بعد دستور ساز اسمبلی کی نمائندہ حیثیت کو بھی چیلنج کیا جانے لگا تھا ۔

Marfat.com

اخبارات کے کالموں کے ساتھ عام جلسوں میں بھی یہ الزام عاید کیا جانے لگا کہ آئین سازی میں غیر معمولی اور ناقابل جواز تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے ارکان نہ صرف خود غرض اور نااہل ہیں بلکہ وہ تاخیری حربوں سے کام لے رہے ہیں اور سیاسی سازشوں اور خود غرضانہ گروہ بندیوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور اب ان کا بنیادی مقصد ہر حیلے اور ہر حربے سے اپنے آپ کو قوم و ملک پر مسلّط رکھنا ہے۔ دستور ساز اسمبلی کی بساط لپیٹ دینے کا مطالبہ در و بام سے گونجنے لگا۔ بعد میں ایک ایسا سلسلہ واقعات ظہور میں آیا جس نے اس مسئلہ کو بہت نازک اور سنگین بنا دیا اور گورنر جنرل نے ۲۴ راکتوبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا جو انتہائی اقدام کیا ان واقعات نے اس کا جواز فراہم کر دیا۔

پہلا واقعہ یہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی نے ۲۰ ستمبر ۱۹۵۴ کو پروڈا (عوامی نمائندگی کے منصب سے نااہلی کا قانون) منسوخ کر دیا۔ یہ قانون ۱۹۴۸ء میں قائداعظم نے نافذ کیا تھا اور اس کے تحت لوگوں کو بدعنوان وزیروں اور سیاستدانوں کا محاسبہ کرنے کا حق و اختیار حاصل تھا۔ اسی قانون کے تحت سندھ کے وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اور انھیں چند برس کے لیے عوامی نمائندگی اور کوئی سیاسی عہدہ لینے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔

دوسرا واقعہ اس سے اگلے دن پیش آیا جب ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعات ۹، ۱۰، ۱۰ الف اور ۱۰ اب اور ۷۰ کو بھی یکایک منسوخ کر دیا۔[1] ان دفعات کے تحت

---

[1] ایوب خاں (بحوالہ سابقہ) صفحہ نمبر ۵۰

گورنر جنرل کو کابینہ توڑ دینے کا حق و اختیار حاصل تھا۔ اس کارروائی کا مقصد کابینہ کو برطرف کرنے کے سلسلے میں گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنا تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے اس سے پہلے ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت برطرف کر دی تھی۔ مذکورہ دفعات کی منسوخی کی ساری کارروائی بڑے پراسرار انداز میں بڑی عجلت کے ساتھ اور گورنر جنرل کے علم کے بغیر اس وقت کی گئی جب وہ دارالحکومت میں موجود نہیں تھے۔ یہ ترمیم ایک ہی دن میں دستور ساز اسمبلی سے برق رفتاری سے منظور کرائی گئی اور ایوان سے منظوری حاصل کرنے کے دن ہی اسے پاکستان کے سرکاری گزٹ میں بھی شائع کر دیا گیا۔[۱] یہ کارروائی بدلہ اور انتقام لینے کے انداز میں کی گئی تھی۔ سارے ماحول پر سازشی سکوت طاری تھا اور بیک جنبش قلم گورنر جنرل کو سارے اختیارات سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کارروائی کے انداز سے سیاسی حلقے حیرت زدہ رہ گئے اور یہ بات اونٹ کی پشت پر آخری تنکا ثابت ہوئی۔ اچانک اس سے بھی زیادہ غیر متوقع اور ہوشربا جوابی کارروائی ہوئی۔ گورنر جنرل غلام محمد بہ عجلت تمام کراچی واپس پہنچے۔ انھوں نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ایوب کھوڑو اور دوسرے سیاستدانوں کے خلاف پروڈا کے تحت عائد کردہ الزامات اور مقدمات واپس لے لیے اور ان کا دامن سیاسی گناہوں کے داغوں سے دھو دیا۔ اس زمانے میں ممتاز دولتانہ کے خلاف بھی پروڈا کی کارروائی کا امکان تھا۔ گورنر جنرل نے وہ کارروائی بھی واپس لے لی۔[۲] اس طرح

---

[۱] ایوب خاں بحوالہ سابق ص ۵۰ [۲] Lengthening Shadows,
Syed Shabbir Hussain, Mujahid Publications, Rawalpindi (1970) Pp. 45-46.

Marfat.com

انہوں نے مغربی پاکستان کے دو بڑے صوبوں پنجاب اور سندھ کے راہنماؤں کے ساتھ سیاسی الحاق کر کے اپنی پوزیشن مضبوط بنالی۔ یہ سودہ بازی کرنے کے بعد انھوں نے دستور ساز اسمبلی کے خلاف بڑھتی ہوئی رائے عامہ سے فائدہ اٹھا کر ایک فرمان[۱] جاری کر کے انتقام کی پیاس بجھالی۔ اور ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے ۲۴ اکتوبر کو مرکزی وزارت کو برطرف کر دیا دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا[۲] اور اپنی اس کاروائی

---

[۱] فرمان حسب ذیل تھا: "ملک جس سیاسی بحران سے دوچار ہے گورنر جنرل اس کا جائزہ لینے کے بعد اس افسوسناک نتیجہ پر پہنچا ہے کہ آئینی مشینری شکست وریخت کا شکار ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس نے پاکستان بھر میں ہنگامی حالات کا اعلان کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ موجودہ دستور ساز اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی ہے اور اب اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ آخری حق واختیار عوام کو حاصل ہے اور وہی تمام مسائل بشمول آئینی مسائل کا حل اپنے منتخب کردہ نمائندوں کی وساطت سے کریں گے۔ آزادانہ انتخابات حتی الوسع جلد از جلد ہوں گے۔" ڈان کراچی ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء

مذکورہ بالا فرمان کے سلسلہ میں ایک قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس میں دستور ساز اسمبلی کے توڑے جانے کا واضح اور واشگاف انداز میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس میں صرف یہ کہا گیا تھا کہ یہ دستور ساز اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی ہے اور اب اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ جی ڈبلیو چودھری (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۸۴

[۲] اسمبلی توڑنے کے شرمناک ڈرامے کا ذکر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے بھی کیا ہے۔ وہ اس حادثے کے عینی گواہ ہیں۔ انھوں نے جس انداز سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس سے غلام محمد کے آمرانہ مزاج، محلاتی سازشوں، سیاستدانوں میں حب الوطنی اور کردار کے

(باقی صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کا یہ جواز پیش کیا کہ دستور ساز اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔ چنانچہ صورت

گذشتہ سے پیوستہ :- قحط اور وزیر اعظم کی بے بسی کا مکمل اور سبق آموز جائزہ ملتا ہے۔ اگر وزیر اعظم قوم کا صحیح نمائندہ ہوتا تو شاید وہ حالات کا مقابلہ قدرے جرأت سے کر سکتا۔ گورنر جنرل کو اختیارات سے محروم کرنے کے بعد وزیر اعظم ظفر اللہ خاں، ایوب خاں اور چودھری محمد علی کی معیت میں امریکہ چلے گئے تھے۔ ابھی یہ وفد امریکہ میں ہی تھا کہ انھیں گورنر جنرل کا حکم نامہ ملا کہ فوراً وطن واپس لوٹ آئیں۔ وفد لندن پہنچا تو ہوائی اڈے پر انھیں گورنر جنرل کے ٹیلی فون کی اطلاع ملی۔ اس کے بعد وزیر اعظم کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ پاکستان آنے سے خوفزدہ تھے۔ بہر حال کراچی پہنچے اور چودھری محمد علی، ایوب خاں اور اسکندر مرزا گورنر جنرل سے ملنے گئے تو گالیوں نے ان کا استقبال کیا۔ اسی ملاقات میں غلام محمد نے ایوب خاں کو عنان اقتدار سنبھالنے کی پیشکش کی۔ بہر حال دوستوں کی کوششوں کے سبب گورنر جنرل اور وزیر اعظم میں صلح وصفائی کرائی گئی اور پھر محمد علی بوگرہ کو غلام محمد کے سامنے پیش کیا گیا۔ غلام محمد نے اس دفعہ بھی بدستور گالیاں دیں۔ اس موقع پر سہروردی نے زیورچ سے بیان جاری کیا جس میں دستور ساز اسمبلی کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بیان گورنر جنرل کے ایما پر جاری ہوا تھا اور غلام محمد نے اس مقصد کے لیے باقاعدہ اپنا نمائندہ سہروردی کے پاس بھیجا تھا۔ بہر حال گورنر جنرل اور وزیر اعظم میں معاہدہ ہوا اور اس کے مطابق اسمبلی توڑ دی گئی اور محمد علی بوگرہ نے نئی کابینہ بنائی۔

(تفصیل کے لیے دیکھیں فرینڈز ناٹ ماسٹرز بحوالہ سابقہ ص ۵۴-۵۰) چودھری محمد علی نے مصنف کو ایک ذاتی ملاقات میں مزید بتایا کہ جب بوگرہ کو غلام محمد کے سامنے لایا گیا تو غلام محمد نے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا اور جب تک بوگرہ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کر لیا گورنر جنرل اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دیتا رہا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ جب یہ کارروائی ہو رہی تھی تو محمد ایوب خاں ریوالور ہاتھ میں پکڑے پس پردہ کھڑے تھے۔

Marfat.com

حالات اپنے منطقی انجام تک پہنچ گئے پچھلے سات سال میں آئین سازی کے لیے جو کوششیں ہوئی تھیں اور اس سلسلہ میں جو ابتدائی تیاریاں کی گئی تھیں ملک کے اعلیٰ ترین انتظامی حاکم نے بیک جنبش قلم ان پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ گورنر جنرل کے طور پر غلام محمد کا یہ دوسرا من مانا اقدام تھا۔ پہلا قدم اس سے اٹھارہ ماہ پہلے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کی برطرفی کی صورت میں اٹھایا گیا تھا۔

غلام محمد کے آمرانہ مزاج اور غیر جمہوری اقدام نے پاکستان میں جمہوریت کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ اس نے توہین اور غصّے کی آگ بجھانے کے لیے عوام کے منتخب کردہ اور ملک کے سب سے اعلیٰ اور حاکم ادارے کو حرفِ غلط کے مانند منسوخ کر دیا۔ ملک کو ان اقدام کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی اور بالآخر جمہوریت کے دیوالیہ پن نے مارشل لا کے نفاذ کے لیے راہ ہموار کر دی۔ تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ محمد علی فارمولا دستور ساز اسمبلی منظور کر چکی تھی اور اب بقول وزیر اعظم دستور کے بنانے میں محض ایک "رسم وفا" باقی تھی۔[۱] اس موقع پر اگر دستور بن جاتا اور ملک بھر میں عام انتخابات منعقد کر لیے جاتے تو یقیناً پاکستان ان تمام مصائب اور مشکلات سے بچ جاتا جن کا اسے بعد ازاں سامنا کرنا پڑا اور شاید ملک خون کی اس ندی سے بھی محفوظ رہتا جو بعد ازاں مشرقی اور مغربی پاکستان میں مستقل طور پر حائل ہو گئی۔ آج ملک

---

[۱] روزنامہ ڈان کراچی ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء

زندگی کے جس خطرناک دوراہے پر کھڑا ہے وہاں تک اسے پہنچانے میں غلام محمد کا بہت زیادہ حصّہ ہے۔

اس صورتِ حال سے ایک اور احساس بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ جب غلام محمد نے جو عوام کے منتخب کردہ نمائندے نہیں تھے، دستورساز اسمبلی کو منسوخ کر دیا تو ملک بھر میں کسی گوشے سے بھی احتجاج نہ ہوا بلکہ اسے اکثر سیاستدانوں اور کمانڈر انچیف، محمد ایوب خاں کی بھی حمایت مسلسل حاصل رہی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عوام دستورساز اسمبلی سے مایوس ہو چکے تھے لیکن اسے یوں منسوخ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ ہمارے سیاسی لیڈروں نے اس موقع پر جس پست ذہنیت کا ثبوت دیا اس سے سیاستدانوں کے خوشامدانہ ذہن کی ہلکی سی عکاسی ہوتی ہے۔ پاکستان کی مختصر سی تاریخ میں اس ذہنیت کا مظاہرہ اکثر کیا گیا۔ چنانچہ ملک کے جمہوری ادارے جنہیں پروان چڑھانے کے لیے ہمت اور قربانیوں کی ضرورت تھی، بے اصول سیاستدانوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔

دستورساز اسمبلی کو توڑنے کی کاروائی پر اس لیے بھی نکتہ چینی کی جاتی رہی ہے کہ اس کے لیے جو وقت منتخب کیا گیا وہ انتہائی نامناسب تھا۔ کیونکہ ستمبر میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ترمیم منظور کی گئی تھی اور اس کے بعد اکتوبر ۱۹۵۴ء میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکتا کہ دستورساز اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی تھی، سوا اس بات کے کہ اس نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ترمیم کے ذریعے گورنر جنرل کے اختیارات محدود کر دیئے تھے۔ مزید برآں اسمبلی نے آئین سازی کا کام اس حد تک مکمل کر لیا تھا کہ وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے آئین کے نفاذ کے لیے

Marfat.com

۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ کی تاریخ بھی مقرر کر دی تھی۔ ایسے مرحلہ میں دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس سے نہ صرف ملک کے اندر ایک نیا سیاسی و آئینی تعطل پیدا ہو گیا بلکہ بیرون ملک بھی پاکستان کی ساکھ اور وقار کو سخت نقصان پہنچا۔

مولوی تمیز الدین نے گورنر جنرل کے غیر جمہوری اقدام کے خلاف احتجاج کا انوکھا طریقہ اختیار کیا اور اسمبلی کی عمارت کے سامنے نیلے آسمان کے نیچے فٹ پاتھ پر بستر بچھا لیا۔ لوگوں نے ان کے اس انداز کو بہت پسند کیا[1]

عام احساس و تاثر یہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی اپنی آزادی و خود مختاری اور مکمل حاکمیت کے اعتبار سے ایک دائمی ادارہ ہے اور اسے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ گورنر جنرل اور اس کی کابینہ کے خلاف عدالتی چارہ جوئی تک نوبت پہنچی اور کالعدم دستور ساز اسمبلی کے صدر اور سپیکر مولوی تمیز الدین خاں نے اس بنیاد پر سندھ چیف کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا کہ قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ کی دفعہ ۸ (ذیلی دفعہ الف) کے تحت قانون سازی کے معاملہ میں گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اس لیے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کی کارروائی خلافِ قانون اور غیر آئینی ہے۔ سندھ چیف کورٹ کے فل بینچ نے مولوی تمیز الدین کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا کہ دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کی کارروائی خلافِ قانون ہے۔ حکومت نے اس فیصلے کے خلاف وفاقی عدالت میں اپیل کی جس نے نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کرانے کی شرط کے تحت گورنر جنرل کے اس اقدام کو جائز قرار دے دیا۔ بعد

---

[1] روزنامہ امروز لاہور ۲۶ مارچ ۱۹۷۳ء رنجارہ کا کالم ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

ازاں فیڈرل کورٹ کے جج منیر صاحب نے کئی مواقع پر تسلیم کیا کہ عدالت کا یہ فیصلہ سیاسی مصلحتوں اور ملکی تقاضوں کے پیش نظر کیا گیا تھا۔ [1] حالانکہ قانونی نقطۂ نظر سے اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

بعض اخبارات کا ردِّ عمل بھی دلچسپ تھا۔ دہلی کے اخبار "سٹیٹسمین" نے پاکستان میں دستور ساز اسمبلی کے توڑے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ "مسلم لیگ کے بغیر پاکستان کا خیال و تصور بھی محال ہے لیکن اس میں لڑائی جھگڑوں نے اسے بہت زبون حال بنا دیا ہے اور مملکت کی بنیادیں تک خطرہ میں پڑ گئی ہیں۔" [2] لاہور کے روزنامہ "زمیندار" نے لکھا "مملکت کے استحکام کے لیے اس جرأت مندانہ اقدام پر ہم تہ دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔" [3] لاہور کے انگریزی اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے لکھا ــ "ملک نے غیر موثر اور دھڑے بندیوں کی شکار دستور ساز اسمبلی سے ڈرامائی نجات پانے پر سکھ کا سانس لیا ہے۔ اس اسمبلی نے ملک کے اعلیٰ ترین مفاد کو خطرے میں ڈال کر سیاست برائے اقتدار کے جنونی تعاقب کو مشغلہ بنا لیا تھا۔ گورنر جنرل نے اس دستور ساز اسمبلی کو توڑ کر ملک کو اس مکمل تباہی سے بچا لیا ہے جس کی طرف یہ کشاں کشاں لیے جا رہی تھی" [4]

اس بحث کو سمیٹتے وقت یہ اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے

---

[1] ہفت روزہ لیل و نہار پاکستان نمبر مارچ ۱۹۷۳ء صفحہ نمبر ۴۶

[2] روزنامہ "سٹیٹسمین" دہلی ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء

[3] روزنامہ "زمیندار" لاہور ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء

[4] روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء

Marfat.com

۱۹۵۴ء تک آئین سازی کی رفتار و ترقی کا تنقیدی جائزہ لینے سے وہ پیچیدہ مسائل و معاملات بھی سامنے آجاتے ہیں جن سے آئین ساز دوچار رہے تھے۔ انھیں آئینی و سیاسی معاملات کے علاوہ کئی اور مشکل مسائل بھی درپیش تھے مثلاً کشمیر کا مسئلہ مہاجرین کی آباد کاری وغیرہ جن کی طرف حکومت کو دوسرے معاملات چھوڑ کر ساری توجہ مبذول کرنی پڑتی تھی۔ اس ضمن میں پاکستان کی عوامی زندگی (سیاست) میں بد انتظامی اور بے ضابطگیوں کا ذکر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بہرحال آئین سازی میں سب سے بڑی رکاوٹ مرکز میں مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین ربط و تعلق کا مسئلہ تھا۔

پاکستان میں پارلیمانی نظام حکومت کی ناکامی کے اسباب و محرکات اور نوعیت کا تجزیہ کرتے ہوئے صدر ایوب خاں کے مقرر کردہ خاص کمیشن نے ۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو اپنی رپورٹ میں بتایا تھا ــ قیادت کے فقدان کا نتیجہ پوری طرح منظم و مربوط سیاسی پارٹیوں کے فقدان کی صورت میں نکلا۔ ناکامی کی بنیادی وجوہ سیاستدانوں میں کردار کا فقدان اور انتظامیہ میں ان کی بے جا مداخلت تھیں۔" اس کمیشن کے نتائج فکر کا حسب ذیل امور سے بھی ثبوت مل جاتا ہے۔

گورنر جنرل نے اپریل ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کیا تھا حالانکہ انہوں نے اس سے صرف چند دن پہلے کسی مشکل کے بغیر اپنا بجٹ منظور کرایا تھا اور پنجاب میں اینٹی قادیانی تحریک کی وجہ سے جب میاں ممتاز دولتانہ وزارت اعلیٰ سے علیحدہ ہوئے تو خواجہ ناظم الدین نے صدر پاکستان مسلم لیگ کی حیثیت میں اپنے نامزد وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون کو پنجاب مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا لیڈر منتخب کرا لیا تھا۔ چونکہ انہیں ایوان کا

Marfat.com

پورا اعتماد حاصل تھا۔ اس لیے گورنر جنرل نے انہیں برطرف کر کے بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ گورنر جنرل ہرگز یہ قدم اٹھانے کی جرأت نہ کرتا اگر اسے حکمران پارٹی کے بعض سرکردہ ارکان کی پوری حمایت حاصل نہ ہوتی۔ اس حمایت و تائید کا واضح ثبوت فوراً سامنے آگیا جب خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے چھ ارکان نئی کابینہ میں بھی شامل ہو گئے۔ گورنر جنرل نے امریکہ میں سفیر پاکستان محمد علی بوگرہ کو اپنے طور پر وزیر اعظم نامزد کیا تھا وہ ۱۹۴۸ء سے سفارتی خدمات کے سلسلہ میں ملک سے باہر رہے تھے لیکن جس پارٹی نے ابھی حال ہی میں بجٹ اجلاس کے دوران میں خواجہ ناظم الدین کا پورا ساتھ دیا تھا اس نے ان کے برطرف ہونے کے بعد نئے نامزد وزیر اعظم کو رتی بھر احتجاج و اضطراب کے بغیر اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ گورنر جنرل کو بخوبی معلوم تھا کہ مسلم لیگ پارٹی میں اپنے لیڈر سے وفاداری کا جوہر اور باہمی اتحاد مفقود ہے اس لیے اس نے کوئی خوف اور خطرہ محسوس کیے بغیر انتہائی قدم اٹھا لیا۔

Marfat.com

باب ۶

داستانِ زوال

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد مسلمانانِ ہند و پاک کے ذہنی افق پر مایوسی اور شکست کے سائے پھیل گئے تھے۔ اپنی سلطنت کے خاتمے اور انگریزوں کے غلبے کے باعث ان کا وجود اور ایک الگ قوم کی حیثیت سے اُن کا تشخص سخت خطرے میں پڑ گیا۔ اس مرحلے پر سر سید احمد خان ایک روشن ستارے کے مانند برِ عظیم پاک و ہند کے افق پر نمودار ہوئے اور امید کی روشنی بن کر پھیل گئے انھوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم اور ترقی پسندانہ سیاسی نظریات سے روشناس کیا اور انھیں زمانے کے تقاضے سمجھانے کی سعی کی۔ تھوڑے ہی عرصے میں سر سیّد کی تعلیمی و سیاسی سرگرمیوں نے مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونک دی۔

مسلمان غیر ملکی ثقافت کے اثر و نفوذ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نفرت کا ہدف نئے حکمرانوں کی زبان بھی تھی، لیکن ہندوؤں کو انگریزوں سے ایسی کوئی پرخاش نہیں تھی۔ اُنھوں نے نئے نظام سے ہم آہنگی پیدا کر لی اور انگریزوں نے ان کے لیے جو مواقع بھی پیدا کیے، ہندوؤں نے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس طرح ہندو برّصغیر کے معاشرے میں ایک ترقی پذیر طبقے

Marfat.com

کے طور پر ابھر رہے تھے۔ وہ ایک علیحدہ سیاسی وجود کے طور پر نئے شعور سے سرشار ہو رہے تھے۔ انگریز حکومت کی سرپرستی کے سبب وہ معاشی میدان میں بھی مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ انڈین نیشنل کانگرس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی تو ہند میں سیاسی سرگرمیوں میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور ہندوؤں کو ایک سیاسی پلیٹ فارم بھی مل گیا۔ اس کے برعکس مسلمان الگ تھلگ تھے۔ جب کبھی بھی انہوں نے ایک علیحدہ سیاسی تحریک کے طور پر منظم ہونے کی ضرورت محسوس کی تو ان کی کوشش کا واحد مقصد اپنے تشخص اور مفادات کی حفاظت ہوتا تھا کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ اکثریت میں قوم پرستی کے شعور کا ابھرتا ہوا طوفان ان کے تشخص اور مفادات کو بہا لے جائے گا۔ سرسید احمد خان نے بھانپ لیا تھا کہ اگر مسلمانوں نے مغربی علوم کے خلاف اپنے تعصبات سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا تو مسلم قوم کو بہت سے خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کو احساس تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس کے ایک مضبوط سیاسی قوت بننے کا منطقی نتیجہ ہندوؤں کا مسلمانوں پر غلبہ و تسلط ہوگا۔ انہوں نے مسلمانوں میں اس خطرے کا شعور پیدا کیا۔ چنانچہ ان کی نگارشات نے مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ اور سیاسی شعور اجاگر کیا جس نے بالآخر مسلم لیگ کے قیام کی راہ ہموار کی۔

مسلمانوں کے بارے میں کانگرس کا رویہ معاندانہ تھا۔ ۱۹۰۶ء میں جب مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی، یہ بات ایک بیّن حقیقت بن چکی تھی کہ کانگرس ایک خالصتاً ہندو تنظیم ہے اور وہ کبھی اور کسی صورت میں مسلمانوں کے حقوق و مفادات کی پاسداری نہیں کرے گی چنانچہ مسلمان اپنی علیحدہ تنظیم — مسلم لیگ — قائم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سرسید احمد خان کی نگارشات اور مسلم لیگ کی پالیسیوں نے مسلمانوں

Marfat.com

میں یہ احساس بیدار کیا کہ انہیں آنے والے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیئے تیار رہنا چاہیئے ورنہ انہیں ہندوؤں کا محکوم بن کر زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ یہ خدشات کانگرس کے ان سیاسی اقدامات کا صحیح پرتو تھے جو اس نے اپنے قیام سے لے کر ۱۹۰۶ء تک کیے تھے۔ یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ مسلمان راہنما عوام کے استحصال کے لئے یا ذاتی مفاد کے پیش نظر ان خدشات کو ہوا دیتے تھے جیسا کہ انتہا پسند سندھی لیڈر جی۔ ایم سیّد نے لکھا ہے کہ — "مسلم لیگ کے لیڈر مسلمانوں پر ہندوؤں کے غلبہ کو بڑھا چڑھا کر بڑی خطرناک بات قرار دیتے تھے اور اس طرح اُنھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان دائمی علیحدگی کی خلیج حائل کر دی[1]"۔ جی ایم۔ سیّد قیامِ پاکستان سے دو اڑھائی سال پہلے تک خود مسلم لیگ کے ایک ممتاز لیڈر تھے لیکن جب انہیں بعض نامناسب سرگرمیوں کی پاداش میں مسلم لیگ سے نکالا گیا تو وہ اس جماعت کے زبردست مخالف بلکہ دشمن بن گئے۔ پاکستان کی گذشتہ تاریخ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جی ایم سید ابھی تک اپنی اس توہین کا بدلہ پاکستان سے لے رہے ہیں چنانچہ ان کے اس بیان پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانوں میں ہندوؤں کے غلبہ کے خوف کو اس لیے خوب اُبھارا کہ اس طرح مسلمان متحد ہو کر مسلم لیگ کی حمایت کریں گے[2]۔ جی ایم سیّد نے اس طرح

---

[1] مسلم لیگ کی مخالفت کیوں؟ — جی ایم سید حیدر آباد سندھ (۱۹۵۳ء) صفحہ ۷۰

[2] "مسلم لیگ کے لیڈروں نے مقتدر ہندو لیڈروں کے خود غرضانہ اور تنگ نظرانہ رویہ سے فائدہ اُٹھایا اور سرمایہ دار طبقہ اور معدودے چند تعلیم یافتہ لوگوں کے ایما پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں دائمی کشمکش پیدا کر دی۔ اُنھوں نے ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے بالکل فنا ہو جانے کے خطرہ کو خوب استعمال کیا اور بڑے نظم و ضبط کے ساتھ لڑنے کے لیے ایک متحدہ محاذ بنا لیا۔ مسلمانوں کی حمایت سے مسلم لیگی لیڈروں کا یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا اور پاکستان معرضِ وجود میں آگیا"۔ جی ایم سیّد (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۷۰

Marfat.com

تصویر کا صرف ایک رخ پیش کیا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہندوؤں کا غلبہ کوئی فرضی خوف نہیں تھا، اس لئے مسلم لیگ کی طرف سے اس سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کانگریس کی طرف سے بعض معاندانہ اقدامات اور مسلمانوں کے خلاف واقعات کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں فی الواقع یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر ہندوؤں کو غلبہ حاصل ہو گیا تو پھر ان کی "داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"۔

تقسیم سے قبل مسلمانوں میں علیحدہ قومیت کا احساس اور شعور پورے عروج پر تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اس جذبہ و احساس میں بتدریج کمی ہوتی گئی۔ چنانچہ پاکستان میں مسلمان اس طرح فعال اور مستعد نہ رہے جس طرح وہ تقسیم سے پہلے تھے۔ یہ کسی حد تک قدرتی بات بھی تھی کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانوں کے سامنے ایک آزاد مسلم مملکت کے حصول کا نصب العین رکھا تھا اور جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو پھر ان کے اطمینان نے بتدریج غفلت کا رنگ اختیار کر لیا۔ وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ نئے عزم کے ساتھ ملکی استحکام کا پروگرام مرتب کرتی، قوم کے سامنے ایک نیا نصب العین رکھتی اور عوام کو تقسیم کے مسائل کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرتی لیکن مسلم لیگ اس معاملے میں بالکل ناکام رہی۔ مسلم لیگ نے بلاشبہ پاکستان حاصل کر کے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا لیکن صرف اسی کارنامے سے تمام نئے تقاضے پورے نہ ہو سکتے تھے۔ اس کے لئے تو ایک نئے اور حیات آفرین پروگرام کی ضرورت تھی۔ مسلم لیگ کے لئے ضروری تھا کہ اس نے ۱۹۴۶ء میں اپنے منشور میں جو وعدے کئے تھے، اب انہیں پورا کرنے کے لئے واضح لائحہ عمل اختیار کرتی۔ اس طرح وہ لوگوں کی صلاحیتوں اور جذبے کو ایک نئے نصب العین کے حصول کے لئے مرکوز کرنے میں کامیاب ہو جاتی اور برطانوی سامراج کے کھنڈر پر پاکستان یقیناً ایک عظیم اور مستحکم ملک کے طور پر اُبھرتا اور یہ کامیابی مسلم لیگ کیلئے

سونے پر سہاگہ ثابت ہوتی۔ مسلم لیگ کا فرض تھا کہ وہ مساوات اور معاشرتی انصاف کی بنیادوں پر ایک معاشرتی نظام کی بنیادیں تعمیر کرتی لیکن مسلم لیگ نے کسی تعمیری پروگرام کے بغیر ماضی کے کارناموں پر اکتفا کیا۔ اس کی طرف سے ایک نئے انداز فکر و عمل کو اپنانے میں کوتاہی نے ایسی فضا پیدا کر دی کہ بہت جلد باشعور طبقے نے اس کی حکومت کے خلاف ذہنی جنگ شروع کر دی۔ بدقسمتی سے قائدِ اعظم کی زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ اس ضرورت کو پورا کرنے سے پہلے وفات پا گئے اور ان کے پیروکاروں نے اس ضرورت کو محسوس تک نہ کیا۔

اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ "نوائے وقت" نے جس نے تحریک پاکستان کے زمانہ میں مسلم لیگ کی ترجمانی میں گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں، لکھا کہ "مسلم لیگ اب ایسے کارواں کی مانند ہے جس کے سامنے کوئی منزل نہ ہو"[۵۱] یہی رائے روزنامہ "ڈان" نے بھی (جو ایک زمانہ میں مسلم لیگ کا سرکاری ترجمان اخبار رہا تھا) ظاہر کی کہ "مسلم لیگ محض ایک جماعت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک نظریے کا پیکر تھا"[۵۲]۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کا پیکر تو قائم رہا البتہ اس میں سے نظریے کی روح پرواز کر گئی —— گویا مسلم لیگ اپنی سابق حیثیت برقرار نہ رکھ سکی اور زوال کا شکار ہو گئی۔

پاکستان میں مسلم لیگ کے لیڈر نئے حالات میں اپنی جماعت کے کردار کا تعین نہ کر سکے، جب کہ اس کی حریف کانگرس کے لیڈروں نے تقسیم سے قبل ہی آنے والے دور

---

۵۱ "مسلم لیگ کی سیاست بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی حیثیت اب ایک ایسے کارواں کی ہے جس کے پیش نظر کوئی منزل نہ ہو۔ لیگ نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔" (نوائے وقت لاہور ۱۳ اگست ۱۹۵۰ء (اداریہ)

۵۲ ڈان کراچی۔ ۲ اپریل ۱۹۵۴ء

میں اپنی جماعت کے کردار کو متعین کر دیا تھا۔ آل انڈیا کانگرس پارٹی کے جنرل سیکریٹری شنکر راؤ دیو نے ۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کو اعلان کر دیا تھا کہ نئے نظام میں کانگرس اُن اقتصادی ناہمواریوں کو دور کرے گی جو کسی سے مخفی نہیں اور کانگرس کو ایک مربوط پارٹی کے طور پر از سرِ نو منظم کیا جائے گا اور یہ واضح معاشی اور معاشرتی نصب العین کے لئے کوشاں ہو گی۔ اس کی باقاعدہ رکنیت سازی ہو گی اور اس کے ارکان اس کے مقاصد سے سرشار ہو کر ان کے حصول کے لیے سعی و جہد کریں گے۔[۱]

مسلم لیگ کے لیڈر یہ اعلان اور دعویٰ تو بڑے زور شور سے کرتے تھے کہ صرف لیگ ہی قومی مسائل حل کر سکتی ہے لیکن انہیں اس حقیقت کا احساس کرنے کی کبھی توفیق نہ ہوئی کہ آخر لوگ کب تک کھوکھلے نعروں سے مطمئن رہیں گے۔ وہ عوام میں بڑھتی ہوئی مایوسی اور بیزاری سے بالکل بے خبر یا بے نیاز تھے اور انھوں نے جماعت کو جوڑ توڑ اور سازشوں کی آماجگاہ بنا رکھا تھا۔ نتیجہ کے طور پر مسلم لیگ سے عوام کی توقعات آہستہ آہستہ ختم ہونے لگیں اور مایوسی و اضطراب نے ایک لہر کی شکل اختیار کر لی۔ وقت کا کارواں چلتا رہا اور مسلم لیگ پیچھے رہ گئی۔ جب مسلم لیگی لیڈر بالآخر خوابِ غفلت سے ہڑبڑا کر اُٹھے تو عوام کی حمایت و تائید حاصل کرنے کا مرحلہ گزر چکا تھا۔ عوام اپنے روز افزوں مسائل کا عملی حل چاہتے تھے اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو اپنے ذاتی مسائل اور شخصی مفادات سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ اُنھوں نے جس رفتار سے عوام کے مسائل سے بے اعتنائی برتی، عام لوگ اس سے دگنی رفتار سے مسلم لیگ سے غیر مطمئن اور دور ہوتے گئے۔

اس صورتِ حال نے ہماری تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ درحقیقت

---

[۱] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۵ اگست ۱۹۴۷ء

مسلم لیگ ملک کے تمام عوام کے لئے اتحاد کا نشان تھی۔ دوسری تمام سیاسی جماعتیں علاقائی مفادات کا مظہر تھیں۔ ان حالات میں صرف مسلم لیگ ہی عوام کو متحد رکھ سکتی تھی۔ مسلم لیگ کی ناکامی اور عوام کی اس سے مایوسی نے قومی اتحاد کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور قومی مسائل حل نہ ہونے کے سبب علاقائی تعصبات زور پکڑنے لگے۔

مسلم لیگ ہی مشرقی و مغربی پاکستان میں ایک مضبوط رشتہ تھی اور جب یہ رشتہ خود مسلم لیگی راہنماؤں کی غلطیوں سے ٹوٹ گیا تو دوسرے بین الصوبائی رشتے بھی کمزور پڑ گئے۔ بالآخر مشرقی پاکستان، پاکستان سے الگ ہو گیا اور مغربی پاکستان قومیتوں کے نعرے کی زد میں ہے۔ اس صورتِ حال کی ذمہ داری ایک حد تک مسلم لیگ کی نااہل قیادت پر عائد ہوتی ہے۔

تقسیم برصغیر سے قبل بھی مسلم لیگ کے وجود کو سخت خطرات لاحق رہے تھے لیکن قیامِ پاکستان کی جنگ میں بے مثال کامیابی کے بعد اسے اپنے رہنماؤں کی خود غرضی اور کوتاہ اندیشی سے جو ضرب لگی وہ کاری ثابت ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں جب محمد علی جناح انگلستان میں رضاکارانہ جلا وطنی سے واپس آئے تو اس زمانہ میں مسلم لیگ کوئی فعال سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ ہر شعبہ میں آل انڈیا کانگرس نے اس پر گہرا سایہ ڈال رکھا تھا۔ ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کچھ سرگرم ہوئی۔ پھر ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرس نے مسلمانوں سے جو ناروا سلوک کیا اس سے بھی مسلمانوں میں اس جماعت کی ضرورت و افادیت کے احساس کو تقویت ملی۔ لیکن مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا نیا دور ۱۹۳۹ء میں شروع ہوا جب محمد علی جناح اس کے ایک مرتبہ پھر صدر منتخب ہوئے۔ ان کی لندن سے واپسی سے پہلے مسلم لیگ محض ایک دفاعی نوعیت کی تنظیم تھی۔ اس پر زیادہ تر مالدار زمیندار چھائے ہوئے تھے جن کے دل کسی اعلیٰ نصب العین کی لگن سے عاری تھے۔ ان کے سامنے کوئی مقصد نہ

Marfat.com

تھا۔ اس زمانے کی مسلم لیگ جوش و اخلاص سے یکسر عاری تھی۔"[1]

محمد علی جناح ایک مضبوط اور مثالی عزم و ہمت کے مالک تھے اور صرف ان کی توجہ اور سعی و جہد کے باعث مسلم لیگ ایک مرتبہ پھر فعال سیاسی جماعت بن گئی۔

۱۹۳۴-۳۸ء کے عرصہ میں محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی پوزیشن کو مضبوط و مستحکم بنایا اور جب مارچ ۱۹۴۰ء میں اس نے پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دیا تو مسلم لیگ کو عوامی حمایت حاصل ہونے لگی اور بہت سے مسلمان راہنما کانگرس سے علیحدہ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ جماعت کے نچلے درجوں میں ذاتی رقابتیں موجود ہوں گی لیکن اس کی قیادت عظمیٰ بہت مضبوط بنیادوں پر استوار تھی۔ محمد علی جناح کو مکمل برتری حاصل تھی اور کوئی بھی شخص ان کے اختیار و اقتدار کو چیلنج نہ کر سکتا تھا۔[2] تحریک پاکستان شروع ہونے کے بعد مسلم لیگ کے پیغام کی صدائے بازگشت شہروں کی حدود سے نکل کر دور افتادہ دیہات کے مسلمان گھروں حتیٰ کہ جھونپڑوں میں بھی سنی جانے لگی۔ یہ ساری کامیابی قائداعظم کی انتھک مساعی، بے مثال تدبر اور بے لوث رہنمائی کی مرہونِ منت تھی اور جلد ہی وہ اس قدر مقبول اور ہر دلعزیز ہو گئے کہ ان کا نام اور مسلم لیگ ہم معنی الفاظ بن گئے۔

جب تک وہ زندہ رہے، وہ مسلم لیگ میں اتحاد کا سب سے بڑا سرچشمہ رہے اور ان کی زندگی میں مسلم لیگ کے سامنے بہرحال ایک مقصد، ایک آدرش اور ایک نصب العین رہا۔ یہ اپنے مقصد اور نصب العین سے لگن کا ہی نتیجہ تھا کہ اوپر سے لیکر نیچے تک ملک کے طول و عرض میں ساری تنظیم تحریک آزادی میں سرگرم و منہمک تھی اور پاکستان ہی اس کے کارکنوں اور رہنماؤں کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس زمانے میں کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مسلم لیگ کا تاریک مستقبل ہی

---

[1] کیتھ کیلارڈ۔ (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۳۴

[2] ایضاً صفحہ ۸۷

Marfat.com

تقسیم برِ صغیر کا سب سے بڑا المیہ بن جائے گا۔

"قیامِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظم بہت جلد وفات پا گئے۔ ان کے جانشین چودھری خلیق الزمان بے حد کمزور آدمی تھے۔ نہ ان میں قیادت کے اوصاف تھے اور نہ انہیں برائے نام عوامی حمایت ہی حاصل تھی۔[1] مسلم لیگ میں زیرِ سطح اختلافات و نزاعات بہت جلد منظرِ عام پر آ گئے اور صدرِ پاکستان مسلم لیگ چوہدری خلیق الزمان ان پر قابو پانے میں یکسر ناکام ثابت ہوئے یہ ان کے بس کا روگ بھی نہیں تھا کیونکہ جماعت کی صدارت ان کی اہلیت کا صلہ نہیں تھی بلکہ صوبوں میں مضبوط لیکن خود غرض لیڈروں کی بے ضابطگیوں سے چشم پوشی کا انعام تھی۔ سیاسی جماعتوں کی مقبولیت اور وقار کافی حد تک اس کی قیادت کا مرہونِ منت ہوتا ہے چنانچہ اپنی کمزور قیادت کے سبب مسلم لیگ عوام کا اعتماد تیزی سے کھونے لگی اور اس کی مقبولیت اسی تناسب سے کم ہوتی گئی۔

آخر کار یہ نوبت آ گئی کہ واقعات کا نتیجہ مسلم لیگ کے لئے نوشتۂ تقدیر بن گیا۔ پہلے چودھری خلیق الزمان کو لیگ کونسل نے ناظمِ اعلیٰ مقرر کیا۔ وہ حالات کے ہاتھوں میں محض کھلونا ثابت ہوئے اور ان کے زیرِ سایہ بےعملی اور بے ضابطگی کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اُنھوں نے سابق صدروں اور سابق سیکرٹریوں کو علاقائی ناظم مقرر کر دیا جنھوں نے رکنیت سازی کی مہم کی نگرانی کرنی تھی۔ اس طرح ازکار رفتہ لیڈروں کو جماعت پر از سرِ نو اپنی گرفت مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔

"جو نوجوان عناصر کے لئے ناراضی اور بغاوت کا براہِ راست سبب ثابت ہوا۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی مقبولیت کو سب سے زیادہ نقصان چودھری صاحب سے پہنچا اور مغربی پاکستان میں ان کے نامزد ناظمین نے لیگ کے رہے

---

[1] مشتاق احمد (بحوالہ سابق) صفحہ ۱۳۸

Marfat.com

سے دقار کو ناقابلِ تلافی دھچکا لگا یا۔[1]

سرحد میں جو انتظامی کمیٹی ۱۹۴۸ء میں قائم کی گئی اس نے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کی نگرانی اور ہدایت پر کام کیا۔ انھوں نے رکنیت سازی کے فارم صرف اپنے پیروکاروں میں تقسیم کرائے تاکہ تنظیمِ نو کے بعد مسلم لیگ ان کی مطیع فرمان بن جائے۔ پیر مانکی شریف ایک سربرآوردہ کارکن تھے اور قیوم خان کے سیاسی حریف بن سکتے تھے۔ اس امکانی خطرہ کا ازالہ کرنے کے لئے خان قیوم نے ان کے حامیوں کو رکنیت سازی کے فارموں سے محروم رکھا۔ پیر صاحب نے اس زیادتی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جو عملاً صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ایک اخباری بیان میں انھوں نے کہا۔ "آل پاکستان مسلم لیگ کے ناظم اعلیٰ نے جو تنظیمی کمیٹی قائم کی ہے اس کے ارکان کا رویہ آمرانہ ہے اور سرحد کے عوام کو ان پر رتی بھر اعتماد نہیں رہا۔ اس تنظیمی کمیٹی نے بڑے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رکنیت سازی کو موجودہ حکمران ٹولے کے پیروکاروں تک محدود رکھا ہے۔"[2] انھوں نے سرحد میں پرائمری شاخوں کے انتخابات کو بھی چیلنج کیا لیکن ناظم اعلیٰ نے اسے سنا ان سنا کر دیا۔ ناظم اعلیٰ نے تنظیمی کمیٹی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی اور اس کمیٹی کے ارکان میں صوبائی وزارت کے حامیوں کی بھرمار کر دی گئی تھی۔[3] اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیر مانکی شریف جنھوں نے سرحد میں مسلم لیگ کے لئے سالہا سال تک شبانہ روز کام کیا تھا۔ اپنے پیروکاروں کے ساتھ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے اور اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنالی۔ اسی طرح کے واقعات تمام صوبوں میں پیش آئے جس کے

۱؎ مشتاق احمد (بحوالہ سابقہ) صفحات ۱۳۷ - ۱۳۸

۲؎ پاکستان ٹائمز لاہور ۷ نومبر ۱۹۴۸ء

۳؎ ڈان کراچی ۲۳ دسمبر ۱۹۴۸ء

Marfat.com

نتیجے کے طور پر مسلم لیگ مخلص کارکنوں سے محروم ہوگئی اور اس پر خود غرض لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ اس سے مسلم لیگ کی مقبولیت کو بے پناہ نقصان پہنچا۔

ایک طرف مسلم لیگ میں جمہوری اصولوں کی یوں مٹی پلید ہو رہی تھی اور دوسری طرف مسلم لیگ کو حکومت سے بھی بالاتر ادارہ ظاہر کرنے کے زبانی اعلانات کئے جا رہے تھے۔ آل پاکستان مسلم لیگ کی کونسل نے اپنے ۲۶ فروری ۱۹۴۸ء کے اجلاس میں پارٹی کو حکومت سے علیحدہ رکھنے کے لئے وزیروں پر پابندی عائد کر دی تھی کہ وہ جماعت میں کسی عہدہ پر فائز نہ ہو سکتے تھے۔[۱] دوسری طرف مسلم لیگ کو ایک "اعلیٰ اور بالاتر ادارہ" تصور کیا جاتا تھا چنانچہ چودھری خلیق الزمان نے ایک "سخت خط" لکھ کر وزیر اعظم لیاقت علی خان کو ہدایت کی کہ وہ بھارت حیدر آباد جنگ کے سلسلہ میں حکومت پاکستان کی پالیسی کی وضاحت کریں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں مسلم لیگ سے مشورہ کرنے پر زور دیا اور یہ تجویز پیش کی کہ لیگ کے تمام ناظمین کو مشورہ کے لئے فوراً بلایا جائے۔[۲] بعض دوسرے مواقع پر بھی مسلم لیگ کی کونسل اور ورکنگ کمیٹی نے حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی۔

لیاقت علی خان ہمیشہ کسی حجاب و اضطراب کے بغیر یہ تسلیم کرتے رہے کہ مسلم لیگ کونسل کو حکومت پر برتری حاصل ہے۔" یہ بات یقینی ہے کہ کسی بھی آئینی حکومت کے وزیر اعظم نے پارلیمنٹ کا ذکر اس طرح دبے انداز میں نہیں کیا ہوگا جس طرح لیاقت علی خان نے کیا۔"[۳] لیاقت علی خان نے ۱۹۵۰ء میں مسلم لیگ کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "اس ایوان (مسلم لیگ کی کونسل) کو پارلیمنٹ سے زیادہ

۱۔ پاکستان ٹائمز لاہور ۲۶ فروری ۱۹۴۸ء

۲۔ ایضاً ۱۴ ستمبر ۱۹۴۸ء

۳۔ کیتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۳۸

Marfat.com

اہمیت حاصل ہے — میں آج اس بات کی دوبارہ تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کا وزیر اعظم سمجھا ہے۔ میں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ مجھے وزیر اعظم کے طور پر دستور ساز اسمبلی کے ارکان نے منتخب کیا ہے۔ جس دن مجھے یہ معلوم ہوگا کہ میں مسلم لیگ کے اعتماد سے محروم ہو چکا ہوں اسی دن آپ لیاقت علی خان کو وزیر اعظم پاکستان نہیں پائیں گے۔"[۱] مسلم لیگ کے لیڈروں کے اس رویہ اور وزیروں کے اس اسلوب اظہار سے نہ صرف یہ تاثر قائم ہوتا تھا کہ جماعت کو پارلیمنٹ پر فوقیت حاصل ہے بلکہ اس خیال کی بھی تصدیق ہوتی تھی کہ طاقت کا اصل سرچشمہ مسلم لیگ ہے، وفاقی مقننہ نہیں ہے۔ لیکن عملاً حقیقت اس سے بہت مختلف بلکہ برعکس تھی۔

تقریروں میں تو چودھری خلیق الزمان مسلم لیگ کو بالاتر تنظیم اور حکومت و وزارت کو مسلم لیگ کے تحت رکھتے تھے لیکن دوسری طرف وہ مرکزی وزارت کے سامنے ایسے جھکے کہ اس کی کسی پالیسی یا کسی طرز عمل سے متعلق احتساب کرنا گناہ سمجھا۔ عملی طور پر مسلم لیگ کی صدارت ان کے زمانے میں حکومت کے ماتحت ایک سرکاری عہدہ بن کر رہ گئی۔ ان کی غلطیوں کا آخری نقطہ غالباً وہ تھا جب انھوں نے مرحوم لیاقت علی خان کو امریکہ سے واپسی پر ایڈریس پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ باوجود صدر مسلم لیگ ہونے کے وزیر اعظم کے محض دعا گو ہیں۔ عوام نے اس ذلت کو محسوس کیا۔"[۲]

چودھری خلیق الزمان نے لیاقت علی خان اور صوبائی حکومتوں کے نمائندں

۱؎ ڈان کراچی ۹ اکتوبر ۱۹۵۰ء

۲؎ تاثرات و تصورات، عبدالوحید خان (سابق کونسلر مسلم لیگ اور سابق مرکزی وزیر اطلاعات) گوشۂ ادب، انارکلی لاہور (۱۹۶۰ء) صفحہ ۹۰

Marfat.com

مثلاً دولتانہ، ممدوٹ، یوسف ہارون، قیوم خان وغیرہ کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں نامزد کیا[1]۔ اس پالیسی نے کئی مشکلات کو جنم دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا وزیراعظم اور صوبائی وزراسے اعلیٰ ورکنگ کمیٹی کے اجلاسوں میں شریک ہوں گے اور ان میں ہونے والے فیصلوں کے پابند ہوں گے۔ اس صورت حال سے اُن لیڈروں کے ہاتھ میں بڑا خطرناک ہتھیار آگیا جو حکومت میں تو شامل نہ تھے یا نہ رہے تھے لیکن حکومت پر اپنے اثر اور رعب کا سایہ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ میاں ممتاز دولتانہ نے جب ممدوٹ کابینہ سے استعفا دیا[2] تو انھوں نے کہا تھا۔ "مسلم لیگ جو ایک زمانے میں تعمیری سیاسی نقطۂ نظر کے اظہار و ترجمانی کا موزوں ادارہ تھی ابھی تک اپنے دوسرے ارتقائی مرحلے سے گذرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔" "ان حالات میں نہ رہنمائی کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا تھا اور نہ انتشار ہی پیدا کئے بغیر اور سیاسیات کو ذاتی رنگ دیے بغیر کسی پالیسی کا مشورہ دیا جا سکتا تھا[3]۔" حقیقت یہ تھی کہ میاں ممتاز دولتانہ نے صرف ذاتی وجوہ کے باعث وزارت سے استعفا دیا تھا اور ان کے اس اقدام کا کسی پالیسی یا اصول سے پرکاہ کے برابر بھی تعلق نہیں تھا۔ اس کے بعد انھوں نے پنجاب مسلم لیگ کی صدارت کا انتخاب لڑا، اور کامیاب ہوئے[4]۔ صوبائی مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد وہ کابینہ پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی پوزیشن میں تھے کیونکہ انہیں خان ممدوٹ کے ہاتھوں جو زخم لگا تھا وہ اس کا بدلہ لینے کے لئے بےتاب

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۶ مارچ ۱۹۴۹ء

[2] ایضاً ۲۹ مئی ۱۹۴۸ء

[3] ایضاً ۱۷ نومبر ۱۹۴۸ء

[4] ایضاً ۲۰ نومبر ۱۹۴۸ء

Marfat.com

تھے۔ انھوں نے ممدوٹ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک شروع کر دی اور انہیں دستخطوں کے ساتھ ایک یادداشت پیش کی، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ وزارت اعلیٰ کی کرسی خالی کر دیں۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ دولتانہ کو کابینہ سے علیحدہ ہوئے ابھی چند دن ہوئے تھے کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ۸۰ میں سے ۴۷ ارکان نے ایک قرارداد منظور کر کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ پر مکمل اعتماد ظاہر کیا تھا اور انہیں اپنی حمایت کا پورا یقین دلایا تھا۔[۱] لیکن جب دولتانہ صوبائی لیگ کے صدر منتخب ہو گئے تو وہ ایک ایسی یادداشت پر لیگ اسمبلی پارٹی کے ۴۱ ارکان کے دستخط کرانے میں کامیاب ہو گئے جس میں ممدوٹ سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ وزارت اعلیٰ کی کرسی خالی کر دیں۔[۲] اس طرح مسلم لیگی ارکان اسمبلی کبھی ممدوٹ سے اظہار وفاداری کرتے رہے اور کبھی دولتانہ کو مکمل حمایت کا یقین دلاتے رہے۔ ان کی وفاداری میں اس ہیر پھیر کا یہ نتیجہ نکلا کہ پنجاب میں آئین معطل کر دیا گیا اور اس ضمن میں سرکاری اعلان میں یہ بتایا گیا کہ اس صوبے میں رشوت ستانی کے دور دورہ سے عوام بد دل ہو رہے تھے اور جوڑ توڑ نے سرکاری ملازمتوں میں بھی نظم و ضبط کا جنازہ نکال دیا تھا۔[۳]

پنجاب میں آئین معطل کرنے کے سلسلے میں جو سرکاری اعلان جاری کیا گیا تھا اس کے مطابق "اس صورت حال تک نوبت پہنچانے میں کئی عوامل نے حصہ لیا ہے لیکن گورنر جنرل کے خیال میں سب سے بڑی وجہ اسمبلی کے ارکان کی ناکامی ہے۔"[۴] یہی داستان سندھ میں دہرائی گئی وہاں جب ایوب کھوڑو کو سنگین الزامات کی بنیاد پر وزارت اعلیٰ سے برطرف کر دیا گیا، تو صوبائی مسلم لیگ نے انہیں صدر

---

[۱] پاکستان ٹائمز لاہور ۲ جون ۴۸ء
[۲] ایضاً ۲۷ دسمبر ۱۹۴۸ء
[۳] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء
[۴] ایضاً

Marfat.com

منتخب کر لیا۔ کھوڑو نے دولتانہ کی طرح سندھ میں بھی وزارت کو نیچا دکھانے کے لیے ہتھکنڈے استعمال کیے اور ان کی نامزد صوبائی ورکنگ کمیٹی نے وزارت کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لئے ۹ ارکان پر مشتمل ایک نگران کمیٹی قائم کر دی۔ اس سلسلہ میں ورکنگ کمیٹی نے اپنی قرارداد میں کہا "ورکنگ کمیٹی مزید برآں ۹ ارکان پر مشتمل ایک نگران کمیٹی قائم کرتی ہے، صوبائی مسلم لیگ کے صدر بھی اس کمیٹی کے بہ حیثیت عہدہ رکن ہوں گے اس کمیٹی کے ارکان صوبے کے عوام سے متعلق حکومت کی تمام سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہیں گے۔[۱] کراچی کے اخبار ڈان نے اس کمیٹی کو بجا طور پر سندھ کی اعلیٰ و بالاتر حکومت (Super Govt.) قرار دیا [۲]۔ اس طرح یہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ جو لوگ کسی وجہ سے وزارت سے علیحدہ یا محروم ہوتے تھے وہ مسلم لیگ کی صدارت پر قبضہ کر کے اسے ان لوگوں سے بدلہ لینے کے لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے جو انہیں وزارت سے علیحدہ کرنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ چنانچہ لیڈروں کی ذاتی جنگوں اور رقابتوں نے مسلم لیگ کو اندرونی طور پر نحیف کر دیا۔

چوہدری خلیق الزمان بھی مکافات عمل سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پارلیمنٹ سے بھی "اعلیٰ اور بالاتر ادارہ" کے سربراہ ہونے کے باوجود وہ اس قدر کمزور تھے کہ کراچی میں مہاجرین نے ان کے گھر کے سامنے مظاہرہ کیا تو وہ پاکستان مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ اس مظاہرے سے بعض حلقوں نے یہ بھی تاثر لیا کہ لیگ کے خلاف مہاجرین کے جذبات بڑی شدت اختیار کر گئے ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ کا ہی "بچہ" تھا اور مسلم لیگی لیڈر اکثر مسلم لیگ کو پاکستان کی

---

[۱] ڈان کراچی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۰ء

[۲] ایضاً ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۰ء

Marfat.com

"مال" قرار دیتے تھے۔ اس زمانے میں مرکز اور صوبوں میں صرف مسلم لیگ ہی حکمران جماعت تھی اور مہاجرین میں اس کے خلاف جذبات ابھرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس جماعت نے ان کی شکایات اور مصائب کا مداوا نہیں کیا۔ یہ بات بھی فطری تھی کہ بعض مہاجرین مسلم لیگ کو ہی اپنی تمام مشکلات و مصائب کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔

چوہدری خلیق الزمان کے مستعفی ہو جانے کے بعد مسلم لیگ کے آئین میں ترمیم کے ذریعے وزیروں کے جماعت میں عہدیدار بننے پر پابندی ختم کر دی گئی اور لیاقت علی خان مسلم لیگ کے صدر منتخب کر لئے گئے۔ اس طرح ملک کی وزارت عظمیٰ اور حکمران جماعت کی سربراہی کو یکجا کر دیا گیا۔ لیکن لیاقت علی خان بھی مسلم لیگ کی صدارت کے سابق وقار و تکریم کو بحال نہ کر سکے۔ اگر وہ وزیر اعظم نہ ہوتے تو شاید وہ مسلم لیگ کی ساکھ بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتے کیونکہ وزیر اعظم کے طور پر وہ اپنی حکومت کی پالیسیوں کی ناکامی پر جرح و تنقید کا ہدف بنتے تھے اور مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت میں وہ ان پالیسیوں کو اپنانے پر مجبور تھے۔ حکومت پر نکتہ چینی مسلم لیگ پر نکتہ چینی کے مترادف ہو گئی اور جو بات مسلم لیگ کے خلاف کہی جاتی تھی، حکومت بھی اس کی زد میں آجاتی تھی۔ لیگ کے آئین میں اس ترمیم سے لیاقت علی خان وزیر اعظم کے ساتھ صدر مسلم لیگ ضرور بن گئے لیکن اس سے ان کے دائرہ اثر و اختیار میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ وہ وزیر اعظم ہونے کے ساتھ ایک ہر دلعزیز رہنما بھی تھے۔ البتہ مسلم لیگ کا صدر بننے سے وہ ہر قسم کے چیلنج سے محفوظ ہو گئے اور انہیں آمرانہ اختیارات حاصل ہو گئے۔ وہ جو فیصلہ کرتے یا پالیسی اختیار کرتے، مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی اس پر فوراً توثیق ثبت کر دیتی۔

Marfat.com

وزارتِ عظمیٰ اور صدارت کے یکجا ہونے سے مسلم لیگ جو پہلے "اعلیٰ اور برتر ادارہ" تھی، اب کم وبیش غیر موثر ہو کر رہ گئی۔ لیاقت علی خان کے صدر مسلم لیگ بننے سے مسلم لیگ کی حالت مردہ بدست زندہ کی تصویر بن گئی[۵۱]۔ "نوائے وقت" لاہور نے اس سلسلہ میں یہ تبصرہ کیا کہ مسلم لیگ اب حکومت کی لونڈی بن گئی ہے[۵۲]۔ اور یہ بات بالکل درست تھی۔ جماعت کے اندر لیاقت علی خان سے اختلاف رائے کا سوال خارج از بحث تھا، کیونکہ وزیر اعظم کے طور پر بھی وہ ملک میں کسی اپوزیشن جماعت کے قیام و فروغ کی پوری حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ملک میں کسی اور پارٹی کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلم لیگ قومی اتحاد کی مظہر ہے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ دوسری پارٹیوں کے ظہور سے انتشار وخلفشار بڑھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب پنجاب کے پہلے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے مقابلے میں نواب ممدوٹ اور شہید سہروردی نے اپنی جماعتوں کو متحد کیا تو لیاقت علی خان اس پر بڑے برافروختہ ہوئے اور ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے سہروردی کے بارے میں بڑے سخت اور نازیبا الفاظ بھی کہہ دیئے۔ اسی طرح پنجاب میں عام انتخابات کے بعد جب دستور ساز اسمبلی کے نصف درجن ارکان کا بلاواسطہ انتخاب ہوا تو مسلم لیگ کے مقابلے میں کامیاب ہونے والے بعض آزاد امیدواروں کو بھی مسلم لیگ میں شامل کر لیا گیا تاکہ سہروردی دستور ساز اسمبلی کے رکن نہ بن سکیں۔ اگر اس زمانے میں لیاقت علی خان سیاسی بالغ نظری اور حوصلہ مندانہ رواداری سے کام لیتے اور صحت مند اپوزیشن کو ابھرنے دیتے تو نہ صرف عوام کے سامنے متبادل پروگرام آتا بلکہ سیاست میں توازن حکومتی پارٹی

---

۵۱ زیڈ اے سلیری (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۲۰

۵۲ نوائے وقت لاہور ۱۳ گست ۱۹۵۰ء

کے لیے بھی مفید ثابت ہوتا کسی مضبوط اپوزیشن پارٹی کی طرف سے کھلی مخالفت حکومتی پارٹی کو اپنی صفوں میں اتحاد اور یک جہتی کا احساس دلاتی اور اس کے ارکان آپس میں لڑنے جھگڑنے اور ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کرنے کے بجائے اپنی تنظیم کو بہتر اور مضبوط بناتے اور عوام کی خدمت و بہبود میں زیادہ دلچسپی لینے کی ضرورت محسوس کرتے۔ تمام جمہوری ملکوں میں سیاست میں توازن کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے اور اس توازن کا فقدان ہی آمریت و استبداد کی راہ ہموار کرتا ہے۔ پاکستان میں بلاشبہ امن و سکون تھا لیکن یہ قبرستان کا امن و سکون تھا کیونکہ زیر سطح حکومتی پارٹی کے اندر اختلاف و انتشار کی کوئی کمی نہ تھی۔ حکمران پارٹی کے مقابلے میں مضبوط اپوزیشن نہ ہونے کے باعث صحت مند سیاسی مسابقت اور اہم قومی مسائل پر تعمیری نکتہ چینی کا فقدان حکومتی پارٹی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ تقسیم سے قبل مسلم لیگ روز بروز مستحکم ہو رہی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ بلاشبہ قائد اعظم کی بے مثل قیادت تھی لیکن اس میں مسلم لیگ کی تنظیمی مشینری نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ملک کے ہر حصے میں مسلم لیگ کی باضابطہ شاخیں موجود تھیں۔ قائد اعظم چونکہ طبعاً جمہوریت پسند اور آئین نواز تھے۔ اس لیے ان کی قیادت عظمیٰ کے زمانے میں تمام ذیلی ادارے مثلاً صوبائی اور مرکزی کونسلیں اور ورکنگ کمیٹیاں باضابطہ طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتی تھیں۔ اس کے ساتھ مسلم لیگ کے ممتاز لیڈر اور کارکن ہر وقت شہروں، قصبوں اور دیہات کے دورہ پر رہتے تھے اور ہر مسلمان تک لیگ کا پیغام پہنچاتے تھے۔ یہ پیغام اپنی جگہ دلپذیر اور ایمان افروز تھا اور مسلم لیگ کے لیڈر اور کارکن بھی مشنری جذبہ سے کام کرتے تھے۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس

Marfat.com

محض رسم پوری نہیں کرتے تھے، بلکہ تنظیم کی فعال و متحرک زندگی کے مظہر ہوتے تھے۔ تقسیم سے قبل مسلم لیگ کی کانفرنسیں، کونسل اور ورکنگ کمیٹیوں کے اجلاس کسی قدر باقاعدگی سے ہوتے تھے۔ اس لئے کہ مسلم لیگ کا عوام سے براہ راست رابطہ تھا اور اس کی جڑیں گہری اور بنیادیں مضبوط تھیں۔ اس عظیم الشان تنظیم کا زوال قیام پاکستان کے بعد شروع ہو گیا کیونکہ اپنی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے بعد اس کے لیڈروں اور کارکنوں نے عوام سے رابطہ برقرار نہ رکھا۔ لیاقت علی خان وزیر اعظم بننے سے پہلے بھی ایک مقبول رہنما تھے۔ چنانچہ جب وہ وزیر اعظم بنے تو حکومت کو ان کی مقبولیت سے بڑی تقویت پہنچی وہ صدر مسلم لیگ بنے تو مسلم لیگ کو بھی اہمیت ملنے لگی لیکن ان کی حکومتی مصروفیات کے سبب مسلم لیگ عوام کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار نہ رکھ سکی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے انتقال کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی کمزوری کا راز فاش ہو گیا ؎

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

لیاقت علی خان کے بعد جو اصحاب یکے بعد دیگرے مسلم لیگ کے صدر بنے وہ اس جماعت کے محض ماتم گسار اور جنازہ بردار ثابت ہوئے[1]۔ ان کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم بنے۔ وہ مسلم لیگ کی صدارت کے بھی خواہاں تھے۔ جماعتی آئین کے مطابق وہ اس عہدے پر فائز نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ آئین کے تحت جماعت کا عہدیدار بننے کے لئے کم از کم ایک سال تک رکنیت لازمی تھی۔ خواجہ صاحب اس سے قبل صدر مملکت تھے اور مسلم لیگ کے رکن نہیں رہے تھے۔ چنانچہ ان کی خواہش پوری کرنے کے لئے ایک مرتبہ پھر آئین میں ترمیم کر کے ان کے صدر بننے کی راہ ہموار کی گئی اور اس طرح یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ مسلم لیگ کی

---

[1] زیڈ اے سلیری (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۲۱

Marfat.com

سیاست بر سر اقتدار افراد کے گرد گھومتی ہے۔ آئین کے تحت خواجہ ناظم الدین کو صدر منتخب ہونے کے بعد اپنی ورکنگ کمیٹی نامزد کرنی چاہیے تھی لیکن جب تک وہ وزیر اعظم رہے، مسلم لیگ مرکزی ورکنگ کمیٹی سے محروم رہی۔ لیاقت علی خان بذات خود ایک مقبول لیڈر تھے اور وہ اپنی ذاتی مقبولیت پہ کامیابی سے انحصار کرتے رہے لیکن خواجہ ناظم الدین کی حالت مختلف تھی، وہ ایک ایسے مینار کی چوٹی پر متمکن تھے جس کی کوئی بنیاد نہ تھی[۱]

اکتوبر ۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین کی صدارت میں مسلم لیگ کونسل کا جو اجلاس ڈھاکہ میں ہوا اس میں آئین میں مزید دو ترامیم کی گئیں۔ پہلی ترمیم کے تحت مسلم لیگ کے عہدیداروں کی میعاد ایک سال سے بڑھا کر تین سال کر دی گئی۔ ہر سال کونسل کے اجلاس میں عہدیداروں کے انتخاب سے لوگوں کو جماعت کی پالیسیوں کا تنقیدی جائزہ لینے کا موقع ملتا تھا۔ مزید برآں سالانہ اجلاس میں نیا پروگرام وضع کیا جاتا تھا اور قراردادیں منظور کرنے کے بعد نئے سال کے لیے عہدیدار منتخب کیے جاتے تھے۔ تین سال بعد انتخاب کرانے کی ترمیم نے اس رسمی معمول کو ختم کر دیا اور عوام نے یہ تاثر لیا کہ سیاسی راہنماؤں نے اپنی کرسیاں محفوظ کرنے کے لیے یہ ترمیم کرائی ہے۔ چنانچہ انتخاب کی وجہ سے متوقع عہدیداروں کو باہر نکلنے اور عام لوگوں سے ملنے کا جو موقع ملتا تھا وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ اس طرح حکمران گروپ اور ان کے پیروکاروں کے درمیان خلیج اور وسیع ہو گئی۔ دوسری ترمیم کے تحت لیگ کونسل کے ارکان کا صوبائی کوٹہ مقرر کر دیا گیا اور ہر صوبے میں لیگ کے ارکان کی تعداد پر مبنی پرانے تناسب کو ختم کر دیا گیا۔ اس ادارے میں دونوں بازوؤں کے لیے مساوی

---

[۱] زیڈ اے سلہری (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۳۹

Marfat.com

نشستیں مقرر کی گئیں۔ یہ تجویز ازحد نامناسب بلکہ مضحکہ خیز بھی کیونکہ تنظیم کی بنیاد کسی خاص علاقے کی آبادی پر نہ تھی بلکہ اس سے قبل ہر علاقے میں مسلم لیگ کے ارکان کی تعداد پر مبنی تھی۔ ترمیم کے تحت چونکہ مسلم لیگ کونسل میں بھی آبادی کو نمائندگی کی اساس بنادیا گیا تھا، اس لیے اب اس بات کو کوئی اہمیت حاصل نہ رہی تھی کہ کس علاقے میں مسلم لیگ کو کتنی حمایت اور مقبولیت حاصل ہے۔ اس ترمیم کے بعد مسلم لیگ کے صوبائی اور ضلعی سربراہوں کے لیے جماعتی تنظیم کے دائرے کو وسیع رکھنا بھی ضروری نہ رہا۔[۱] "ایوننگ ٹائمز" کراچی نے ترمیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ ڈھاکہ میں اس ترمیم نے انقلابی نوعیت کا انتظام کیا ہے اور سیاسی تنظیموں کے تمام معروف اصولوں اور معمولات کی بساط لپیٹ دی ہے۔[۱] یہ ترامیم "تنظیم کے بودے پن کے کھلے اعتراف کے مترادف تھیں اور اس بات کا ثبوت تھیں کہ صوبہ پرستی کا متعصب نقطہ نظر اس کی پالیسیوں کی قوت محرکہ ہے۔"[۲] اس کے بعد مسلم لیگ کی مقبولیت کا آفتاب آہستہ آہستہ غروب ہونے لگا لیکن لیگی لیڈروں کو اس کا شعور تک نہیں تھا۔

جدید جمہوری نظام میں برسر اقتدار سیاسی پارٹی کے ذریعے حکومت اور عوام کے رابطے کو بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ عام لوگ بھی مسلم لیگ سے یہی توقع کرتے تھے کہ برسر اقتدار آنے کے بعد یہ جماعت اپنے شاندار ماضی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گی لیکن یہ نیا باب تشنہ تحریر ہی رہا۔ "البتہ اس کے اوراق پر غلیظ ہاتھوں نے دھبوں کے نقش مرتسم کر دیئے۔"[۳] مسلم لیگ نے نہ عوام کے ذہنی انتشار کو دور

---

[۱] زیڈ اے سلیری (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۴۰

[۲] پاکستان ٹائمز لاہور (اداریہ) ۱۹ نومبر ۱۹۵۲ء

[۳] ایضاً

Marfat.com

کرنے سے کوئی سروکار رکھا اور نہ عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ کا پل بننے میں کوئی دلچسپی لی[1]۔ عوام اور پارٹی کے درمیان رابطہ کی ایک معروف صورت سالانہ کنونیشن کے موقع پر کھلے اجلاس ہوتے تھے اور یہ اجتماعات پرانی آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں کا ایک مقبول ترین حصہ ہوا کرتے تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد پہلے نو برس میں ایک مرتبہ بھی ایسی کنونیشن منعقد نہ ہوئی[2]۔ کونسل کے اجلاس ضرور ہوتے تھے لیکن انھیں صرف عہدیداروں کے انتخاب یا کسی ضرورت و مصلحت کے تحت آئین میں ترمیم تک محدود رکھا جاتا تھا۔ گویا مسلم لیگ لیڈروں کے ہاتھ میں موم کی گڑیا کی مانند تھی۔ ان حالات میں عوام کو مسلم لیگ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

مسلم لیگ کی مقبولیت کا راز ایک بار اس وقت فاش ہوا جب اسے مشرقی پاکستان کے انتخابات میں شدید شکست ہوئی۔ اگر اس شکست کا تجزیہ کیا جائے تو عوام کی مسلم لیگ سے مایوسی کی سب سے بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ مسلم لیگ بہ حیثیت حکومتی پارٹی عوام کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ بلاشبہ عوام نے مسلم لیگ کو ووٹ اسلام اور پاکستان کے نام پر دیے تھے لیکن اس کے علاوہ ایک تیسری قوت معاشی بدحالی بھی تھی۔ مسلم لیگ کی تحریک اس حصہ ملک میں ۱۹۴۵ء کے بعد پہنچی، جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ پاکستان بن جانے کے بعد انھیں ہندوؤں کی اقتصادی غلامی سے نجات مل جائے گی[3]۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگی حکومت نے عوام کے معاشی مسائل حل کرنے کے لئے

---

[1] کیتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۴۰

[2] ایضاً

[3] عبدالوحید خان (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۱۰۲

Marfat.com

کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کیا

دریں اثنا مسلم لیگ اپنی ساکھ سے محروم ہونے کے بعد اس قدر بے وقعت ہو گئی تھی کہ خواجہ ناظم الدین اگرچہ حکمران پارٹی کے لیڈر تھے لیکن گورنر جنرل غلام محمد نے انہیں وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کرنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کیا۔ غلام محمد نے اپنے طور پر محمد علی بوگرہ کو وزیرِ اعظم نامزد کر دیا ۔ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ گورنر جنرل نے اس اہم تبدیلی کے سلسلے میں پارٹی سے مشورہ کیا ہو لیکن خواجہ ناظم الدین کابینہ کے نصف سے زیادہ ارکان نے اس پر مہرِ توثیق ثبت کر دی اور گورنر جنرل کے نامزد وزیرِ اعظم کی وزارت میں شامل ہو گئے۔[۱] برطرفی سے صرف چند دن پہلے دستور ساز اسمبلی نے بجٹ کو منظور کر کے خواجہ ناظم الدین پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ان کی برطرفی کے بعد مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے رتی بھر تاخیر و اضطراب کے بغیر محمد علی بوگرہ کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ اس سے ایک مرتبہ پھر پارٹی کی کمزوری آشکارہ ہو گئی ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارٹی حکومت کی کنیز بن کر رہ گئی اور اس کا واشگاف مظاہرہ اس طرح ہوا کہ جب گورنر جنرل نے محمد علی بوگرہ کو وزیرِ اعظم نامزد کیا تو پارٹی انہیں اپنا صدر منتخب کرنے پر بھی مجبور ہو گئی۔[۲] سید نور احمد نے اپنے سلسلہ مضامین "مارشل لاء سے مارشل لاء تک" میں اس واقعہ پر یہ تبصرہ کیا ہے "کہ مسلم لیگ افراد اور اصولوں کے بجائے کرسیوں اور عہدوں کی زیادہ وفادار تھی۔[۳] آہستہ آہستہ نوبت

۱۔ کینتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۴۵

۲۔ مشتاق احمد (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۱۳۸

۳۔ "مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لئے یہ بات جزوِ ایمان بن گئی تھی کہ جو شخص بھی وزیرِ اعظم کی کرسی پر رونق افروز ہو، اسے جھٹ سے قیادت کا تاج پیش کر دیا جائے۔ جب تک خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعظم تھے، پارٹی ان سے وفاداری کا دم بھرتی رہی۔ جب بوگرہ اس کرسی

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

Marfat.com

یہاں تک پہنچی کہ کابینہ، مسلم لیگ اور پارلیمانی پارٹی گورنر جنرل کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئی، اور یہ صورتِ حال اندرونی محلاتی سازشوں کا نتیجہ تھی ۔ اس سے مسلم لیگ کے وقار کو بہت صدمہ پہنچا۔

وفاداریوں میں کسی حجاب و اضطراب کے بغیر ردّ و بدل نے مسلم لیگی سیاست میں معمول کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس بات کو اصول بنا لیا تھا کہ "جب لیڈر تبدیل ہوں تو وفاداری بھی تبدیل ہو جانی چاہیئے"۔ سندھ کی مثال ملاحظہ ہو۔ صوبائی اسمبلی کے ۸۰ فیصد مسلم لیگی ارکان نے پیرزادہ عبدالستار کو بھرپور یقین دلایا کہ سندھ کی خودمختاری برقرار رکھنے کی مہم میں وہ ان کا پورا ساتھ دیں گے لیکن صرف دو ماہ بعد جب ایوب کھوڑو نے صوبہ سندھ کی جداگانہ حیثیت ختم کرنے اور اسے ایک یونٹ میں ضم کرنے کی ذمہ داری قبول کی تو سندھ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے سو فیصد ارکان نے ان کا ساتھ دیا۔ کیتھ کیلارڈ نے بالکل درست لکھا ہے "جس مبصر کو پاکستانی سیاست کے رنگ اور مزاج سے واقفیت نہ ہو وہ اس بات پر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ایک دن لیڈر کو مکمل حمایت و تائید کا یقین دلایا جاتا ہے لیکن اگلے دن جب اس کا حریف اس کی کرسی پر نظر آتا ہے، تو اول الذکر کو مکمل تعاون کا یقین دلانے والے اس کے جانشین کا اتفاق رائے اور بڑے جوش و اخلاص سے خیر مقدم کرتے ہیں[۱]"۔ وفاداری کی منتقلی میں پالیسی یا اصول کو سرے سے ملحوظ ہی نہ رکھا جاتا تھا۔ لیڈروں کی مفاد پرستانہ سیاسی قلابازیوں نے مسلم لیگ میں جماعتی نظم و ضبط کا جنازہ نکال دیا اور شاندار

پر متمکن ہوئے پارٹی نے اپنی ساری وفاداری انہیں منتقل کر دی۔ فی الحقیقت پارٹی کسی فرد کے بجائے کرسی کی وفادار تھی"۔ (روزنامہ مشرق لاہور ۱۶ مئی ۱۹۶۴ء)

[۱] کیتھ کیلارڈ (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۴۸

ماضی کے باوجود اس کی ساکھ خاک میں مل گئی۔

مسلم لیگ میں گروہ بندی اور باہمی تو تکار نے بھی جماعت کی ساکھ کو بڑی تیزی سے ختم کرنے میں حصّہ لیا۔ حصول اقتدار کے لئے دھڑے بندی کی روایت نے ایک مستقل عمل کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ لیگ کے لیڈر مسائل کا جائزہ قومی سطح پر نہ لیتے تھے بلکہ انہیں ذاتی وقار کا سوال بنا لیتے تھے۔ اس رجحان نے جماعت کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ سرحد میں مخالف گروہ کے لیڈر پیر مانکی شریف تھے سندھ میں میر غلام علی تالپور، پنجاب میں پہلے دولتانہ اور پھر ممدوٹ اور مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اور سہروردی مخالف دھڑوں کے لیڈر تھے لیکن اس صورت حال کی بیشتر ذمہ داری لیگ کے مقتدر لوگوں پر عائد ہوتی تھی اگر وہ مخالف دھڑوں کو جمہوری رواداری سے برداشت کرتے اور جماعت میں ہر قیمت پر ان سے زیادتی اور ان کی حق تلفی کو معمول نہ بناتے اور جماعت میں اختلاف رائے کو اصلاح احوال کی بنیاد ٹھہراتے تو قیام پاکستان کا فقید المثال کارنامہ سرانجام دینے والی جماعت اتنی تیزی سے زوال پذیر نہ ہوتی۔ لیکن ان دھڑوں میں اقتدار کے تحفظ اور حصول کی مسلسل اور جنونی دوڑ نے مسلم لیگ میں اتحاد اور یک جہتی کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اس سے عام لوگ بھی سخت مایوس اور کبیدہ ہوتے گئے۔ چنانچہ جب پنجاب میں آئین کی بساط لپیٹ کر گورنر راج نافذ کیا گیا تو لیاقت علی کو لاتعداد تار موصول ہوئے جن میں اس اقدام پر انہیں مبارک باد پیش کی گئی تھی۔ لاہور میونسپل کارپوریشن نے اس ضمن میں جو قرارداد منظور کی وہ اس وقت کے عوامی احساسات کی ترجمان تھی "خدا کا شکر ہے کہ ہمیں بے اصول وزیروں اور متوقع وزیروں سے نجات مل گئی ہے"[1] یہ قرارداد بلاشبہ عوامی بیزاری کی آئینہ دار تھی اور بیزاری اس

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء

Marfat.com

حد تک بڑھ چکی تھی کہ آئینی مشینری کے ناکام ہونے پر کسی نے افسوس ظاہر نہیں کیا اور جمہوری عمل کو برقرار رکھنے پر زور نہ دیا۔ خود پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اس باب میں جو قرارداد منظور کی اس میں یہ کہا گیا تھا کہ وزارت کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ مسلم لیگ کا وجود ختم ہو کر رہ گیا ہے کیونکہ وزیروں نے عوام سے رابطہ برقرار رکھنے کی اہمیت کو یکسر نظرانداز کر رکھا تھا[۵۲] مسلم لیگ میں دھڑے بندی نے سرکاری ملازمتوں کو بھی منقسم کر دیا اور انتظامیہ کو بدعنوانی اور رشوت ستانی کی راہ پر ڈال دیا۔

مسلم لیگ کے صوبائی اور مرکزی لیڈروں کی اندرونی چپقلش اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں نے پوری قوم کو مایوس کر دیا اور اپنی سازشوں کے سبب مسلم لیگ بحیثیت سیاسی تنظیم کمزور ہو کر رہ گئی۔ سیاست دانوں کی کمزوری نے بہت سے سرکاری ملازمین کو سیاست دان بنا دیا جو شاید عام حالات میں سیاست سے بالکل الگ تھلگ رہتے۔ سرکاری ملازمین نہ سیاسی ذہن رکھتے تھے اور نہ سیاست کا تجربہ۔ وہ سیاست دانوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر حکمران بن گئے۔ انہوں نے ملک کے جمہوری اداروں اور جمہوری اقدار کو بے رحمی سے پامال کیا۔ غلام محمد نہ سیاست دان تھا اور نہ ہی اُسے عوام کی حمایت حاصل تھی۔ اُسے گورنر جنرل بنانے میں بھی مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے بنگالی گروپ نے اہم کردار انجام دیا تھا کیونکہ بنگالی گروپ وزارت عظمیٰ پر قابض ہونے کے لیے بے چین تھا۔ ان کا خیال تھا کہ گورنر جنرل بے اختیار اور دستوری سربراہ ہوتا ہے اس لیے اس عہدے کو غلام محمد کے سپرد کرنے کا خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔ لیکن غلام محمد نے کمانڈر انچیف کی مدد سے ناظم الدین کو معزول کر دیا اور ناظم الدین مارشل لاء کے ڈر سے خاموش رہا۔ اس

[۵۲] ایضاً ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء

سے گورنر جنرل کا حوصلہ اور بڑھا۔ چنانچہ اُس نے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی کو بھی منسوخ کر دیا اور اس اقدام میں بھی اُسے صرف فوج کا ہی سہارا حاصل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمانڈر انچیف کابینہ کے رکن بنے اور یوں ملکی سیاسیات میں ملوث ہو گئے۔ اسی روش کے سبب ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لاء لگا اور جمہوریت کی بساط لپیٹ دی گئی۔ گویا جس مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے آمریت سے بچانے میں ناکام رہی۔

کاغذات پر تو مسلم لیگ کے ارکان کی تعداد لاکھوں تک پہنچی تھی اور اعداد و شمار سے یہ گمان ہوتا تھا کہ تنظیم کی بنیادیں بڑی وسیع اور تمام مکاتب فکر کی نمائندہ ہیں لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس تھی" اگر بڑے وسیع پیمانے پر بوگس ووٹ ڈالنے کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے، جو دھڑے بندیوں کی زیادہ طاقت ظاہر کرنے کی ایک واضح کوشش ہے، تو پھر عوامی سطح پر وسعت پذیر اثر و رسوخ کا دعویٰ ناقابل فہم نہ تھا۔"[1] متحارب دھڑوں کی طرف سے بوگس رکنیت سازی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش سے بعض بڑی مضحکہ خیز مثالیں بھی سامنے آئیں۔ بعض علاقوں میں مسلم لیگ کی رکنیت قبول کرنے والوں کی تعداد وہاں کی ساری بالغ آبادی سے بھی زیادہ تھی۔ اس سے مسلم لیگ کی بڑی رسوائی اور جگ ہنسائی ہوئی اور خود لیگ کے سنجیدہ اور ذمہ دار حلقوں کو اپنے پرجوش کارکنوں کے رویے پر بڑا دکھ ہوا۔

ستم ظریفی کی حد یہ تھی کہ خواجہ ناظم الدین نے ۱۹۵۲ء میں مسلم لیگ کی کنونشن میں بڑے طمطراق سے یہ دعویٰ کیا کہ مسلم لیگ کا چندہ رکنیت ادا کرنے والے ان باقاعدہ

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور (یومِ آزادی پر اشاعت خاص) ۱۴ر اگست ۱۹۵۰ء

ارکان کی تعداد ۶۰ لاکھ سے بھی زیادہ ہے جنہوں نے پرائمری لیگوں میں اپنے عہدیدار اور نمائندے چنے ہیں[1]۔ اگر اس دعوے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو لوگوں کی نظروں میں مسلم لیگ کی جو ساکھ تھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کثیر تعداد میں رکنیت کو کسی جماعت کی مقبولیت کا معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ مسلم لیگ کا پرائمری رکن بننے کے لئے ہر تین سال بعد صرف دو آنے کا چندہ ادا کرنے اور جماعت کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کے لئے دستخط یا انگوٹھا لگانے کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے۔ پاکستان کی آزادی و حاکمیت کا تحفظ، جمہوریت اور اسلامی نظام حیات کا فروغ، عدلیہ کی آزادی کا حصول وغیرہ وغیرہ[2]۔ کسی شخص کو بھی ان اغراض و مقاصد سے اختلاف نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ جس شخص کو بھی ان اغراض و مقاصد سے اتفاق تھا اس نے لازماً چندہ ادا کر کے مسلم لیگ کی باضابطہ طور پر رکنیت بھی اختیار کر لی تھی۔ لیگ کے پاس کوئی ایسا پروگرام نہ تھا کہ لوگ شعوری طور پر اس کی باقاعدہ رکنیت قبول کرتے، اس لئے محض ساٹھ لاکھ ارکان کا دعویٰ ہرگز اس بات کا ثبوت نہ تھا کہ یہ جماعت ہر دلعزیز ہے اور عوام اس کے گرویدہ ہیں۔ ٹھوس حمایت ہر جگہ اور ملک کے ہر حصّہ میں مفقود تھی اور مسلم لیگ پر بڑی تیزی سے اس طبقہ کی اجارہ داری قائم ہو رہی تھی۔ جو اسے اپنے ذاتی عزائم کے حصول کے لئے استعمال کرتا تھا یا اس سے وابستگی کو معاشی مفاد کا ذریعہ بناتا تھا[3]۔

مسلم لیگ آہستہ آہستہ بڑے زمینداروں اور کاروباری سیٹھوں کا ایک ادارہ بن کر رہ گئی۔ جمہوری نظام کی کامیابی کا دارومدار ایسی رائے عامہ پر ہوتا ہے

---

[1] ڈان کراچی ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء

[2] مشتاق احمد (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۱۴۲

[3] مشتاق احمد (بحوالہ سابقہ) صفحہ ۱۴۶

Marfat.com

جو پوری طرح باخبر ہو اور افراد اور ان کی نیتوں کی پوری ہوشمندی سے جانچ پڑتال کر سکے
پاکستان میں مقامی طور پر بیشتر ووٹر اہل ثروت کی مٹھی میں ہوتے تھے اور ناخواندہ اور بے شعور ووٹر کسی پروگرام سے مسحور ہو کر ووٹ ڈالنے کے لئے نہیں جاتے تھے بلکہ مضبوط اور بارسوخ افراد انہیں ہانک کر لے جاتے تھے۔ خان ممدوٹ مسلم لیگ سے استعفا دے کر اپوزیشن میں شامل ہو گئے اور نئی اسمبلی میں جناح عوامی لیگ کے رکن کے طور پر کامیاب ہو گئے۔ ہر بڑا زمیندار یہی کر سکتا تھا کیونکہ وہ جس جماعت سے بھی وابستگی اختیار کرتا، اس کے حلقے کے ووٹروں کو بھی وہی رخ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ مغربی پاکستان کے کسی بھی صوبے میں مسلم لیگ کے دورِ حکمرانی میں محض اس لئے صحیح زرعی اصلاحات نافذ نہ کی جا سکیں کہ یہ بات زمینداروں کے مفاد کے منافی تھی اور لیگ زمینداروں کی مٹھی میں تھی۔ سندھ اسمبلی میں جب قانون مزارعت (۱۹۵۰ء) منظور کیا گیا تو پیرزادہ عبدالستار کی خوب واہ واہ ہوئی کیونکہ زمینداروں کی اکثریت کے باوجود اس قانون کی منظوری کے سلسلہ میں ایوان میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی گئی۔[۵۱]

مغربی پاکستان کی تمام اسمبلیوں کے ارکان میں بڑے زمیندار ہی اکثریت میں تھے۔ مغربی پاکستان کے خصوصی زرعی ڈھانچے میں زمینداروں کی معاشی طاقت نے انہیں اس قدر سیاسی بالادستی عطا کر دی تھی کہ حق بالغ رائے دہی کے نفاذ اور نئی سیاسی پارٹیوں کے ظہور و فروغ سے ان کی اس بالادستی میں سرمو فرق نہ پڑا۔ مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں میں مسلم لیگ کی فتح بڑی حد تک بڑے زمینداروں کی حمایت و امداد کی مرہونِ منت تھی۔ مسلم لیگ پر ایک خاص طبقے

---

۵۱ ڈان کراچی - ۵ اپریل ۱۹۵۰ء

Marfat.com

کے قبضے کا ردعمل عوام میں نفرت سے ہوا۔ کچھ ہی عرصے میں مسلم لیگ عوام سے بالکل کٹ گئی۔ مشرقی پاکستان میں مخالفین کے متحدہ محاذ نے اسے مفلوج کر کے رکھ دیا۔ جس تنظیم نے انگریزوں اور ہندوؤں سے مسلمانوں کے لئے حق خود ارادیت بزورِ بازو چھینا تھا۔ وہ پاکستان کے قیام کے بعد اس ملک کو آمریت و استبداد سے بچانے کے معاملے میں بالکل بے بس ثابت ہوئی۔

Marfat.com

ضمیمہ

قراردادِ مقاصد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کُل کائنات کا بلاشرکتِ غیرِ حاکمِ مُطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیارِ حکمرانی ایک مقدّس امانت ہے۔

لہٰذا جمہورِ پاکستان کی نمائندہ یہ مجلسِ دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خود مختار مملکتِ پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

جس کی رُو سے مملکت جملہ حقوق و اختیاراتِ حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے سے استعمال کرے۔

جس میں اصُولِ جمہوریت و حریّت و مساوات و رواداری اور عدلِ عمرانی کو، جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پُورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

جس کی رُو سے مُسلمانوں کو اِس قابل بنایا جائے کہ وُہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنّتِ رسُولؐ میں متعیّن ہیں، ترتیب دے سکیں۔

جس کی رُو سے اس امر کا قرارِ واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیّتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور اُن پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

Marfat.com

جس کی رُو سے وُہ علاقے جو اب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہو گئے ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں ایک وفاقیہ بنائیں جس کے ارکان مقررکردہ حدود اربعہ و متعینہ اختیارات کے ماتحت خود مختار ہوں۔

جس کی رُو سے بنیادی حقوق کی ضمانت کی جائے اور ان حقوق میں قانون و اخلاقِ عامہ کے ماتحت مساواتِ حیثیت و مواقع، قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی عدل، خیال، اظہار، عقیدہ، دین، عبادت اور ارتباط کی آزادی شامل ہوں۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرارِ واقعی انتظام کیا جائے۔

جس کی رُو سے نظامِ عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رُو سے وفاقیہ کے علاقوں کی صیانت، اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا جن میں اس کے برّ و بحر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں، تحفّظ کیا جائے۔

تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں، اقوامِ عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں اور امنِ عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی و بہبود میں کما حقہٗ اضافہ کر سکیں۔

Marfat.com

مآخذ

اُردو کتابیں

حالی، شمس العلما مولانا الطاف حسین۔ حیاتِ جاوید۔ لاہور

حبیب احمد، چودھری۔ نظریۂ پاکستان۔ لائل پور

زبیری، محمد امین۔ سیاستِ ملیہ۔ آگرہ، ۱۹۴۱ء

سیّد، جی۔ ایم۔ مسلم لیگ کی مخالفت کیوں؟ حیدرآباد (سندھ) ۱۹۵۹ء

صدیق علی خان۔ بے تیغ سپاہی۔ کراچی، الائیڈ بک کارپوریشن، ۱۹۷۱ء

صفدر محمود۔ سقوطِ مشرقی پاکستان۔ لاہور، میری لائبریری، ۱۹۷۲ء

عبدالوحید، خان۔ تاثرات و تصوّرات۔ لاہور، گوشہ ادب (انارکلی) ۱۹۶۰ء

محمد علی، چودھری۔ ظہورِ پاکستان۔ لاہور، مکتبۂ کاروان، سن ندارد

محمودہ حمید نظامی۔ نشانِ منزل۔ لاہور

مشتاق احمد۔ ہنگاموں میں زندگی (قلمی مسودہ زیرِ طبع)

نور احمد، سیّد۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ لاہور، ملک دین محمد اینڈ سنز، سن ندارد۔

یاد، سیّد مشکور حسین۔ آزادی کے چراغ۔ لاہور، مکتبہ اردو ڈائجسٹ۔ ۱۹۷۱ء

Marfat.com

اخبارات و رسائل

روزنامہ مشرق، لاہور
روزنامہ نوائے وقت، لاہور
روزنامہ وفاق، لاہور
روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور
روزنامہ ڈان، کراچی
روزنامہ دی ایسٹرن ٹائمز
روزنامہ مارننگ نیوز، کراچی
روزنامہ پاکستان آبزرور، ڈھاکہ
روزنامہ پاکستان ٹائمز، لاہور
ہفتہ وار پیسہ اخبار، لاہور
ہفت روزہ چٹان، لاہور
ہفت روزہ لیل و نہار، لاہور
ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، لاہور

دستاویزات

آل انڈیا مسلم لیگ : آئین و ضوابط۔ دہلی، آل انڈیا مسلم لیگ، ۱۹۴۴ء

پاکستان مسلم لیگ : آئین۔ کراچی، پاکستان مسلم لیگ، ۱۹۴۸ء

ذاتی انٹرویو

امیر الدین، میاں

انصاری، مولانا ظفر احمد، ایم۔ این۔ اے

Marfat.com

انور، ابوسعید

دولتانہ، میاں ممتاز محمد خان

شمس الدین

شوکت حیات، سردار

ضیاء الاسلام، ڈاکٹر

عبدالقیوم، خان

عبدالوحید،

فضل الٰہی، چودھری

محمد صفدر، خواجہ

محمد علی، چودھری

ممدوٹ، نواب افتخار حسین

نورالامین

یوسف خٹک

ENGLISH BOOKS

Abdul Hamid, Muslim Separatism in India, Oxford University Press, Pakistan Branch, 1967.

Afzal, M. Rafique, Speeches & Statements of Liaquat Ali Khan, Research Society of Pakistan, University of the Panjab, Lahore.

Akhtar, Jamna Das, Political Conspiracies In Pakistan, Punjabi Pustak Bhandar, Delhi, 1969.

Allana, G., Quaid-e-Azam Jinnah: The Story of a Nation, Ferozsons, Lahore.

Ambedkar, B.R., Pakistan or Partition of India, Bombay.

Ayub Khan, M., Friends, Not Masters, Oxford University Press.

Aziz, A , Discovery of Pakistan, Lahore.

Aziz Ahmad, Jinnah: The Maker of Pakistan.

Bhutto, Z.A., The Myth of Independence, Oxford University Press, Pakistan Branch.

Marfat.com

Binder, Leonard, Religion And Politics In Pakistan, Berkeley, 1961.

Callard, Keith, Pakistan : A Political Study, London. George Allen And Unwin, 1957.

Chaudhry, G. W., Constitutional Development In Pakistan, Longmans, London. (1st & 2nd Edition).

Gankovsky Yu. V. & Gordon - Polonskaya, L. R. A History of Pakistan (1947-58) People's Publishing House Lahore. 1973.

Gupta, Jyoti Sen, Eclipse of East Pakistan, Renco Publications, Calcutta, 1963.

Hassan Mahmood, A Nation is Born, Lahore.

Hodson, H V., The Great Divide, Oxford Press, London.

Hunter, W W, The Indian Musalmans, London.

Inayat Ullah, Bureaucracy And Development in Pakistan, Peshawar.

Iqbal, Sir Muhammad, Letters of Iqbal to Jinnah, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore.

Jamil-ud-Din Ahmad, Muslim Political Movement, (All Phases) Lahore.

Jamil ud-Din Ahmad, Speeches & Writings of Jinnah, Sh Muhammad Ashraf, Lahore.

Jennings, Ivor, Constitutional Problems In Pakistan, Cambridge University Press, 1957.

Kamr-ud-Din Ahmad, The Social History of East Pakistan, Dacca, 1967.

Khalid Bin Sayeed, Pakistan. The Formative Phase, Oxford University Press, Pakistan Branch.

Marfat.com

Khalid Bin Sayeed, The Political System of Pakistan, Oxford.

Khaliq-uz-Zaman Chaudhry, Pathway to Pakistan. Longmans, Pakistan Branch, 1961.

Mary, Countess of Minto, India—Minto And Morley Macmillan, London, 1934.

Menon, V.P., The Transfer of Power in India, Princeton University Press.

Muhammad Noman, Muslim India, Allahabad, 1942.

Mushtaq Ahmad, Govt. & Politics In Pakistan, National Publishing House Ltd., Karachi.

Noon, Feroze Khan, From Memory, Ferozsons, Lahore.

Pirzada, Sharif-ud-Din, Foundations of Pakistan, National Publishing House Ltd., Karachi, 2 Volumes.

Qureshi, Dr. I. H., Pakistan : An Islamic Democracy, Lahore.

Rajput, A. B., Muslim League, Today & Yesterday, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1948.

Reza Khan, Mohd., What Price Freedom, Madras.

Safdar Mahmood, A Political Study of Pakistan, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore.

Shabbir Hussain, Syed, The Lengthening Shadows, Mujahid Publications, Rawalpindi, 1970.

Shah Nawaz, Begum, Father And Daughter, Lahore.

Smith, W. C., Pakistan as an Islamic State, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1951.

Suleri, Z.A., Politicians And Ayub, Rawalpindi.

Suleri, Z.A., Pakistan's Lost Years, Lahore.

Marfat.com

Symonds, Richard, The Making of Pakistan, Faber & Faber, London.

Tanvir Ahmad, Punjab Politics (1947-53) M.A. Thesis Political Science Deptt. University of the Panjab, 1963.

Tariq Ali Khan, Pakistan. Military Rule or People's Power, London.

Tinker, Hugh, India & Pakistan—A Political Analysis, Pall Mall Press, London, 1967.

Wasti, Syed Razi, Lord Minto and the Indian Nationalist Movement : 1905 - 1910. Oxford Clarendon Press, 1964.

MISCELLANEOUS

Keesings Contemporary Archives (Weekly).

Report of the Agrarian Committee, Appointed by Pakistan Muslim League (Working Committee) 1949.

Basic Principles Report (1950) — 1952 — 1954 As Adopted by the Constituent Assembly).

Constituent Assembly (Legislature) of Pakistan Debates (1948—54).

The Indian Annual Register, Calcutta.

Report on the Constitutional Reforms (1918).

Manifestos of the Provincial Muslim Leagues.

Report of the Court of Inquiry Constituted under Punjab Act II of 1954 to enquire into the Punjab Disturbances, of 1953. Govt, Printing Press, Lahore, (1954).

Marfat.com

اشاریہ

شخصیات

آزاد، ابوالکلام : ۴۳ -

آغاخاں، سر : ۱۹ -

آغا غلام نبی پٹھان : دیکھیے غلام نبی پٹھان -

ابراہیم خاں، خان محمد : ۸۸، ۱۷۳ -

ابراہیم خاں جھگڑا : ۱۰۰، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۱ تا ۲۲۵ -

ابراہیم، مرزا : ۱۷۶ -

ابوالکلام آزاد : دیکھیے آزاد -

ابوسعید انور : ۸۰، ۸۱، ۱۱۴ -

احتشام الحق تھانوی، مولانا : ۲۴۲ -

احمد سعید کرمانی، سیّد : ۱۷۶ -

احمد نواز، سیّد : ۲۰۸ -

اختر، جمنا داس : ۱۰۷ -

اختر شاہ : ۱۱۲ -

اختر علی، مولانا : ۱۷۰ -

اسکندر مرزا : ۳۳۰ -

اسماعیل، محمد : ۵۹، ۶۳ -

اعتزاز الدین : ۱۰۲، ۱۰۳ -

افتخار الدین، میاں : ۴۱، ۵۰، ۹۴، ۱۴۵، ۱۴۷، ۲۳۱، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۹۲ -

افتخار حسین ممدوٹ، نواب : دیکھیے ممدوٹ -

اقبال، علامہ (ڈاکٹر محمد اقبال) : ۲۵، ۲۹ -

Marfat.com

اکبر، قاضی محمد : ۱۹۴۔
اکرم خاں، مولانا : ۶۴،۴۴، ۹۱،
۱۰۰، ۲۳۰، ۲۳۵۔
الطاف حسین حالی، مولانا :
دیکھیے حالی۔
الٰہی بخش، پیر : ۸۶،۸۴، ۱۳۱،
۱۹۰، ۱۹۳، ۱۹۴،
۳۳۷۔
امیرالدین، میاں : ۱۴۹۔
امیراعظم خاں، سردار : ۲۰۸۔
امیر بہاولپور : ۲۶۱۔
امین زبیری : دیکھیے زبیری۔
انصاری، مولانا ظفر احمد : ۷۷۔
انعام الرحیم : ۱۰۵۔
انور، ملک محمد : ۱۶۸ تا ۱۷۰۔
اورنگ زیب، سردار : ۹۱۔
اے بی حلیم : دیکھیے حلیم۔
اے عزیز : ۲۹، ۴۲۔
اے کے بروہی : دیکھیے
بروہی۔
ایٹلی، لارڈ : ۴۶۔
ایس سی چٹو پادھیا : دیکھیے
چٹو پادھیا۔
ایلن برو، لارڈ : ۱۵۔
ایم اے کھوڑو : دیکھیے کھوڑو۔
ایوب خاں، محمد : ۱۰۴،۴۴، ۱۴۱،
۱۴۲، ۲۱۳، ۲۴۴،
۳۲۷ تا ۳۳۰،
۳۳۲، ۳۳۵۔
ایوب کھوڑو : دیکھیے کھوڑو۔
بابائے ملّت : دیکھیے قائد اعظم۔
بادشاہ گل : ۲۱۳، ۲۱۴۔
باز محمد خاں : ۲۶۵۔
بانیٔ پاکستان : دیکھیے قائد اعظم۔
بائنڈر، لیونارڈ : ۵۴۔
بروہی، اے کے : ۱۳۲۔
بشیر اللہ، چودھری : ۹۴۔
بوگرہ، محمد علی : ۱۰۴،۴۴، ۱۰۷،
۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۷،
۱۳۰ تا ۱۳۲، ۱۳۶،
۱۴۱، ۱۸۷، ۲۲۸،
۳۰۸ تا ۳۱۰، ۳۲۲،

Marfat.com

۳۲۳، ۳۲۶، ۳۳۰،
۳۳۲، ۳۳۶، ۳۶۱،
۳۶۳ -

بھاشانی، مولانا : ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۴،
۲۴۰، ۲۴۵، ۲۵۶،
۲۵۸، ۳۶۴ -

بھنڈارہ، پی ڈی : ۶۹ -

بیگم جی اے خاں : ۹۴ -

بیگم شاہ نواز : ۳۶، ۹۱، ۱۰۰، ۱۳۲ -

بیگم شوکت نواز : ۹۱ -

بیگم لیاقت علی خاں (رعنا لیاقت علی) :
۱۰۴، ۱۰۶، ۱۷۵ -

پیامبرِ اتحاد : دیکھیے قائد اعظم -

پیر الٰہی بخش : دیکھیے الٰہی بخش -

پیر پگاڑو : ۲۰۸ -

پیرزادہ عبدالستار : دیکھیے عبدالستار -

پیر زکوڑی شریف : ۲۱۷ -

پیر مانکی شریف : ۷۷، ۸۵، ۸۶،
۲۱۱، ۲۱۲،
۲۱۴ تا ۲۱۷، ۳۳۷،
۳۴۹، ۳۶۴ -

تاج الدین خاں، ملک : ۲۱۷ -

تاج محمد : ۱۹۹ -

تالپور، میر غلام علی : ۱۹۳، ۲۰۰،
۲۰۲، ۲۰۳، ۳۶۴ -

تمیز الدین خاں، مولوی : ۸۷،
۲۴۲، ۳۱۷، ۳۳۳ -

تنویر احمد : ۲۸۲، ۲۸۳ -

تھانوی، احتشام الحق : دیکھیے
احتشام الحق -

جعفر، کرنل : ۱۰۸ -

جعفر شاہ، میاں : ۲۱۷، ۲۲۷ -

جلال الدین : ۲۲۷ -

جمال میاں فرنگی محلی : ۵۸ -

جمنا داس اختر : دیکھیے اختر -

جمیل الدین احمد : ۲۱، ۲۲، ۴۱،
۲۳۵، ۲۵۳ -

جواہر لال نہرو : دیکھیے نہرو -

جھگڑا، ابراہیم خاں : دیکھیے
ابراہیم خاں جھگڑا -

جی ایم سید : ۴۲، ۵۳، ۳۴۲ -

جی ڈبلیو چودھری : ۱۱۸، ۳۲۹ -

Marfat.com

جیننگز، سر آئیور : ۳۱۴ -

جیوتی سین گپتا : ۱۰۷ -

چٹو پادھیا، ایس سی : ۲۹۳ -

چٹھہ، چودھری محمد حسین : ۱۷۷، ۱۸۶ -

چرچل : ۳۸ -

چندریگر، آئی آئی : ۱۸۱ -

چودھری، جی ڈبلیو : دیکھیے

جی ڈبلیو چودھری -

حالی، مولانا الطاف حسین : ۱۵ -

حبیب اللہ، خواجہ : ۱۳۲ -

حسن محمود، سیّد : ۱۷۳ -

حسین امام : ۲۶۰، ۲۶۱ -

حسین شہید سہروردی : دیکھیے

سہروردی -

حلیم، اے بی : ۱۷۳ -

حمید اللہ، سید : ۹۴ -

خالد بن سید : ۲۷ -

خان افتخار حسین ممدوٹ : دیکھیے

ممدوٹ

خان صاحب، ڈاکٹر : ۲۱۱ -

خان عبدالقیوم خاں : دیکھیے

— عبدالقیوم خاں -

خانِ قلات : ۲۶۲ -

خضر حیات ٹوانہ : ۳۹، ۴۲، ۴۵ -

خلیق الزمان، چودھری : ۳۵،

۸۱، ۸۲، ۸۵ تا ۹۴،

۹۶ تا ۹۸، ۱۰۱، ۱۶۴،

۲۱۳ تا ۲۱۶، ۲۳۲،

۲۳۳، ۲۳۷، ۲۶۲،

۲۶۳، ۳۴۸، ۳۵۰،

۳۵۱، ۳۵۴، ۳۵۵ -

خلیل الرحمان، سید : ۸۷ -

خورشید احمد، شیخ : ۱۴۹ -

خیر، سید : ۱۹۹ -

خیرات حسین : ۲۳۲ -

دتا، بی کے : ۲۹۲ -

دستی، عبدالحمید : ۱۵۲، ۱۷۷ -

دولتانہ، میاں ممتاز محمد : ۹۱ تا ۹۴،

۱۰۰، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۴۳،

۱۴۸ تا ۱۵۷، ۱۶۰،

۱۶۲، ۱۶۸ تا ۱۷۳،

۱۷۶ تا ۱۷۸، ۱۸۱،

Marfat.com

۱۸۳ تا ۱۸۸، ۲۲۱،
۲۸۳، ۲۸۶، ۳۲۸،
۳۳۵، ۳۵۲ تا ۳۵۴،
۳۶۴ -
دھینا نجار، اے ایم اے : ۶۹ -
دین محمد، شیخ : ۲۰۱ -
ڈوگرہ حکمرانِ ریاست جموں وکشمیر :
۵۲ -
ڈیوک آف ولنگٹن : ۱۶ -
راجگوپال اچاریہ : ۳۷، ۳۸ -
رشید علی خاں، نوابزادہ : ۹۴ -
رضا خاں، محمد : ۳۱، ۳۵، ۴۱،
۴۵، ۴۶، ۵۶،
۵۸، ۵۹ -
رعنا لیاقت علی خاں : دیکھیے بیگم
لیاقت علی خاں -
رفیق افضل، ایم : ۲۷۱ -
زبیری، محمد امین : ۱۶ -
زین العابدین شاہ، سید : ۹۴ -
سائمن، سرجان : ۲۴ -
سائمنڈز، رچرڈ : ۳۳، ۲۶۸، ۲۷۶ -
سٹمن، رابرٹ : ۶۸ -
سٹیفورڈ کرپس، سر : دیکھیے کرپس۔
سرحدی گاندھی : دیکھیے
عبدالغفار خاں -
سردار نشتر : دیکھیے نشتر -
سرسید احمد خاں : ۱۶، ۱۹،
۲۱۷، ۲۴۰، ۲۴۱ -
سعداللہ، سرمحمد : ۳۱، ۳۶ -
سکندر حیات، سر : ۳۱، ۳۶، ۳۹ -
سلطان احمد، سر : ۳۶ -
سلمیٰ تصدق حسین، بیگم : ۹۴ -
سلہری (سلیری)، زیڈ اے : ۱۲۱،
۱۲۵، ۱۳۹، ۱۴۰،
۱۸۴، ۲۵۳ تا ۲۵۶،
۲۵۸، ۳۰۱، ۳۰۵،
۳۰۸، ۳۰۹، ۳۵۶،
۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰ -
سلیم اللہ، نواب : ۱۹ -
سلیمان ندوی، سید : ۳۱۹ -
سہروردی، حسین شہید : ۶۵،
۶۶، ۱۳۵، ۱۳۶،

Marfat.com

۱۳۹، ۱۷۳، ۱۷۷،
۲۱۷، ۲۳۱، ۲۴۰،
۲۵۶ تا ۲۵۸، ۳۲۳،
۳۳۰، ۳۵۶، ۳۶۴۔

سیّد احمد خاں، سر: دیکھیے
سر سیّد احمد خاں۔
سید اکبر: ۱۰۴ تا ۱۰۶۔
سیّد، جی ایم: دیکھیے
جی ایم سیّد۔
شاہ جہاں، ملک: ۲۶۵۔
شبیر احمد عثمانی، مولانا: ۹۱۔
شریف الدین ملک: ۱۷۳۔
شفیع، سر محمد: ۲۵۔
شمس الحق، مرزا: ۲۲۹۔
شمس الدین: ۲۳۲، ۲۳۷،
۲۴۵، ۲۵۷۔
شنکر راؤ دیو: ۳۴۵۔
شوکت حیات، سردار: ۱۴۳،
۱۴۹۔
شہاب الدین خواجہ: ۹۷، ۱۰۶،
۱۶۶، ۲۲۷۔

شہیدِ ملّت: دیکھیے لیاقت علی خاں۔
شیاما پرشاد مکرجی: دیکھیے
مکرجی۔
شیر بہادر: ۹۴۔
شیرِ سرحد: دیکھیے عبدالقیوم خاں
شبیر مہدی، راجہ: ۹۴۔
صدیق علی خاں: ۱۰۴، ۱۰۶،
۱۰۸، ۱۰۹، ۱۲۳۔
صلاح الدین، چودھری:
۹۴، ۱۱۲۔
ضیاء الاسلام، ڈاکٹر: ۱۴۲،
۱۴۹۔
طارق علی خاں: ۱۷۶، ۲۵۷۔
ظفر اللہ خاں: ۱۲۲، ۳۳۰۔
ظفر اللہ، سردار محمد: ۹۴۔
ظل خاں، ملک: ۹۴۔
عبدالباری، میاں: ۱۴۵،
۱۶۲ تا ۱۶۴، ۱۶۶،
۱۶۸ تا ۱۷۱۔
عبدالباقی، مولانا: ۸۷۔
عبدالحمید: ۲۵۔

Marfat.com

عبدالحمید، سردار : ۹۴ -
عبدالحمید، صوفی : ۹۱، ۱۰۰،
۱۷۱، ۱۷۷، ۱۸۱ -
عبدالحمید دستی : دیکھیے دستی -
عبدالرب نشتر، سردار : دیکھیے
نشتر -
عبدالرشید : ۲۶۱ -
عبدالرشید، سردار : ۲۲۹، ۲۳۰ -
عبدالستار، پیرزادہ : ۱۲۱، ۱۹۶،
۲۰۸ تا ۲۱۰، ۳۶۳،
۳۶۸ -
عبدالغفار خاں (سرحدی گاندھی) :
۴۷، ۲۱۱ -
عبدالفتح : ۱۹۹ -
عبدالقوی، چودھری : ۹۴ -
عبدالقیوم خاں، خان (شیرِ سرحد،
مردِ آہن) : ۴۱، ۵۵، ۸۵،
۸۶، ۹۱، ۱۰۰،
۲۱۱ تا ۲۱۶، ۲۱۸ تا
۲۲۱، ۲۲۳ تا ۲۳۰،
۳۳۷، ۳۴۹، ۳۵۲ -
عبدالکریم : ۸۷ -
عبدالمجید، سید : ۱۰۰ -
عبدالمجید، مولوی : ۹۱ -
عبدالوحید خاں : ۹۴، ۹۷،
۲۱۳، ۲۵۰، ۲۵۲،
۳۵۱، ۳۶۱ -
عزیزالدین : ۱۳۲ -
عزیزالدین، چودھری : ۹۴ -
عطاءالرحمٰن : ۲۳۱، ۲۳۲ -
علاؤالدین صدیقی، مولانا (علامہ) :
۸۴، ۹۱، ۱۴۵،
۱۴۶، ۱۵۳ -
علی حسین شاہ، سید : ۹۴ -
علی حسین گردیزی، سید : دیکھیے
گردیزی -
عینی، قاضی محمد : ۸۸، ۹۱،
۱۰۰، ۱۳۰،
۲۶۲ تا ۲۶۴ -
عینی خاں، سردار محمد : ۲۶۵ -
غضنفر علی خاں، راجہ : ۹۱، ۳۰۵ -
غلام علی : ۱۹۹ -

Marfat.com

غلام علی تالپور، میر : دیکھیے تالپور۔
غلام محمد : ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۴ تا ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۰ تا ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۳۹، ۱۴۰، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۵۸، ۲۵۹، ۳۲۸ تا ۳۳۲، ۳۶۲، ۳۶۵، ۳۶۶ -
غلام محمد خاں لونڈخوڑ : ۲۱۶ -
غلام مصطفٰے خالد گیلانی، سید : ۹۴ -
غلام نبی پٹھان، آغا : ۸۸، ۱۷۳، ۲۰۰، ۲۰۲ -
غلام نبی، ملک : ۱۴۵، ۱۴۶ -
غیاث الدین پٹھان : ۸۷، ۱۱۲، ۲۴۲ -
فاطمہ، بیگم : ۹۴ -
فاطمہ جناح، مس (مادرِ ملت) : ۹۱، ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۷۵، ۲۴۳، ۲۶۹، ۲۷۰ -
فضل الحق، مولوی : ۳۰، ۳۶، ۱۳۵، ۱۳۶، ۲۴۰، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۵۶ تا ۲۵۸، ۳۱۷ -
فضل الرحمٰن : ۲۴۲ -
فضل القادر، چودھری : ۱۳۵، ۲۴۴، ۳۱۵ -
فضل اللہ، قاضی : ۱۰۰، ۱۹۷ تا ۲۰۲، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۰ -
فضل الٰہی، چودھری : ۹۴، ۱۵۲ -
فضل الٰہی پراچہ، شیخ : ۱۷۷ -
فیروز خاں نون : دیکھیے نون -
قادر بخش، میر : ۲۶۳، ۲۶۵ -
قائد اعظم محمد علی جناح (پیامبر اتحاد، بانیٔ پاکستان، بابائے ملّت) : ۹، ۲۲ تا ۲۶، ۲۸، ۲۹، ۳۲ تا ۳۴، ۳۷، ۳۸، ۴۳، ۴۷، ۴۸، ۵۰، ۵۱، ۵۵، ۵۶، ۵۸، ۶۱، ۶۷ تا ۷۸، ۸۰، ۹۰، ۹۱، ۱۰۲،

۱۱۴، ۱۲۳، ۱۴۴،
۱۴۹ تا ۱۵۱، ۱۶۵،
۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۴،
۱۷۵، ۱۸۹ تا ۱۹۳،
۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۵، ۲۳۰،
۲۳۵، ۲۳۷، ۲۵۲،
۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۱،
۲۸۳، ۲۸۹، ۲۹۷،
۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۹،
۳۱۷، ۳۲۱، ۳۲۷،
۳۴۴، ۳۴۶ تا ۳۴۸،
۳۵۷، ۳۷۰، ۳۷۱ ۔

قائدِ ملت : دیکھیے لیاقت علی خاں ۔

قربان علی : ۱۰۲ ۔

قزلباش، ایم این : ۱۳۲ ۔

کرامت علی، شیخ : ۱۴۳ ۔

کرپس، سر سٹیفورڈ : ۳۷ ۔

کھوڑو، محمد ایوب : ۸۶، ۹۳،
۱۰۰، ۱۸۹ تا ۱۹۱،
۱۹۳ تا ۱۹۶، ۱۹۸ تا
۲۰۳، ۲۰۵ تا ۲۰۸،
۲۱۰، ۲۱۱، ۲۲۱،
۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۷،
۳۵۳، ۳۵۴، ۳۶۳ ۔

کیانی، ملک الرحمٰن : ۲۲۷ ۔

کیلارڈ، کینتھ : ۵۰، ۷۳، ۲۶۷،
۲۶۹، ۲۷۶، ۳۱۴،
۳۱۵، ۳۵۰،
۳۶۱ تا ۳۶۴ ۔

گاندھی : ۲۳، ۴۰، ۲۱۱ ۔

گپتا، جیوتی سین : دیکھیے
جیوتی سین ۔

گردیزی، سید علی حسین : ۱۷۷ ۔

گورمانی (گرمانی)، نواب مشتاق احمد :
۹۷، ۱۰۵، ۱۰۸،
۱۰۹ ۔

لارڈ ایٹلی : دیکھیے ایٹلی ۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن : دیکھیے
ماؤنٹ بیٹن ۔

لارڈ منٹو : دیکھیے منٹو ۔

لاری، زیڈ ایچ : ۶۴، ۹۲ ۔

لیاقت علی خاں، نوابزادہ (قائدِ ملت،

Marfat.com

شہیدِ ملّت) : ۲۶، ۵۹، ۷۵، ۷۶، ۹۱، ۹۳، ۹۵ تا ۹۹، ۱۰۱ تا ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۸ تا ۱۱۰، ۱۱۷، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۹ تا ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۹۹، ۲۱۵، ۲۱۹ تا ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۳۷، ۲۶۰، ۲۶۲، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۶، ۲۹۸، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۹، ۳۲۶، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۵، ۳۵۸، ۳۶۴ -

مادرِ ملّت : دیکھیے فاطمہ جناح -

ماؤنٹ بیٹن، لارڈ : ۶۴، ۸۴ -

مبارک علی، میجر : ۱۵۲ -

مجتبیٰ، قاضی : ۱۹۷ -

مجیب الرحمٰن، شیخ : ۲۴۵، ۲۵۴ -

محسن الملک، نواب : ۱۹ -

محفوظ الٰہی، پیر : ۲۰۸

محمد اسماعیل : دیکھیے اسماعیل، محمد -

محمد اقبال، ڈاکٹر : دیکھیے اقبال، علامہ -

محمد اکرم خاں، مولانا : دیکھیے اکرم خاں -

محمد انور، ملک : دیکھیے انور، ملک -

محمد ایوب خاں : دیکھیے ایوب خاں -

محمد ایوب خاں (سرحد) : ۲۲۷ -

محمد ایوب کھوڑو : دیکھیے کھوڑو -

محمد حسن : ۲۶۵ -

محمد حسین چٹھہ : دیکھیے چٹھہ -

محمد شاہ : ۱۰۵ -

محمد علی بوگرہ : دیکھیے بوگرہ -

Marfat.com

محمد علی جناح : دیکھیے قائد اعظم ۔
محمد علی، چودھری : ۱۹۵، ۲۷۱،
۲۹۸، ۳۲۳، ۳۳۰ ۔
محمد نعمان : دیکھیے نعمان، محمد ۔
محمد ہاشم گزدر : دیکھیے ہاشم گزدر ۔
محمود احمد منٹو : ۹۴ ۔
محمود جاوید : ۱۰۵ ۔
مرد آہن : دیکھیے عبدالقیوم خاں ۔
مشتاق احمد : ۳۴۸، ۳۴۹،
۳۶۲، ۳۶۸ ۔
مشتاق گورمانی، نواب : دیکھیے
گورمانی ۔
مصطفیٰ خالد گیلانی : دیکھیے
غلام مصطفیٰ خالد گیلانی ۔
مکرجی، شیاما پرشاد : ۲۵۸ ۔
ملک الرحمن کیانی : دیکھیے کیانی ۔
ملکۂ انگلستان : ۱۲۳ ۔
ممتاز دولتانہ، میاں : دیکھیے
دولتانہ ۔
ممدوٹ، نواب افتخار حسین : ۹۱،
۱۰۱، ۱۳۱، ۱۴۳،
۱۴۵، ۱۴۸ تا ۱۵۰،
۱۵۲، ۱۵۶، ۱۵۷،
۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۶،
۱۶۸، ۱۷۱ تا ۱۷۳،
۱۸۵، ۲۱۷، ۲۸۱،
۲۸۳، ۳۵۲، ۳۵۳،
۳۵۶، ۳۶۴ ۔
منٹو، کوئنٹس میری : ۲۰ ۔
منٹو، لارڈ : ۱۹ ۔
منٹو، محمود احمد : دیکھیے
محمود احمد ۔
منیر، جسٹس : ۱۰۶، ۳۳۴ ۔
موتی لال نہرو : دیکھیے نہرو ۔
موڈی، سر فرانسس : ۱۴۹،
۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۶،
۳۳۷ ۔
میاں، کرنل : ۱۰۸ ۔
میراں شاہ : مخدوم الملک : ۱۱۲ ۔
میراں محمد شاہ : ۲۰۲ ۔
مینن، وی پی : ۶۵ ۔
ناظم الدین، خواجہ : ۳۶، ۱۱۰ تا ۱۱۲،

Marfat.com

۱۱۶، ۱۱۸، تا ۱۲۰،
۱۲۳ تا ۱۲۹، ۱۳۲،
۱۵، ۱۷۷، ۱۸۴،
۲۰۲، ۲۰۴، ۲۰۹،
۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۱،
۲۳۷، ۲۳۹، ۲۵۱،
۲۵۶، ۲۶۱، ۲۶۵،
۲۶۶، ۲۹۶، ۳۰۱،
۳۰۶ تا ۳۱۰، ۳۱۹،
۳۲۲، ۳۲۶، ۳۲۸،
۳۳۱، ۳۳۵، ۳۳۶،
۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۲،
۳۶۳، ۳۶۶، ۳۶۷ -

نبی بخش، میر : ۹۸، ۲۶۳، ۲۶۵ -

نشتر، سردار عبدالرب : ۵۷،
۷۶، ۸۱، ۱۳۲، ۱۶۵،
۱۷۵، ۱۷۶، ۱۸۱،
۱۸۳، ۲۱۱، ۲۱۷،
۲۴۷ -

نصراللہ خاں : ۱۵۲ -

نصیر احمد ملھی، چودھری : ۸۸ -

نعمان، محمد : ۱۹، ۲۰ -

نعمت اللہ قریشی : ۱۹۹ -

نوابزادہ لیاقت علی خاں : دیکھیے
لیاقت علی خاں -

نواب ممدوٹ : دیکھیے ممدوٹ -

نوبہار شاہ، پیر : ۱۸۲ -

نور احمد : ۹۴ -

نور احمد، سید : ۶۶، ۹۱،
۱۴۹، ۳۶۲ -

نورالامین : ۹۱، ۱۰۰، ۱۲۹،
۱۳۳، ۲۳۱، ۲۳۲،
۲۳۷، ۲۴۱، ۲۴۸،
۲۵۰ تا ۲۵۲، ۲۵۶،
۲۵۹، ۳۱۶ -

نور محمد خاں، سردار : ۲۶۵ -

نُون، ملک فیروز خاں : ۱۵۲،
۱۸۵ تا ۱۸۸،
۲۳۹، ۳۳۵ -

نہرو، جواہر لال : ۲۷، ۴۴، ۴۶ -

نہرو، موتی لال : ۲۴ -

وقارالملک، نواب : ۱۹، ۲۰ -

Marfat.com

ولایت علی خاں، نوابزادہ :
۱۵۶، ۱۵۹ -

ہاشم گزدر، محمد : ۱۹۱، ۲۰۱ -

ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو : ۱۵ -

یوسف خٹک : ۸۷، ۲۱۱،
۲۱۲، ۲۱۴، ۲۱۶،
۲۱۸ تا ۲۲۶، ۲۶۱ -

یوسف علی چودھری : ۹۱، ۱۰۰ -

یوسف ہارون : ۹۱، ۱۱۲،
۱۳۲، ۱۹۴ تا ۱۹۶،
۱۹۸، ۳۵۲ -

مقامات

آزاد کشمیر : ۱۵۵

آسام : ۳۱، ۳۴، ۳۶، ۳۸،
۴۷، ۲۴۰ -

آسٹریلیا : ۱۹۸ -

الٰہ آباد : ۲۵، ۲۷ -

امرتسر : ۲۳، ۱۴۵، ۱۴۶ -

امریکہ، ریاست ہائے متحدہ : ۶۴،
۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۶،
۳۰۰، ۳۳۰، ۳۵۱ -

انگلستان : ۳۴۶ -

برطانوی بلوچستان : دیکھیے
بلوچستان -

برطانیہ : ۶۴، ۱۰۳، ۱۲۳،
۳۱۳ -

بلوچستان : ۳۴، ۴۷، ۱۰۲،
۱۱۱، ۱۳۰، ۱۸۶،
۲۳۸، ۲۶۰ تا ۲۶۳،
۲۶۵، ۲۶۶، ۳۱۱ -

بمبئی : ۲۷۸ -

بنگال : ۲۸ تا ۳۰، ۳۴، ۳۶،
۳۸، ۴۶، ۴۷،
۲۴۰، ۲۵۳، ۳۱۴ -
نیز دیکھیے :-
مشرقی پاکستان -

بنگال، آزاد (خود مختار بنگال) :
۲۵۷ -

بنگال، مشرقی : دیکھیے
مشرقی پاکستان -

Marfat.com

بنگلہ دیش (نام نہاد) : ۲۴۵ -

بھارت (ہندوستان) : ۴۹، ۵۰، ۵۲، ۶۰، ۶۴، ۹۶، ۳۲۲، ۳۵۰ -

بہاول پور : ۱۱۳، ۱۷۷، ۲۶۰، ۲۶۱، ۳۱۱ -

پاکستان : ۴۹، ۶۴، ۶۵ -

پٹنہ : ۳۱، ۳۲ -

پشاور : ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۴، ۲۲۸ -

پنجاب (غیر منقسم) : ۲۸، ۳۰، ۳۴، ۳۶، ۴۰، ۴۶، ۴۷، ۸۴، ۸۶، ۹۳، ۹۴ - نیز دیکھیے :- مغربی پنجاب -

پنجاب، مشرقی : دیکھیے مشرقی پنجاب -

پنجاب، مغربی : دیکھیے مغربی پنجاب -

پنڈی : دیکھیے راولپنڈی -

تانگیال : ۲۳۲ -

جموں و کشمیر : دیکھیے کشمیر -

جُوناگڑھ : ۵۴ -

چاند پور : ۲۴۱ -

چٹاگانگ : ۱۱۸ -

حیدر آباد (دکن) : ۹۶، ۳۵۰ -

خاران : ۲۶۱ -

خیر پور : ۱۱۳، ۲۶۰، ۳۱۱ -

دہلی : ۲۵، ۲۷، ۴۷ -

ڈھاکہ : ۲۰، ۲۱، ۴۷، ۱۱۲، ۲۳۵، ۲۷۱، ۳۱۷ -

راولپنڈی (پنڈی) : ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۹ -

رُوس : ۲۹۲ -

زیارت : ۱۹۱ -

زیُورچ : ۱۳۹، ۱۴۰، ۳۳۰ -

سرحد (شمال مغربی سرحدی صوبہ) : ۳۴، ۳۸، ۴۷، ۵۵، ۸۶، ۱۱۷، ۱۲۵، ۱۷۷، ۱۸۶، ۲۱۱، ۲۳۸، ۳۱۱، ۳۴۹ -

Marfat.com

سلہٹ : ۴۷ ، ۲۴۰ ۔

سندھ : ۳۴ ، ۳۸ ، ۴۲ ، ۴۷ ، ۸۶ ، ۹۳ ، ۱۱۳ ، ۱۱۷ ، ۱۲۵ ، ۱۳۲ ، ۱۷۷ ، ۱۹۱ ، ۱۹۲ ، ۱۹۹ ، ۲۳۸ ، ۳۱۱ ، ۳۲۹ ، ۳۳۷ ، ۳۵۴ ، ۳۶۳ ۔

سی پی : ۲۷۸ ۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ : دیکھیے سرحد ۔

شملہ : ۱۹ ۔

شہید مینار (ڈھاکہ) : ۲۵۲ ۔

علی گڑھ : ۲۲ ، ۳۲ ۔

غازی آباد : ۱۷ ۔

قبائلی علاقے : ۱۱۳ ، ۳۱۱ ۔

قلات : ۲۶۱ ۔

کاٹھیاواڑ : ۲۷۸ ۔

کراچی : ۲۱ ، ۳۹ ، ۴۷ ، ۵۵ ، ۱۱۱ ، ۱۱۳ ، ۱۲۹ ، ۱۴۹ ، ۱۸۳ ، ۱۹۱ ، ۲۳۲ ، ۲۶۲ ، ۳۰۸ ، ۳۱۱ ، ۳۲۸ ، ۳۳۰ ۔

کشمیر (جموں و کشمیر) : ۵۲ ، ۵۴ ، ۲۶۰ ، ۲۷۸ ، ۳۰۳ ۔ نیز دیکھیے آزاد کشمیر ۔

کلکتہ : ۳۲ ، ۲۵۳ ۔

کوہاٹ : ۲۱۷ ۔

کوئٹہ : ۲۶۴ ۔

لاہور : ۳۴ ، ۵۰ ، ۸۰ ، ۱۱۸ ، ۱۱۹ ، ۱۸۳ ، ۳۰۸ ۔

لس بیلہ : ۲۶۱ ۔

لکھنؤ : ۲۲ ، ۳۲ ۔

لندن : ۲۶ ، ۱۲۳ ، ۳۳۰ ۔

مدراس : ۵۹ ۔

مشرقی پاکستان (مشرقی بنگال) : ۷۳ ، ۱۱۱ ، ۱۱۳ ، ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۱۲۹ ، ۱۳۳ ، ۱۳۴ ، ۱۳۶ ، ۱۳۷ ، ۱۳۹ ، ۱۸۶ ، ۲۳۵ ، ۲۴۰ ، ۲۴۱ ، ۲۵۱ ، ۲۵۵ ، ۲۵۶ ،

Marfat.com

۲۶۷، ۲۷۲، ۲۸۳، ۲۸۹، ۲۹۵، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۵ تا ۳۰۸، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۴ تا ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۳۱، ۳۳۵، ۳۳۷، ۳۴۶، ۳۴۸، ۳۶۱، ۳۶۲ ۔

مشرقی پنجاب (بھارتی پنجاب): ۴۹ ۔

مغربی پاکستان: ۷۳، ۷۴، ۱۱۳، ۱۱۸، ۱۸۰، ۲۴۱، ۲۵۵، ۲۷۲، ۲۸۴، ۲۸۹، ۲۹۴، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۹، ۳۲۲، ۳۲۶، ۳۲۹، ۳۳۱، ۳۳۵، ۳۴۶، ۳۴۸، ۳۶۲، ۳۶۸، ۳۶۹ ۔

مغربی پاکستان، وحدت: ۷۳، ۱۹۵، ۲۱۰، ۲۱۱ ۔

مغربی پنجاب (پاک پنجاب، پنجاب): ۴۹، ۵۰، ۶۴، ۱۰۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۲، ۱۴۴، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۷۴، ۱۷۷، ۱۸۰، ۲۳۸، ۲۸۰، ۳۰۸، ۳۱۱، ۳۲۹، ۳۳۵، ۳۳۷ ۔

مکران: ۲۶۱ ۔

نتھیا گلی: ۱۱۰ ۔

نرائن گنج: ۲۳۲ ۔

ہزارہ: ۱۰۵

ہندوستان: دیکھیے بھارت ۔

ہندوستان، متحدہ: ۳۹، ۴۶ ۔

یوپی: ۲۸، ۶۴، ۲۷۸، ۳۱۷ ۔

موضوعات

آخری مغل شہنشاہ کی معزولی: ۱۵ ۔

Marfat.com

آزاد (خود مختار) بنگال : ۲۵۷ -

آزاد مسلم مملکت : دیکھیے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن -

آل انڈیا کانگرس : دیکھیے انڈین نیشنل کانگرس -

آل انڈیا کانگرس پارٹی : ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۷۲ -

آل انڈیا کانگرس کمیٹی : ۶۷ -

آل انڈیا مُسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن : ۳۲ -

آل انڈیا مسلم لیگ : ۱۹، ۲۱، ۴۰، ۵۶، ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۲، ۶۳، ۷۰، ۱۴۷، ۲۳۲، ۲۶۸، ۲۹۹، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۷۰ -

آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس : ۲۱، ۲۲، ۲۵، ۲۷، ۳۱، ۳۴، ۳۹ -

آل پارٹی کانفرنس (کُل جماعتی کانفرنس) : ۲۵، ۳۲ -

آل پاکستان مسلم لیگ : دیکھیے پاکستان مسلم لیگ -

آئین ساز اسمبلی : دیکھیے دستور ساز اسمبلی -

آئین سازی (دستور سازی، آئین کی تشکیل، ترتیب وتدوین) : ۱۱۸، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۶، ۱۷۲، ۲۸۸ تا ۲۹۰، ۲۹۶، ۲۹۷، ۳۰۰، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۱۰، ۳۱۴، ۳۲۱، ۳۲۳، ۳۲۵ تا ۳۲۷، ۳۳۰، ۳۳۵، ۳۷۵، ۳۷۷، ۳۸۰ -

آئین کے اغراض ومقاصد : دیکھیے قراردادِ مقاصد -

آئین کی معطّلی : ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۷۷، ۱۷۸، ۳۵۳ -

آئینی انقلاب : ۳۳۶ -

آئینی بُحران : ۱۱۷، ۱۲۱ -

آئینی مصالحت کا فارمولا : ۱۳۰ -

Marfat.com

اتحاد، یقینِ محکم اور تنظیم :
۵۴، ۳۷۳ -
اجلاس، مسلم لیگ کے : دیکھیے
آل انڈیا مسلم لیگ کے
سالانہ اجلاس -
احرار (مجلس احرار اسلام) :
۴۱، ۱۲۰ -
احمدی (قادیانی) : ۱۱۸ - نیز دیکھیے
اینٹی قادیانی تحریک -
اُردو بطور قومی زبان : ۳۱۶،
۳۱۸، ۳۱۹ -
اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن : ۱۹ -
اردو کے خلاف تحریک : ۱۸ -
نیز دیکھیے لسانی تنازعات -
اردو ہندی نزاع : ۱۸ -
استحصال : ۱۳۳ -
استصواب رائے (سرحد) :
۴۷، ۸۵ -
اسلام خطرے میں : ۳۶۲ -
اسلامی آئین : ۳۰۰ -
اسلامی تعلیمات : ۶۲، ۸۴، ۱۱۵، ۱۴۷، ۲۴۹ -
اسلامی تہذیب و ثقافت : ۲۹ -
اسلامی جمہوریت : ۱۷۲ -
اسلامی جمہوریۂ پاکستان : ۱۳۲ -
اسلامی ریاست : ۲۹۹، ۳۰۰ -
اسلامی قانون (شریعت) : ۳۰ -
اسلامی معاشرے کا قیام : ۵۳ -
اسلامی نظام : ۲۳۱، ۲۴۲ -
اعلیٰ اور غالب (بالاتر) ادارہ :
۱۰۱، ۱۵۳، ۳۵۰،
۳۵۴، ۳۵۶ -
اقتصادی بحران : ۱۲۱ -
اقربا پروری (اقربا نوازی) :
۱۸۳، ۱۹۴، ۲۰۱،
۲۴۵ -
اقلیتوں کے حقوق : دیکھیے
غیر مسلموں کے مفادات -
اکھنڈ ہندوستان : ۳۹، ۴۶ -
الوداعی ٹھوکر : ۲۰۱ -
الیکشن ٹربیونل : ۱۹۴ -
انتخابی عذر داری : ۱۹۴ -

Marfat.com

انتخابی منشور : ۱۷۳۔
انتقالِ اقتدار کا طریقِ کار : ۴۶۔
انجمن تحفّظ حقوقِ زمینداران
تحت الشریعۃ : ۱۸۰ تا ۱۸۲۔
انڈین نیشنل کانگریس (آل انڈیا
کانگریس یا کانگریس) : ۱۸، ۱۹،
۲۶، ۲۷، ۴۱، ۲۶۸،
۲۷۲، ۲۸۸، ۳۴۱ تا
۳۴۳۔
انڈین یونین مسلم لیگ : ۶۰،
۶۳، ۶۷۔
انسانی آزادی : ۶۲۔
انقلابی پروگرام : ۱۵۴۔
انقلابی سوشلسٹ پارٹی : ۲۴۳۔
انگریز سلطنت : ۱۴۔
ایڈہاک کمیٹی (مشترکہ) : ۶۰۔
ایسٹ انڈیا کمپنی : ۱۴، ۱۵۔
ایف بی آئی (امریکہ) : ۱۰۴۔
ایگزیکٹو کونسل، وائسرائے کی :
دیکھیے وائسریگل
ایگزیکٹو کونسل۔
اینٹی بنگالی رپورٹ : ۲۹۶۔
اینٹی قادیانی تحریک (تحفّظ ختمِ
نبوت) : ۱۱۸، ۱۲۰ تا
۱۲۲، ۱۲۴، ۱۸۴،
۳۰۸، ۳۳۵، ۳۳۷۔
اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی
ایشن : ۱۹۔
ایوانِ بالا (مرکزی مقنّنہ) :
۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۰،
۳۱۱، ۳۱۶، ۳۲۲۔
ایوانِ زیریں (مرکزی مقنّنہ) :
۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۰،
۳۱۱، ۳۲۲۔
ایوب حکومت : ۱۰۔
بالغ رائے دہی (رائے دہندگی) :
۲۱۸، ۲۹۰، ۲۹۵،
۲۹۸، ۳۰۲۔
بحران : دیکھیے آئینی بحران۔
اقتصادی بحران۔ سیاسی
بحران۔ وزارتی بحران۔
برٹش انڈین ایسوسی ایشن : ۱۷۔

Marfat.com

برطانوی پارلیمنٹ : ۱۷-
برطانوی راج : ۲۰-
برطانوی سامراج : ۲۲۱، ۲۶۸-
برطانیہ، حکومت (برطانوی حکومت): ۱۸، ۲۱، ۲۴-
بلوچستان مسلم لیگ : ۲۶۴، ۲۶۵-
بندے ماترم : ۱۸-
بنگالی (بنگلہ زبان) کا مسئلہ : ۲۳۵، ۲۴۴، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۵۴، ۳۱۸، ۳۲۱-
بنگالی پنجابی بحران رپورٹ : ۳۰۴-
بنگالی عصبیّت : ۲۴۵- نیز دیکھیے صُوبائی تعصّبات-
بنیادی اصُولوں کی کمیٹی : ۱۱۹، ۱۸۳، ۱۸۴، ۲۰۶، ۲۳۹، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۷، ۳۰۰ تا ۳۰۲، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۲۲-
بنیادی حقوق : ۱۱۵-
بھارت ماتا : ۲۵۳- نیز دیکھیے اکھنڈ ہندوستان-
بیوروکریسی : ۱۴۷- نیز دیکھیے نوکر شاہی-
پارلیمانی جمہُوری نظام (پارلیمانی نظامِ حکومت): ۲۹۰، ۳۳۵-
پاکستان کا تصوّر یا خواب : ۳۷، ۴۳-
پاکستان کا قیام : دیکھیے قیامِ پاکستان-
پاکستان کے لیے جدوجہد : ۳۵- نیز دیکھیے تحریکِ پاکستان-
پاکستان جمہوری پارٹی : ۲۳۲-
پاکستان مسلم لیگ (آل پاکستان مسلم لیگ): ۵۹، ۶۰، ۶۶، ۷۰، ۱۷۱، ۳۷۹- نیز دیکھیے مسلم لیگ-
پاکستان نیشنل کانگرس : ۲۹۲-
پانچواں کالم : ۲۲۴-

Marfat.com

پروڈا (پیروڈا۔ عوامی نمائندگی سے نااہلی کا قانون) : ۱۶۳، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۷، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۷ ۔

پشاور یونیورسٹی کا قیام : ۲۲۷ ۔

پنجاب مسلم لیگ : ۴۰، ۵۱، ۸۴، ۸۸، ۱۳۷، ۱۵۷، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۷۱، ۱۸۱، ۱۸۷، ۳۶۵۔ نیز دیکھیے دولتانہ گروپ ۔

پنجاب مسلم لیگ کا منشور : ۴۰ ۔

پیرٹی : دیکھیے مساوی نیابت ۔

تارکینِ وطن : دیکھیے مہاجرین ۔

تاریخِ عالم : ۱۳۔

تحریکِ پاکستان : ۱۱۲، ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۴۷، ۳۴۹، ۳۷۳ ۔

تحفظِ ختمِ نبوت، تحریک : دیکھیے اینٹی قادیانی تحریک ۔

ترقی پسند گروپ (مسلم لیگ) : ۲۳۲، ۲۳۴ ۔

ترکِ موالات کی مہم : ۲۳ ۔

تقریر و تحریر کی آزادی : ۱۵۵ ۔

تقسیمِ اختیارات : ۳۰۶، ۳۱۲، ۳۲۱ ۔

تقسیمِ برصغیر : ۴۶، ۱۴۳، ۲۶۹، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۹۲، ۳۴۶، ۳۵۷، ۳۵۸ ۔

تقسیمِ بنگال (۱۹۰۵) : ۱۸، ۱۹ ۔

تقسیم کرو اور چلے جاؤ (نعرہ) : ۳۸ ۔

تقسیمِ ہند : دیکھیے تقسیمِ برصغیر ۔

تنسیخ تقسیمِ بنگال (۱۹۱۱) : ۱۸ ۔

جاگیرداری نظام : ۱۹۸، ۲۳۸ ۔

جداگانہ انتخاب : ۲۹۰، ۳۲۴ ۔ نیز دیکھیے مخلوط انتخاب ۔

جداگانہ حق نیابت : ۲۰، ۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵ ۔

جمعیت : ۴۱ ۔

جمہوری ادارے : ۹ ۔

جناح عوامی لیگ : ۱۷۵، ۲۱۷، ۳۶۸ ۔

Marfat.com

جناح عوامی مسلم لیگ : ۱۷۳، ۱۷۴۔
جناح مسلم لیگ : ۱۷۲۔
جنگِ آزادی (۱۸۵۷) : ۱۴، ۱۷، ۴۰، ۳۴۔
جنگِ عظیم، دوسری : ۳۲، ۳۴۔
جنگِ کوریا : ۱۷۵۔
جنگی کابینہ (برطانیہ) : ۳۷۔
جہاد : ۱۷۔
چودہ نکات (قائد اعظم) : ۲۵۔
حصولِ اقتدار : ۹۔
حقِ استرداد (ویٹو) : ۳۰۲، ۳۰۶۔
حقِ خود اختیاری : ۲۷۲۔
حقِ رائے دہی : ۲۹۴۔
حکومت سے بیزاری : ۱۱۷۔
خاتونِ اوّل : ۱۷۵۔
خارجہ پالیسی : ۳۱۲۔
خاکساروں پر گولی چلی : ۳۴۔
ختمِ نبوّت، تحریک : دیکھیے اینٹی قادیانی تحریک۔
خضر وزارت : ۱۴۶۔
خلافت، تحریک : ۲۳۔
خلافتِ ربانی پارٹی : ۲۴۳۔
خوراک کی صورت حال : ۱۲۱۔
دستور سازی : دیکھیے آئین سازی۔
دستور ساز اسمبلی : ۴۴، ۴۷، ۶۰، ۷۳، ۱۱۱، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۹ تا ۱۴۱، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۹۰ تا ۱۹۳، ۲۱۸، ۲۳۹، ۲۴۶، ۲۶۷، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۸۸، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۶، ۲۹۷، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۱۰، ۳۱۳، ۳۱۴ تا ۳۱۶، ۳۲۰، ۳۲۳ تا ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۲ تا ۳۳۴، ۳۳۷، ۳۵۱، ۳۵۶، ۳۶۲، ۳۶۶، ۳۷۹، ۳۸۰۔

Marfat.com

دفاعِ وطن (قومی یا ملکی دفاع):
۱۵۴، ۱۵۶، ۲۷۴۔

دفاع، شہری: دیکھیے
شہری دفاع۔

دفاعی معاہدے: ۱۲۴۔

دفعہ ۶۵: ۲۶۰۔

دفعہ ۹۲۔الف کا نفاذ: دیکھیے
گورنر راج۔

دفعہ ۱۴۴: ۲۱۴، ۲۳۲۔

دولتِ مشترکہ: ۱۲۳۔

دولتانہ گروپ (پنجاب مسلم لیگ):
۱۴۸۔

دولتانہ ممدوٹ کشمکش: ۳۳۷۔

دھاندلیاں: ۱۷۶، ۱۷۷۔

ڈان ٹرسٹ کے متولی: ۹۱۔

راست اقدام: ۴۴۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس: ۲۶۔

رشوت ستانی اور انسدادِ رشوت ستانی:
۱۵۶، ۱۶۳، ۱۸۳،
۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۶،
۲۰۱، ۲۰۴، ۲۰۵،
۲۰۹، ۲۸۱، ۲۸۲،
۳۳۸، ۳۷۷۔

رکنیت سازی کی مہم (مسلم لیگ):
۹۵، ۱۴۸۔

روئی کا مسئلہ: ۲۹۔

رولٹ ایکٹ (کالا قانون): ۲۳۔

زبان کا مسئلہ: ۳۱۲، ۳۱۸۔
نیز دیکھیے لسانی
تنازعات۔

زرعی اصلاحات: ۱۷۷،
۱۷۹ تا ۱۸۲، ۲۳۸،
۲۳۹، ۲۸۳ تا ۲۸۵،
۲۸۷، ۳۶۸۔

سائمن کمیشن: ۲۴۔

سائنٹفک سوسائٹی: ۱۷۔

سرحد مسلم لیگ: ۲۱۴ تا ۲۱۷،
۲۲۴، ۲۲۵۔

سرخپوش: ۲۱۱، ۲۱۸۔

سرکاری زبانیں: ۳۱۲، ۳۲۰۔
نیز دیکھیے قومی زبان۔

سکاٹ لینڈ یارڈ: ۱۰۳۔

Marfat.com

سکندر جناح معاہدہ (پیکٹ) :
۳۹ -
سندھ سے کراچی کی علیحدگی : ۱۹۱ -
سندھ کا بادشاہ گر : ۱۹۹ -
سندھ مسلم لیگ : ۱۸۸، ۱۸۹،
۱۹۱، ۱۹۵، ۱۹۷،
۱۹۹، ۲۰۰ -
سندھ مہاجر کانفرنس : ۲۰۶ -
سوشلسٹ آئین : ۱۸۸، ۱۸۹ -
سوشلسٹ نظام : ۲۳۱ -
سول ڈیفنس : دیکھیے شہری دفاع -
سول نافرمانی : ۴۵، ۱۶۴ -
سیاست برائے اقتدار یا طاقت :
۱۰۱، ۲۲۵ -
سیاسی آزادی : ۲۱ -
سیاسی بحران : ۹، ۱۴۰ -
سیاسی بیداری : ۹۹ -
سیاسی تاریخ : ۱۰ -
سیاسی لیڈرشپ کا قحط : ۲۷۵ -
سیاسی مسافر : ۱۷۴ -
سیاسی مسائل : ۱۰ -
سیاسیاتِ ہند (ہندوستانی
سیاست) : ۱۷، ۱۸ -
شملہ کانفرنس : ۴۰، ۲۶۸ -
شملہ وفد : ۱۹، ۲۰، ۲۲ -
شہری دفاع (سول ڈیفنس) :
۱۷۳ -
شیڈول کاسٹ فیڈریشن : ۲۴۳ -
صدارتی نظام : ۲۹۰ -
صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات :
۲۸ -
صوبائی پارلیمانی بورڈ : ۷۵ -
صوبائی (علاقائی) تعصبات : ۲۹۰،
۲۹۴، ۳۴۶ -
صوبائی خودمختاری (مکمل صوبائی
آزادی) : ۱۳۴، ۱۸۸،
۱۸۹، ۱۹۵، ۲۳۷،
۲۳۸، ۲۵۸، ۲۶۴،
۳۰۷، ۳۱۵، ۳۲۶ -
ضمنی انتخاب : ۱۳۲ -
عالمی امن : ۶۲ -
عبوری آئین : ۲۸۸، ۲۹۸، ۳۲۴ -

Marfat.com

عبوری حکومت (۱۹۴۶) : ۴۳ تا ۴۵، ۲۶۸۔

عبوری کابینہ (پاکستان) : ۳۲۳۔

عدلیہ کی آزادی : ۱۱۶۔

عدم اعتماد، تحریک : ۳۱۱، ۳۵۳۔

علاقائی تعصّبات : دیکھیے صوبائی تعصّبات، نیز بنگالی عصبیّت۔

علیحدگی پسند لیڈر : ۱۲۶۔

علی گڑھ سکول، نیز یونیورسٹی : ۱۷۔

عوامی لیگ : ۲۳۵، ۲۴۵، ۲۵۷۔

عوامی مسلم لیگ : ۲۱۷، ۲۳۴، ۲۳۵۔

غیرمسلموں کے مفادات (اقلیتوں کے حقوق) : ۶۶، ۱۱۵، ۲۹۱۔

غیر ملکی امداد : ۱۲۲۔

فارورڈ بلاک : ۳۶۔

فرقہ پرستی : ۶۵، ۶۶۔

فرقہ وارانہ فسادات : دیکھیے ہندو مسلم فسادات۔

فسطائیت : ۶۵، ۶۶۔

قادیانی : دیکھیے احمدی۔

قادیانیوں کے خلاف تحریک : دیکھیے اینٹی قادیانی تحریک۔

قانون آزادیٔ ہند (۱۹۴۷) : ۲۸۸، ۳۰۸، ۳۳۳۔

"قائدِ قلّت" : ۱۲۵۔

قراردادِ پاکستان : ۳۵۔

قراردادِ لاہور : ۳۴، ۳۵، ۴۰، ۲۹۹۔

قراردادِ مقاصد (آئین کے اغراض ومقاصد) : ۲۹۰ تا ۲۹۳، ۲۹۷، ۳۰۰، ۳۰۶، ۳۲۶، ۳۸۱۔

قرآن بطور آئین : ۲۹۹۔

قرآن وسنّت کی تعبیر : ۳۰۶۔

قلیل المیعاد منصوبہ : ۲۷۷۔

قوم پرست مسلمان : ۲۶۸۔

Marfat.com

قوم پرستی : ۱۴۳ -

قومی دفاع : دیکھیے دفاعِ وطن -

قومی دفاعی کونسل (حکومتِ ہند) : ۳۵، ۲۶۸ -

قومی زبان : ۲۳۵ - نیز دیکھیے اردو -

قومی قیادت : ۱۳۶ - نیز دیکھیے سیاسی لیڈرشپ کا قحط -

قومی کردار : ۹ -

قومی ماتم کا دن (سندھ) : ۱۹۱ - نیز دیکھیے سندھ سے کراچی کی علیحدگی -

قومی نصب العین : ۶۱ -

قومی یکجہتی : ۴۷ -

قومیتیں : ۳۴۶ -

قیامِ پاکستان : ۹، ۱۷، ۲۶۸ تا ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۸۳، ۲۸۸، ۳۱۱، ۳۷۲ -

قیامِ پاکستان کے مخالف عناصر : ۵۳ -

کالا قانون : دیکھیے رولٹ ایکٹ -

کانگرس یا کانگریس : دیکھیے انڈین نیشنل کانگریس -

کانگرس وزارت (سرحد) : ۲۱۱ -

کانگریس کا دورِ حکومت : ۲۹ -

کانگریس کی اصل حقیقت : ۱۴ -

کانگریس کی وزارتیں : ۲۸ -

کانگریس ورکنگ کمیٹی : ۳۳ -

کانگریسی لیڈر : ۹ -

کراچی کی سندھ سے علیحدگی : دیکھیے سندھ سے کراچی کی علیحدگی -

کرنافلی ہیپرمل میں فساد : ۲۴۵ -

کشمیر کا مسئلہ : ۵۷، ۱۵۶، ۲۸۳، ۳۳۵ -

کُل جماعتی کانفرنس : دیکھیے آل پارٹی کانفرنس -

کمیونسٹ پارٹی : ۲۵۷ -

کنونشن : ۷۳ -

کیبنٹ پلان : ۴۴ -

کیبنٹ مشن : ۴۳، ۴۴ -

Marfat.com

گروہی سیاست : ۷۹۔
گنا تنتری دل : ۲۴۳، ۲۴۵۔
گنا سمتی : ۲۴۳۔
گورنر جنرل کے حقوق و اختیارات :
۱۴۰۔
گورنر راج (دفعہ ۹۲۔ الف کا نفاذ) :
۱۵۸، ۱۶۱، ۱۶۴،
۲۰۱، ۲۰۴، ۲۴۶، ۲۴۶،
۲۸۳، ۳۱۶، ۳۳۸،
۳۶۴۔
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵) :
۲۶، ۲۶۴، ۲۸۸،
۲۹۸، ۳۲۴، ۳۲۷،
۳۳۲۔
گول میز کانفرنس : دیکھیے
راؤنڈ ٹیبل کانفرنس۔
لاہور ریزولیشن : دیکھیے
قراردادِ لاہور۔
لسانی تحریک : ۲۵۱۔
لسانی تنازعات : ۲۳۴، ۲۳۶، ۲۹۰، ۳۱۶، تا ۳۱۸۔
لیاقت باری فارمولا : ۱۶۱۔
لیاقت علی خاں کا قتل : ۱۰۲ تا
۱۰۴، ۱۰۷، ۱۰۹،
۱۳۰، ۱۸۱، ۲۲۴، ۳۰۹،
۳۲۶۔
لیگ : دیکھیے مسلم لیگ۔
لیگ عوام کے لیے اور عوام لیگ
کے لیے : ۱۱۳۰۔
مارشل لاء : ۱۱۹، ۱۲۹، ۱۴۲،
۱۸۴، ۳۰۸، ۳۳۱،
۳۶۶۔
متحدہ محاذ : ۱۳۳ تا ۱۳۶، ۱۳۹،
۱۶۶، ۲۴۰، ۲۴۲ تا
۲۴۶، ۲۵۶، ۲۵۸ تا ۲۵۸،
۳۱۵، ۳۱۶، ۳۲۰،
۳۲۶۔
متحدہ محاذ کا انتخابی منشور : ۲۵۸۔
متروکہ املاک (جائداد) کے مسائل :
۵۷، ۲۸۲۔
شمالی جمہوری مملکت : ۶۲۔
محمڈن پراونشل یونین : ۱۹۔

Marfat.com

مخلوط انتخاب : ۲۹۰، ۳۲۴، ۳۲۵ - نیز دیکھیے جداگانہ انتخاب۔

مخلوط حکومت : ۲۸ -

مرکز گریز رجحانات : ۳۲۱ -

مرکزی پارلیمانی بورڈ (مسلم لیگ) : ۶۰، ۷۵ -

مرکزی مجلسِ قانون ساز (مرکزی مقننہ) : ۲۸۹، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۵، ۳۲۱، ۳۲۳ - نیز دیکھیے ایوانِ بالا و ایوانِ زیریں۔

مساوی نیابت (یکساں نمائندگی، پیرٹی) : ۱۱۳، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۸۹، ۱۹۵، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۱۳، ۳۲۲، ۳۲۳ -

مسلح افواج : ۲۷۴ -

مسلم اقلیت (بھارت) : ۶۶ -

مسلم اکثریت کے صوبے : ۳۴ -

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن : دیکھیے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن۔

مسلم کش فسادات : ۲۸۱ -

مسلم لیگ : دیکھیے آل انڈیا مسلم لیگ اور پاکستان مسلم لیگ۔

مسلم لیگ کا آئین (دستور، ضوابط نیز منشور) : ۵۳، ۷۰ تا ۷۳، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۹۷، ۱۱۳ تا ۱۱۵، ۱۵۵، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۹۹ -

مسلم لیگ کا زوال : ۷۹، ۱۲۷، ۱۴۰، ۱۴۶، ۳۷۱ -

مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶) ۱۴۱ -

مسلم لیگ کونسل : ۸۷ -

مسلم لیگ کی از سرِ نو شیرازہ بندی (تنظیمِ نو، حیاتِ نو، نشأۃ ثانیہ، احیا) : ۲۶، ۵۲، ۸۲، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۸۸، ۳۷۳ -

مسلم لیگ کی شاخیں : ۳۱، ۳۹ -

مسلم لیگ کی شکست : ۱۳۵،

Marfat.com

۱۳۶، ۲۴۳، ۲۴۶، ۲۴۸، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۵۹، ۳۱۶، ۳۶۱، ۳۶۲۔

مسلم لیگ کی مقبولیت : ۳۱، ۴۷، ۱۷۵، ۱۸۶، ۲۰۸، ۲۷۱، ۳۶۰۔

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی : ۳۵، ۳۶۔

مسلم لیگ کی وزارتیں (آسام، بنگال، سرحد، سندھ) : ۳۸۔

مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد : ۲۱، ۲۲، ۵۱، ۱۱۳، ۱۱۵، ۳۶۷۔

مسلم لیگ کے دھڑے (جناح گروپ، شفیع گروپ) : ۲۵۔

مسلم لیگ نیشنل گارڈ (رضا کار تنظیم): ۴۵۔

مسلم مفادات : دیکھیے مسلمانوں کے سیاسی حقوق۔

مسلمان، ہندوستان میں : ۱۴۔

مُسلمانوں کی قابلِ رحم حالت (معاشی بدحالی) : ۱۵، ۱۶۔

مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ : ۱۶۔

مسلمانوں کے سیاسی حقوق (مسلم مفادات) : ۲۱۔

مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن (آزاد مسلم مملکت) : ۲۶، ۳۰، ۳۲، ۳۳۔

مسئلہ کشمیر : دیکھیے کشمیر کا مسئلہ۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی : ۴۰، ۲۵۴، ۲۸۹، ۳۴۶۔

مشرقی پاکستان کی محرومی : ۱۳۳۔

مشرقی پاکستان مسلم لیگ : ۲۳۰، ۲۳۳، ۲۳۸، ۲۴۰، ۲۴۲۔

مضبوط مرکز : ۳۰۷، ۳۱۲، ۳۱۳۔

مظاہرے : ۹۰، ۹۱۔

معاشی بدحالی، مسلمانوں کی : دیکھیے مسلمانوں کی قابلِ رحم حالت۔

مغربی پاکستان، وحدت : دیکھیے

Marfat.com

ون یونٹ ۔
مغربی تعلیم (جدید تعلیم، مغربی علوم و فنون) : ۱۶، ۱۷ ۔
مغویہ خواتین کی بازیابی : ۱۶۳ ۔
ملکی دفاع : دیکھیے دفاعِ وطن ۔
ملکیت اراضی کی حد : ۱۸۰، ۲۳۹ ۔
مملکتِ خداداد : ۱۱ ۔
منٹو مارلے اصلاحات : ۲۰، ۳۲۴ ۔
منیر رپورٹ : ۱۲۲ ۔
مہاجرین (تارکینِ وطن) کی آبادکاری (بحالی) : ۵۰، ۵۷، ۱۵۷، ۱۶۶، ۱۷۱ تا ۱۷۳، ۱۹۴، ۲۷۷ تا ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۳، ۳۳۵ ۔
مہاجرین کے کیمپ (مہاجر کیمپ) : ۵۰، ۱۴۳، ۱۴۴، ۲۷۷، ۲۷۹، ۲۸۰ ۔
مہاجرین کے مسائل : ۴۹، ۵۰، ۱۴۳، ۱۵۰، ۱۶۶، ۲۰۹، ۲۷۵ تا ۲۷۸، ۲۸۱، ۳۵۵ ۔
میثاقِ لکھنؤ : ۲۳ ۔
نشأۃِ ثانیہ : دیکھیے مسلم لیگ کی نشأۃِ ثانیہ، مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ ۔
نصب العین، قومی : دیکھیے قومی نصب العین ۔
نظام : دیکھیے اسلامی نظام۔ جاگیرداری نظام ۔ سوشلسٹ نظام ۔
نظامِ اسلام پارٹی : ۲۴۳ ۔
نظامِ حکومت : ۱۸۸، ۲۹۲ ۔ نیز دیکھیے پارلیمانی جمہوری نظام۔ صدارتی نظام ۔ وفاقی نظام ۔
نظریۂ پاکستان : ۱۰۳، ۲۵۰، ۲۵۹ ۔
نمائندگی یا نیابت، مساوی : دیکھیے مساوی نیابت ۔

Marfat.com

نوکر شاہی : ۱۷۹ - نیز دیکھیے
بیورو کریسی ۔
نہرو رپورٹ : ۲۴، ۲۵ ۔
نیشنل گارڈ : دیکھیے مسلم لیگ
نیشنل گارڈ ۔
وائسریگل ایگزیکٹو کونسل :
۳۶، ۴۱ ۔
وحدانی نظامِ حکومت : ۳۲۲ ۔
وحدتِ مغربی پاکستان : دیکھیے
وَن یونٹ ۔
وزارتی بحران (سندھ) : ۲۰۲ ۔
وزارتیں، صوبائی : دیکھیے
کانگریس کی وزارتیں۔
مسلم لیگ کی وزارتیں ۔
وفاقی نظام : ۳۲۲ - نیز دیکھیے
نظامِ حکومت ۔
وَن یونٹ (وحدتِ مغربی پاکستان) :
۳، ۱۹۵، ۲۱۰،
۲۱۱، ۳۶۳ ۔
ویٹو : دیکھیے حقِ استرداد ۔
ہاری کانفرنس : ۱۹۸ ۔
ہند چھوڑ دو تحریک : ۳۸ ۔
ہندو راج : ۱۸ ۔
ہندوستان، متحدہ : دیکھیے
اکھنڈ ہندوستان ۔
ہندوستان میں مسلمان : دیکھیے
مسلمان، ہندوستان میں ۔
ہندوستانی سیاست : دیکھیے
سیاسیاتِ ہند ۔
ہندو مسلم اتحاد : ۲۲، ۲۴،
۳۳، ۳۵ ۔
ہندو مسلم تعلقات : ۱۸ ۔
ہندو مسلم فسادات (فرقہ وارانہ
فسادات) : ۵۷، ۵۸ ۔
ہندوؤں کا پراپیگنڈا : ۲۵۵ ۔
ہندوؤں کا تعصّب : ۱۸ ۔
ہندی (زبان) : ۳۱۶، ۳۱۷ ۔
ہندی اردو نزاع : دیکھیے اردو
ہندی نزاع ۔
ہنگامی حالات : ۱۴۱، ۳۲۹ ۔
یکجہتی، قومی : دیکھیے
قومی یکجہتی ۔

Marfat.com

یکساں نمائندگی (پیرٹی) : دیکھیے مساوی نیابت -

یوم احتجاج (سندھ) : ۱۹۱ -

یوم راست اقدام : ۴۴ -

یوم صلح : ۲۳ -

یوم فتح : ۴۲ -

یوم قومی ماتم (سندھ) : دیکھیے قومی ماتم کا دن -

یوم منشور (پنجاب) : ۱۷۳ -

یوم نجات : ۳۳ -

یونین گورنمنٹ : ۳۷ -

یونینزم : ۴۰ -

یونینسٹ پارٹی : ۳۹، ۴۲ -

یونینسٹ حکومت : ۱۶۳ - نیز دیکھیے خضر وزارت -

Marfat.com